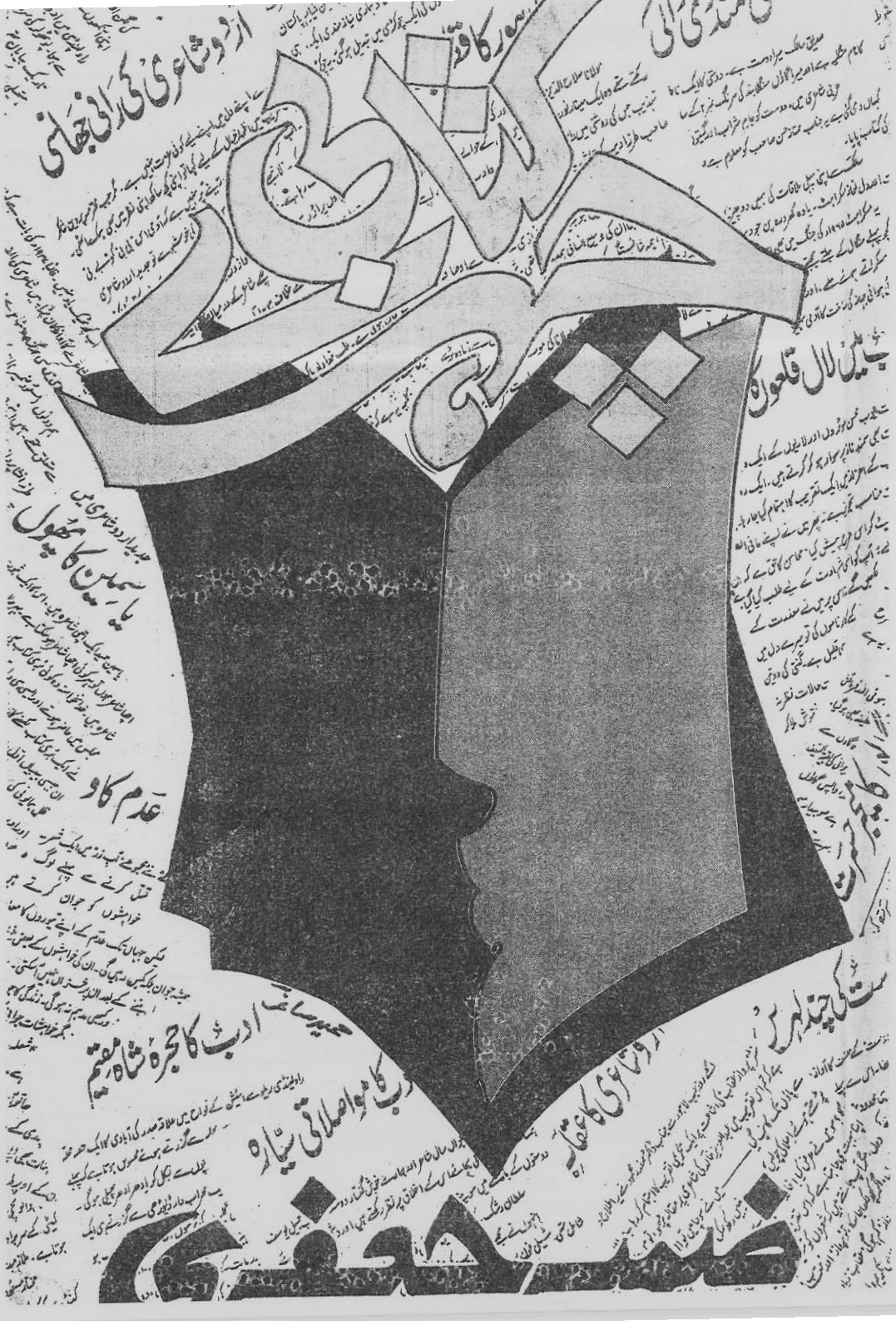

نیا دور
اردو شاعری کی رومانی جہتیں
عدم کا دو
اردو شاعری کا مقام
نیا دور

بہت پیارے انسان
ڈاکٹر انور نسیم کے لئے
محبت کے ساتھ

صہیر

۲
۱۰
۱۹۹۳

کتابی چہرے

اضافوں کے ساتھ

تیسرا ایڈیشن

سید ضمیر جعفری

صفحات ۲۹۸

تعداد ایک ہزار

طابع فیض الاسلام پرنٹنگ پریس راولپنڈی

ناشر بریگیڈیر (ریٹائرڈ) فاروق احمد ستارہ جرات وستارہ امتیاز

نگران ومعاون قمر رعینی

قیمت (پاکستانی) -/۲۰۰ روپے پونڈ ۱۵- ڈالر ۲۵

تیسرا ایڈیشن

پیش کش مکتبہ المختار نمبر۴ گلستان کالونی راولپنڈی (چھاؤنی)
کوڈ نمبر (۴۶۰۰۰)

فون نمبر ۸۴۷۶۸۷ - ۵۸۱-۳۴

ترتیب

پیش چہرہ ۶
سنگاپور کا میجر حسرت ۹
لاہور کا قطب ۳۷
چیونٹی اور پہاڑ ۴۵
پوٹھوار کا بابائے اُردو ۵۴
اُردو ادب کا منگلا ڈیم ۶۳
اُردو ادب کا کوہ کن ۷۵
آوازِ دوست کی چند لہریں ۸۵
اُردو ادب کا جنرل رومیل ۹۹
اُردو شاعری کی خاتونِ اوّل ۱۰۹
عدم کا وجود ۱۲۶
اُردو شاعری کا عقابِ اعظم ۱۳۹
اُردو ادب کی دخترِ صحرا ۱۵۰
ادب میں لال قلعوں کا معمار ۱۶۰
ادب کا حجرۂ شاہ مقیم ۱۶۸
طلسمی مندری والی کتاب ۱۷۸
کتابوں کی شہزادی کتاب ۱۸۸
اُردو ادب کا مواصلاتی سیارہ ۱۹۹
اُردو شاعری کی رانی جھانسی ۲۱۰
اُردو شاعری کی شاہراہ ریشم ۲۲۰
جدید اُردو شاعری میں یاسمین کا پھول ۲۳۰
ایک خطبۂ صدارت ۲۴۰

۱
۴۱
۵۰
۶۰
۵۵
۵۸
۶۶
۷۰۱
۳۶۱
۴۶۱
۵۰۱
۷۱
۸۶۱
۸۵۱
۸۸۱
۹۴۱
۱۱۶
۱۲۲
۱۳۲
۱۶۶

نذیر احمد شیخ (مرحوم)

اے۔ ڈی۔ اظہر (مرحوم)

اور

ممتاز حسن (مرحوم)

——— کے نام

تم کیا گئے کہ رُوٹھ گئے دن بہار کے

ضمیر

پیش چہرہ

"کتابی چہرے" میرے چند مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً لکھے گئے۔ ان میں تین مضامین پیر و مرشد مولانا چراغ حسن حسرت، مولانا صلاح الدین احمد اور عبدالعزیز فطرت کی یاد سے منسوب ہیں۔ دوسرے تمام مضامین موجودہ دور کے بعض سرکردہ اہلِ قلم کے اعزاز میں منعقدہ استقبالیوں یا ان کی کسی تصنیف کی "رسمِ عقیقہ" یعنی کتاب کی تعارفی تقریب میں پڑھے گئے۔ اسی نسبت سے کتاب کا نام "کتابی چہرے" تجویز ہوا۔ اگرچہ کسی مضمون میں "چہرہ" زیادہ ہے اور کسی میں "کتاب"

ے نے کافرِ مطلق نہ مسلمانِ تمام

یہ سب شخصیتیں، جیسا کہ میں عرض کر چکا، ہمارے دور کی ممتاز ادبی شخصیتیں ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر بھی، ان سب سے نیاز مندانہ، برادرانہ یا دوستانہ روابط کا شرف حاصل ہے۔ اسی لئے، ان مضامین میں ایک سرورِ رفیقانہ کی روشنائی زیادہ ابھری ابھری نظر آئے۔ میرا قصور بھی یہی تھا میرے لئے یہ عمل، احباب کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ کر، ہنستے بولتے ہوئے، روٹی توڑنے کا پُرلطف عمل تھا.....

مجھے معلوم ہے کہ چوٹی کا ایک دوسرا رُخ بھی ہوتا ہے۔ ہاتھی چار پاؤں رکھتے ہوئے بھی ٹھوکر کھا جاتا ہے۔ مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تنقید تو تنقید ہے، تحسین کا حق بھی

اہلِ کمال کی زندگی میں کما حقہٗ ادا نہیں کیا جا سکتا۔ ان لوگوں کے چہرے پر تو ابھی انجمن کی گرد بھی پڑی ہوئی ہے چنانچہ اس بات کا مجھ سے زیادہ احساس کسی دوسرے شخص کو نہیں ہو سکتا کہ یہ مضامین میری آرزو سے کس قدر کمتر ہیں۔ بادشاہ کا عقاب کسی کنگلے کے جھونپڑے پر آ کر بیٹھے گا تو یقیناً پر کٹوا کر رہے گا۔ رہا "چوٹی کا دوسرا رُخ" تو جو صاحب اس کا تفصیلی سروے (SURVEY) کرنا چاہیں چوٹی موجود ہے میں تو اس کے روشن رُخ کو بھی جی بھر کر نہیں دیکھ سکا۔

یہ مضامین اشاعت کی نیت سے نہیں لکھے گئے تھے۔ مگر جب لکھے جا چکے تو جتنی شدید خواہش ان مضامین کو کتابی صورت میں دیکھنے کی میرے دل میں پیدا ہوئی، وہ اپنی کسی دوسری تحریر کے لئے آج تک محسوس نہ ہوئی۔ مگر اس کتاب کی اشاعت پر رُوح میں ایک بڑی ظالم چبھن بھی جاگ اٹھی۔ وہ یہ کہ، ابھی اپنے کتنے ہی ایسے مہربانوں، یاروں، پیاروں، باکمال اور لاجواب لوگوں کا تذکرہ میرے قلم پر قرض پڑا ہے۔ جن کی ذات کو میں نے زندگی کے لئے مسرت و آگہی کا ایک نخلستانِ ہمیشہ بہار پایا۔ خدا نے توفیق دی تو مضامین کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

میں اپنی تحریروں کو کتابی صورت میں دیکھ کر خوش تو بہت ہوتا ہوں۔ مگر خود کوئی ایسا اقدام نہیں کرتا، جس سے عملاً کتاب کی اشاعت قریب تر ہو سکے۔ جی چاہتا ہے کہ کوئی دوسرا آدمی آ کر "چاول" میرے گھٹنے پر رکھ جائے۔ کتاب کے "پروف" پڑھنے سے میری جان جاتی ہے شاید اس لئے کہ اس مرحلے پر بھی، جب اپنی تحریر پڑھتا ہوں تو اندر سے آواز آتی ہے ——— پڑھتا جا شرماتا جا ——— مواد تو مواد، عبارت میں بھی ایسی ایسی دراڑیں نظر آتی ہیں، جیسے وہ میری تحریر کردہ نہ ہو کسی "ٹھیکیدار" کی تعمیر کردہ ہو۔ ایک ایک جملے کی ٹھوڑی پکڑ کر بقول مولانا چراغ حسن حسرت سوچنے لگتا ہوں۔

ے جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا۔

یہ کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہے جو اضافوں کے ساتھ مکتبۂ المختار، راولپنڈی کے اہتمام سے شائع ہو رہا ہے اس کی اشاعت میں اپنے صدیق مکرم، ملک کے صاحب شمشیر و قلم دانش ور بریگیڈیئر گلزار احمد کی معاونت کا شکر گزار ہوں۔ تدوین میں معروف ادیب و شاعر جناب قمر رعینی نے میرا ہاتھ بٹایا میں ان کا بھی ممنون ہوں۔

۲۳ رمضا ۱۴۱۳ اسلام آباد ۱۴ اگست ۱۹۹۳ء

سید ضمیر جعفری

سنگاپور کا میجر حسرت

یہ مضمون جون ۱۹۵۵ء میں مولانا چراغ حسن حسرت کے وفات کے بعد جلد ہی لکھا گیا تھا۔ اس کہانی کو میں نے اور میرے عزیز دوست کرنل مسعود احمد (سابق ڈائریکٹر انٹر سروسز پبلک ریلیشنز) نے ملکر لکھا ہے، بلکہ اس کا "نصف بہتر" مسعود ہی کے قلم سے نکلا ہے۔

دوسری عالمگیر جنگ کے خاتمے پر جب اتحادی قابض فوجیں ملایا کے ساحل پر اتریں تو مولانا چراغ حسن حسرت اس کے ہراول دستوں میں شامل تھے۔ آپ دو سال سے کچھ اوپر سنگاپور میں مقیم رہے۔

مولانا حسرت جنوب مشرقی ایشیائی کمان کے شعبہ تعلقات عامہ سے وابستہ تھے اور ہیڈ کوارٹر سے شائع ہونے والے ہندوستانی عسکری اخبارات کی ادارت و نگرانی کا فریضہ ان کے سپرد تھا۔

ہم دونوں (مسعود ضمیر) ان کے نائب و معاون کی حیثیت میں اس شعبے سے متعلق تھے۔ ہمیں اپنی اس خوش بختی پر بڑا فخر ہے کہ ہمیں زمانے کے ایک صاحب طرز انشا پرداز، ایک بڑے صحافی اور ایک بہت بڑے انسان کو بہت قریب اور بڑی تفصیل سے دیکھنے کا موقع ملا۔ جو لوگ اجنبی سرزمینوں میں فاتح لشکروں کی زندگی کا تجربہ رکھتے ہیں وہ اس امر کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہمیں حسرت صاحب سے کتنا اور کیسا تقرب حاصل رہا ہوگا۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ زندگی کسی چہرے

پر کوئی نقاب باقی نہیں رہنے دیتی

ہمارے رفقاء کار میں کیپٹن (اب لیفٹیننٹ کرنل) جاوید خٹک، کیپٹن (اب کمانڈر) حسن عسکری جو ادبی دنیا میں ابن سعید کے نام سے مشہور ہیں، میجر احمد علی خان جو آجکل برطانیہ میں پاکستان کے معتمدِ تجارت ہیں، کیپٹن انعام قاضی اور کیپٹن (اب لیفٹیننٹ کرنل) رشید حیات پاکستان کے حصے میں آئے، یہ سب دوست وہاں قوم کے نام سے یاد کئے جاتے تھے اور حسرت اس قوم کے مرشد تھے۔ پھر آگے، قوم کے بھی اندر مسعود اور ضمیر کو مرشد کا خصوصی قرب حاصل تھا مسعود دفتر میں ان کا نمبر ۲ تھا اور ضمیر دفتر سے باہر ان کا ایڈی کانگ۔

اس مطالعہ سے اسی دور کے حسرت کا تذکرہ مقصود تھا۔ چند جھلکیاں، چند باتیں، چند یادیں!

ہمارے لکھنے کا طریق کار یہ رہا ہے کہ واقعات کی ترتیب میں ——— قربتوں اور فاصلوں کے مطابق، کچھ حصہ مسعود نے لکھا، کچھ ضمیر نے۔ مولانا جہاں ایک کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے کے قبضے میں چلے گئے، ایک نے قلم روک کر مضمون، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ مولانا کو دوسرے کے سپرد کر دیا۔

مولانا حسرت کی بے وقت موت، ہماری تہذیبی تاریخ کا ایک عظیم سانحہ ہے۔ یہ ایک فرد کی موت نہیں، ایک روایت، ایک ادارے کی موت ہے، ہم نیاز مندوں کے لیے ان کی موت ایک گہرے ذاتی زخم کی حیثیت رکھتی ہے۔ زندگی میں کسی کے ساتھ دو قدم چل کر بچھڑ جانے پر قلق ہوتا ہے۔ یہ تو اس دوست کا بچھڑنا ہے جس کے ساتھ ہم کامل دو برس تک ایک دفتر میں ہی نہیں گھر میں بھی رہے۔ یہ تو اس مرشد کی رخصت کا دائمی گھاؤ ہے جس کے قدموں میں بیٹھ کر ہم نے قلم پکڑنا سیکھا ———

یہ تو اس انجمن کے اُجڑ جانے کا ماتم ہے کہ جس کی روشنی ہی کے سبب آج

ہم اپنی زندگی کو ایک غیر معمولی متاع سمجھتے ہیں یہ غم تو اب جان کے ساتھ ہی جائے گا، لیکن اس مضمون میں تحریر کے انداز کو ہم نے عمداً ہلکا پھلکا رکھا ہے ہمارا عقیدہ ہے کہ روتے بسورتے لہجے میں مولانا کی شخصیت سے انصاف کرنا تو کجا، ان کو چھو سکنا بھی ناممکن ہے۔ ہم نے مرشد کے تذکرے کے لیے وہی اسلوب چُنا ہے جو خود ان کا اسلوبِ حیات تھا۔ ہم حسرت صاحب کی پسند و ناپسند سے واقف ہیں، ہم اپنے مرشد کو جانتے ہیں۔ (م۔ض)

لیجیے اب ضمیر سے سنیے۔

مرشد مجھ سے پہلے سنگاپور پہنچ چکے تھے۔ جاوید کے ہمراہ میں جس وقت ہالینڈ پارک کے ایک وسیع، دل کشا جنگلے کے اندر پہنچا تو مرشد ——— قوم کے دل میں بیٹھے ہوئے دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ میں "شیرازہ" کے زمانے سے ان کا نیاز مند تھا دیکھتے ہی کھانا چھوڑ کر مجھ سے لپٹ گئے۔ اپنے پہلو میں بٹھا لیا اور پھر لنچ کی اس نشست میں بیٹھے بیٹھے ڈھیروں باتیں کر ڈالیں۔

"خوب پہنچے ہو میرے بھائی۔ آج رات ظہیر کی سالگرہ کی دعوت ہے۔ مولانا آج ہمیں گا کر پڑھنے والے شاعر کی سخت ضرورت تھی۔ سبحان اللہ لاہور کا بکھرا ہوا شیرازہ کہاں آکر جمع ہو رہا ہے ——— لو چاولوں پر یہ ٹن کی مچھلی بچھا کر کھاؤ۔ یہاں تو یہی کچھ مردار کھانے کو ملے گا میاں! وہ تمہاری یونیسٹ قسم کی روٹی یہاں کہاں؟"

"وہ جناب قاضی ہیں۔ تم ان کا نام غالباً پہلی مرتبہ سن رہے ہو مگر مشہور ادیب ہیں ——— وہ دھان پان صاحب زادے مولانا عسکری ہیں۔ جاوید کی رائے میں اپنے نامور والد میرزا محمد سعید دہلوی سے بھی بڑے ادیب ہیں ——— یہ

لہ مولانا کا فقید المثال فکاہی ہفت روزہ "شیرازہ" لاہور ۲ مولانا کے صاحبزادے ظہیر الحسن جاوید

رشید حیات ہیں، بس رشید حیات! محض و خالص - جاوید سے بھی مل چکے ہو۔ آپ چلم اور فلم سے ہو کر علم کے کوچے میں وارد ہوئے ہیں ——— اور یہ مولانا ضمیر جعفری ہیں جہلم کے رہنے والے، جہاں کے لوگ خدا کے تصور کے لیے تھانیدار کو دیکھتے ہیں۔

پھر اس شام ظہیر کی سالگرہ منائی گئی۔ یہ ظہیر سے ان کی بے انداز محبت کی پہلی جھلک تھی جو ہم نے دیکھی۔ مرشد نے جزیرے کے تقریباً سبھی انڈین افسروں کو مدعو کر رکھا تھا۔ دو چار خوش ذوق جوڑے بھی موجود تھے۔ محفل جمی ——— تو مرشد میزبان کی بجائے کچھ اس طرح مہمان بنے بیٹھے رہے جیسے انہیں اپنے سگرٹ کے علاوہ کسی چیز سے کوئی واسطہ نہ ہو ——— مرنے کی ادا یاد نہ جینے کی ادا یاد ——— مگر جب بوتلوں کے کاگ اڑنے لگے تو مرشد نے چہکنا شروع کیا۔ اور اب جو منظر بدلا ہے تو پوری انجمن گویا تنہا حسرت کی ذات سے عبارت تھی۔ میجر احمد علی خان کے الفاظ میں حسرت کا چراغ روشن ہو گیا۔ ان کے لبوں سے شعر و ادب، تاریخ و تصوف، طنز و ظرافت، زندگی اور اس کی چاندنی کا ایک سبک آبشار جاری تھا ——— تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا۔

یہ محفل جو مرشد کی اصطلاح میں "بزم ہاؤ ہو" کہلاتی تھی۔ اگلی صبح کے کوئی تین بجے تک جاری رہی یوں کہنا چاہیئے کہ مرشد اپنے چند جاں نثاروں کے ساتھ قائم رہے ورنہ تین چوتھائی محفل وہیں کرسیوں پر پاؤں رکھ کر سو گئی تھی، مرشد تو وہیں کھڑے کھڑے "صبوحی" تک لگا دینے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ مگر نہ معلوم شاید ذخیرہ ختم ہو گیا تھا۔ یا شاید جس کسی میں ابھی تک دوسرے کو تھامنے پکڑنے کی سکت باقی تھی وہ ان کو تھام پکڑ کر خواب گاہ میں لے گیا اور یہ محفل بالآخر اس طرح ختم ہوئی کہ اس کو جیتے تو سب نے دیکھا تھا، برخاست ہوتے شاید ہی کسی نے دیکھا۔ نسبتاً ہوش مند لوگوں کو ڈر تھا کہ اگر کل صبح انہیں لوگوں کو دفتر لگانا ہے تو یہ دفتر

لگ چکا۔ مرشد کی نسبت سب کو قطعی یقین تھا کہ وہ کل کیا معنی اب ایک پورے ہفتے کے لیے معطل ہو گئے۔ مگر پھر دوسری صبح کو جو پہلی آواز ہالینڈ پارک کے خوبصورت گنبدوں اور روشن غلام گردشوں میں گونجتی ہوئی سنائی دی وہ مرشد کی آواز تھی۔

"جاوید، عسکری، ضمیر ——— قاضی صاحب"

"ارے او ساون کے بادلو"۔

"ابے او خبیثو"!

اور بھاگم بھاگ ہم لوگ جب تیار ہو کر ناشتے کی میز پر پہنچے تو وہ پیپتے کے آخری پرزے کو کانٹے کی نوک پر بٹھا کر خود دفتر جانے کے لیے تیار کھڑے تھے، جہاں سہ پہر تک اب انہیں مسعود کے قبضے میں رہنا تھا، لہٰذا یہ روداد مسعود ہی سے سنیے۔

مجھے دفتر میں ان کا نمبر ۲ ہونے کا امتیاز حاصل تھا۔ اس سے پہلے میں کلکتہ میں ان کے ساتھ کام کر چکا تھا۔ مرشد میرے لیے کوئی نئے باس نہ تھے ۔ سنگاپور پہنچا تو پہلے ہی روز مجھے پورے اعتماد میں لیتے ہوئے فرمایا۔

"مولانا آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ اب یہ کام سنبھالیں۔ میں بڈھا آدمی ہوں مجھے آرام کرنے دیں۔ میں چاہتا ہوں کچھ پڑھنے کا وقت مل جائے۔ کچھ گھوم پھر لوں۔ آپ کی تھوڑی بہت مدد کر دیا کروں گا"۔

اس تمام میں وقفہ میں سگریٹ منہ سے نہیں نکلی۔ دھواں آنکھوں میں جا رہا تھا۔ کبھی کبھی تو یہ گمان ہوتا کہ دھواں آنکھوں میں نہیں جا رہا۔ آنکھوں سے آ رہا ہے درمیان میں جھنجھلا کر آنکھیں ملنے بھی لگتے لیکن آنکھوں کی جلن اور سگریٹ کے دھوئیں میں کوئی رشتہ شاید وہ کبھی دریافت نہ کر سکے علل و معلول کی اکثر کارفرمائیوں سے مرشد عموماً بے تعلق و بے نیاز ہی رہے۔

"ہاں تو مولانا مسعود صاحب بہت اچھا ہوا کہ آپ آ گئے ——— لو بھئی چائے اور یہ سگریٹ ——— جاوید ماچس ——— سنگارپور کو آپ کلکتہ سے زیادہ تقویٰ شکن پائیں گے۔"

اتنے میں مجھے کپڑا جلنے کی بُو سی آئی۔ میں نے کہا ——— "مولانا کہیں کوئی کپڑا تو نہیں جل رہا؟" ——— بولے ——— "آپ کہہ رہے ہیں تو ضرور جل رہا ہو گا آپ بڑے خطرناک آدمی ہیں" ——— پھر ذرا چلا کر بولے ——— "اے قاضی صاحب ذرا ادھر تو تشریف لائیں۔ دیکھیے کوئی کپڑا تو نہیں جل رہا؟ یہ کہیں سے بُو آ رہی ہے؟"

"اس کہیں سے بُو" کا راز یہ کھلا کہ جناب کی پتلون کا پائنچہ چار پانچ انچ کے قریب راکھ ہو چکا تھا۔ فرمانے لگے ——— "مولانا یہ سگریٹ بھی بڑی واہیات چیز ہے سوچتا ہوں کہ اس لعنت کو چھوڑ دوں" ——— اور شام تک سگریٹ اور ماچس کے خالی بکسوں سے آدھی ٹوکری بھری پڑی تھی۔

مرشد کی باتیں کرتے ہوئے تسلسل یا اسلوب قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ خود انہوں نے زندگی کو اسلوب کی بندشوں میں کبھی قید نہ ہونے دیا۔ فوج کے سخت گیر ضوابط بھی انہیں کبھی پابند نہ کر سکے۔ ایک مرتبہ جب افسر اعلیٰ نے کسی بات پر باز پرس کی تو جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا ؎

جرمنی ختم اور اس کے ساتھ حبا پانی بھی ختم
تیری کرنیلی بھی ختم اور میری کپتانی بھی ختم

کلکتے کی بات ہے ایک روز دفتر چلے آ رہے تھے۔ اس شان سے کہ منہ میں سگرٹ ہے فیلڈ سروس ٹوپی بغل میں دبی ہوئی ہے اور کندھوں پہ ایک طرف تین سٹار لگے ہیں اور دوسری طرف دو۔

میرے وہاں پہنچنے پر مرشد نے مطالعہ کی ایک ذرا سی فرصت اور سیر و سیاحت

کی ایک تھوڑی سی مہلت کے عوض اپنے تمام فرائض مجھے تفویض کر دینے کا فرمان تو جاری کر دیا مگر ہمیں معلوم تھا کہ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ مطالعہ کے لیے مرشد کو مہلت کی ضرورت ہی نہ تھی۔ جس طرح اور لوگ کتاب پڑھتے ہیں۔ اس طرح ہم نے انہیں پڑھتے کبھی نہیں دیکھا۔ ان کی کیفیت تو کچھ ایسی تھی کہ کتاب اٹھائی، اسے چھوا، تولا، سونگھا، چند ایک ورق الٹ پلٹ کر دیکھے اور بس۔ اس کے بعد وہ کسی باطنی عمل سے کتاب کا نفسِ مضمون، کتاب کی روح۔ سب کی سب اپنے ذہن میں منتقل کر لیتے دوسرے روز اس کتاب کے متعلق بات کریں تو وہ اس کے کرداروں کا حسب نسب، کہانی کی اٹھان، اس کی کمزوریاں اور خوبیاں، مصنف کا اسٹائل اور فلسفہ اور پھر دس اور کتابوں سے اس کی جزئیات کا موازنہ، یہ سب یوں بیان کر جاتے جیسے یہ کتاب انہوں نے مکتب میں سبقاً پڑھی ہو۔

رہی سیر و سیاحت کی فرصت، تو یہ بھی ایک طرح کی آرزو کی تھی جسے عملی رنگ دینے کا ارادہ مرشد نے کبھی کیا ہی نہ تھا۔ سچ مچ کی سیر و سیاحت مرشد کے بس کی بات ہی نہ تھی۔ پھر سیر کے لیے انہیں طول طویل راستے ناپنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ حسن ان کے لیے ایک داخلی کیفیت تھی۔ حسن ان کی آنکھوں اور ان کے دل میں تھا۔ خارجی اسباب کا سہارا اگر انہیں درکار تھا تو نہایت سبک سا۔ مَیس کی ایک کھڑکی سے جھانکو تو چھالیہ کے کشیدہ قامت درختوں کے جھنڈ آپس میں سرگوشیاں کرتے نظر آتے تھے۔ دوسری طرف بالکنی سے باہر چینی چیری کا ایک درخت باہیں پھیلائے کھڑا تھا۔ پشت کو اٹھتی ہوئی پہاڑی کی پیشانی پر ایک عرب رئیس کا بنگلہ تھا جس کے زمردیں لان اوپر سے لڑھکتے پھسلتے ہمارے مَیس کے حاشیے پر آ کر کہیں رکتے تھے۔ ذرا ہٹ کر ناریل کے پیڑ ایک دوسرے پر جھکے ہوئے تھے۔ جن کا منظر چاندنی راتوں میں بڑا افسوں خیز ہوتا تھا۔ مرشد فرماتے۔ چانسری لین کے مناظر جس شخص کے ذوق کی تسکین

نہیں کر سکتے۔ اس گدھے کو سارے سوئٹزرلینڈ میں گھما لائیے تو بھی اس کے پلے کچھ نہیں پڑے گا۔

اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ مطالعہ و سیاحت کی فرصت کی خاطر دفتر کا کاروبار میرے حوالے مرشد کی ایک ادا تھی۔ لیکن اس ادا میں تصنع یا تکلف ہرگز نہ تھا مجھے یقین ہے کہ وہ اس وقت اپنی باتوں پر واقعی یقین کر رہے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ دل ہی دل میں انہوں نے باقی کے سفر کا کوئی تفصیلی نقشہ بھی کھینچ رکھا ہو۔ مجھے کچھ ایسا خیال پڑتا ہے کہ اس روز مرشد کوئی آدھ گھنٹہ پہلے ہی دفتر سے اُٹھ کر چلے گئے تھے۔ دوسرے دن صبح کو ناشتے کی میز پر بھی موجود نہیں تھے۔ کمرے میں جھانکا تو دیکھا کہ کُرتے پاجامے میں لیٹے "سٹوری آف سان مائیکل" میں مستغرق ہیں۔ "سٹوری آف سان مائیکل" مرشد کی تازہ ترین دریافت تھی۔ فرمایا ——— مولانا اس سے بہتر کتاب تو میں نے آج تک نہیں پڑھی"۔ لیکن بعد میں ہم اس طرح کے غلو کے عادی ہو گئے۔ مرشد کا انداز ہی یہ تھا ان کے مطالعہ کی کتابیں منتخب تو ہوتی ہی تھیں بس جو کتاب شروع کرتے۔ اس کے عشق میں مبتلا ہو جاتے "سٹوری آف سان مائیکل" سے پہلے ٹالسٹائی کی "وار اینڈ پیس" دنیا کی بہترین کتاب تھی۔ اور اس سے پہلے ہکسلے کی "ایلس اِن غازہ"

ہم نے پوچھا "آپ دفتر میں تو نہیں تشریف لے جائیں گے" ———

بولے ——— مولانا مجھے تو آپ چھٹی ہی دے دیں۔ میں چاہتا ہوں ——— مگر ہاں دیکھیے کوئی دس بجے کے قریب جیپ بھیج دیجیے گا۔ ذرا ریفلز لائبریری کا چکر لگا آؤں گا ——— ممکن ہے تھوڑی دیر کو دفتر بھی آ نکلوں"۔

ہمارا دفتر سیسل اسٹریٹ میں ایک عمارت کی بالائی منزل میں تھا۔ سیسل اسٹریٹ کو سنگاپور کی فلیٹ اسٹریٹ کہہ لیجیے۔ اس زمانے میں سنگاپور کے تمام انگریزی طلائی روزنامے وہیں سے نکلتے تھے۔ جس جگہ ہم بیٹھتے تھے۔ وہ جنگ سے پہلے ایک ڈچ تجارتی کمپنی کا دفتر تھا جو ملایا سے ربڑ اور مسالے برآمد، اور ڈنمارک سے بیئر درآمد

کرتی تھی۔ دفتر کیا تھا ایک وسیع ہال تھا جو کسی زمانے میں پارٹیشنوں سے مزین ہو گا۔ مگر جاپانیوں کے چار سالہ تسلط میں ان تکلفات کا نام و نشان مٹ چکا تھا۔ جاپانی جس عمارت میں بسیرا کرتے۔ اس کی کھڑکیاں اور دروازے تک غائب ہو جاتے۔ ساگوان کی بیش بہا الماریوں کو توڑ کر چاول ابالنے کے لیے چولھا سلگا لینا ان کے لیے کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ الغرض ہمارا دفتر بالکل ننگ دھڑنگ قسم کا دفتر تھا۔ جس کے چوبی فرش پر بھاری بھرکم فوجی بوٹ ہر وقت ایک زلزلہ بپا کیے رکھتے تھے۔ ابھی دس بج کر کچھ ہی منٹ گئے تھے کہ اس زلزلے کی لرز اور گرج میں ایک شدت پیدا ہو گئی اور ہم سمجھ گئے کہ مرشد تشریف لے آئے۔ موٹی موٹی کتابوں کا ایک "دو بغل بھر پلندہ" ریک میں پھینکا، ٹوپی اتاری، سگرٹ منہ میں اڑسی اور ماچس کھٹکھٹاتے ہوئے بیٹھ گئے۔ ہم جانتے تھے کہ مرشد اخبار سے جدائی برداشت نہیں کر سکیں گے۔ مرشد کی نظروں میں سب جاہل تھے کوئی ذرا کم، کوئی قدرے زیادہ۔ اخبار وہ ہمارے ہاتھوں میں کیسے چھوڑ سکتے تھے؟ چنانچہ آتے ہی جائزہ شروع ہو جاتا۔

"مولانا لائیے تو ادھر، یہ آپ کیا لکھ رہے ہیں ——— مولانا یہ کوئی سرخی تو نہ ہوئی، ہمیں تو بتایا گیا تھا کہ خبر کی سرخی میں جملہ فعلیہ خبریہ ہونا چاہیے ——— آپ کو شاید ان سے تعارف نہ ہو لیکن مولانا مبتدا اور خبر، مضاف اور مضاف الیہ میں ایک بہت قریبی رشتہ ہوتا ہے ——— اور ——— بھئی محرم علی میں آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ آپ سر صبح کاتبوں کے قلم ضرور دیکھ لیا کریں۔ کل کی سرخیاں تو ایک دوسرے کو کھانے کو دوڑ رہی تھیں۔

حمید صاحب "نون" کا دائرہ بنانے کی مشق اگر آپ نے لگ کر چار پانچ برس کر لی تو آپ "نون" بنا لیا کریں گے۔ فی الحال تو آپ کا نون فیروز خان نون کا "نون" معلوم ہوتا ہے"۔

تعریف کے معاملے میں مرشد شقاوت کی حد تک سخت تھے کچھ تو اس لیے کہ دوسروں کو ماپتے جانچتے وقت شاید نادانستہ دوسروں کا موازنہ اپنے ساتھ کر جاتے تھے اور ظاہر ہے کہ موازنہ ان سے ہو تو تعریف کے قابل کون نکلے! ——— پھر انہیں یہ خیال بھی تھا کہ علم و ادب سے تعلق رکھنے والے آج کل کے نوجوانوں کی بر خود غلطی پہلے ہی تشویش ناک صورت اختیار کر چکی ہے انہوں نے تعریف کر دی تو مبادا دماغ ہی خراب ہو جائے۔ وہ حیران ہوتے تھے کہ یہ کیسا دور آگیا ہے کہ لوگ ابتدائی قواعد کے اصول جانے بغیر عربی و فارسی کی تحصیل کے بغیر، اساتذہ کے کلام کا مطالعہ کیے بغیر، شعر کی تہذیب اور اس کا مزاج سمجھے بغیر، مصنف اور شاعر بن بیٹھے ہیں۔ مست قلندر میں ایک افسانہ چھپ گیا، چلو افسانہ نگار بن گئے۔ "پھلجھڑی" نے ایک غزل شائع کر دی، لیجیے شاعر ہو گئے، پھر تحسین باہمی کے حلقے قائم کر کے جہالت کے حصاروں میں قید ہو کر بیٹھ گئے۔

ایک مرتبہ مجھے بھی مزاحیہ کالم لکھنے کا شوق پیدا ہوا تھا۔ پہلے روز کالم مرشد کو دکھایا۔ کالم پر نگاہ جماتے سگرٹ سے سگرٹ سلگاتے گئے۔ پڑھ چکے تو سگرٹ کے کش کے بیچوں بیچ ایک مبہم سی ——— "ہونہہ" ——— کہہ کر کاغذ مجھے دے دیا۔ منہ لٹکاتے ہوئے میں واپس اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ دوسرے روز پوچھتے ہیں ——— "مولانا وہ اپنا کالم آپ نے کیا کیا۔ آج کے اخبار میں تو نہیں ہے۔" میں نے عرض کیا ——— "پھاڑ کر پھینک دیا تھا" ——— "فرمایا ——— "دے دیتے تو کیا ہرج تھا۔ اور لغویات بھی تو چھپتی رہتی ہیں۔" مرشد کی زبان سے یہ بھی گویا حوصلہ افزائی کے کلمات تھے۔ اس کے بعد کبھی کبھار میں کالم لکھ کر مرشد کے پاس لے جاتا اور ان سے ——— "ہونہہ" ——— وصول ہو جاتی جو کالم کی اشاعت کی اجازت بھی ہوتی۔

ایک روز تو انہوں نے تعریف کی حد ہی کر دی۔ ارشاد ہوا ——— مولانا اگر آپ

محنت کریں تو ممکن ہے ایک روز آپ کو کالم لکھنا آجائے۔ آپ کو یہ بہت بڑا ایڈوانٹیج ہے کہ آپ اَن پڑھ ہیں اس لیے آپ فلاں یا فلاں کے اسلوب نقل کرنے کے بجائے خود اپنی سیدھی سادی زبان میں بات کہہ جاتے ہیں یہ تحریر کی بڑی خوبی ہوتی ہے نگارش کی اپنی طرز اسی سے بنتی نکھرتی ہے ——— ان دو جملوں کے علاوہ مرشد کے منہ سے کبھی کوئی توصیفی کلمہ سننا نصیب نہ ہوا۔ اگرچہ پس پشت وہ اپنے شاگردوں کی تھوڑی بہت تعریف کر دیا کرتے تھے۔

مرشد کے ساتھ بات کرنا تلوار کی دھار پر چلنا تھا معمولی سے معمولی غلطی کو اپنے اسلوب اور طنز کی تازگی کے ساتھ وہ مہینوں تر و تازہ رکھتے یہ ناممکن تھا کہ کسی روز وہ کام سے مطمئن ہو جائیں یا کھل کر شاباش دے جائیں۔ معیار کے معاملے میں وہ قدم قدم پر ابوالکلام آزاد، مولانا جالب اور نصیر حسین خیال کا حوالہ دیتے نصیر کی رائے تھی کہ اگر خود مولانا آزاد، مولانا جالب اور نواب نصیر حسین خیال بھی ان کے اسٹاف میں ہوتے تو ان کا مرتب کیا ہوا اخبار مرشد کے معیار پر شاید ہی پورا اترتا مرشد کے ساتھ کام کرتے ہوئے ایک عجیب سی گھٹن طاری رہتی تھی مگر ان کے جانے کے بعد ہی محسوس ہوا کہ اس گھٹن سے ہم نے کتنا کچھ سیکھا۔ اور ان کی نظر، اپنے پیشے میں ہمارے قد و قامت کو کتنا اونچا لے گئی تھی۔ علم و فن پر ان کا اپنا انداز طالب علمانہ تھا۔ اپنے آپ کو انہوں نے کبھی فارغ التحصیل نہیں سمجھا وہ ہمیشہ ہر وقت علم کے اکتساب میں مصروف رہے۔ کہا کرتے تھے اخبار نویسی کرتے پچیس برس ہو گئے ہیں لیکن یہاں فوج میں آکر اور پبلک ریلیشنز کے اپنے ساتھی انگریز صحافیوں کے کام کو دیکھ کر صحافت کے کئی گُر اب سمجھ میں آگئے ہیں" ——— فرینک اون کے آپ بڑے مداح تھے۔ فرینک اون ان دنوں برطانوی فوجوں کے اخبار "سی آئی" کا ایڈیٹر یعنی انگریزوں کا چراغ حسن حسرت تھا۔ آج کل وہ غالباً برطانیہ کے سب سے کثیر الاشاعت روزنامے کا ایڈیٹر ہے۔

سنگاپور میں "دوالفقیر" کتابوں کی ایک بڑی دکان تھی۔ جس کے مالک ایک مدراسی مسلمان تھے۔ مدراس میں عبدالفقیر نام عام سننے میں آتا ہے۔ پتہ نہیں "دوالفقیر" ——— عبدالفقیر ہی کا مخفف ہے یا ذوالفقار کی مالا باری شکل۔ مرشد اسی تجسس میں دو ایک مرتبہ اس دکان پر گئے اور پھر یہ معمول بن گیا کہ دفتر سے واپسی پر وہاں ضرور رک جاتے سنگاپور کی مرطوب آب و ہوا میں ساری دوپہر کام کرنے کے بعد ہمیں گھر جانے کی جلدی ہوتی مگر مرشد ہیں کہ دکان پر کھڑے ایک شیلف سے دوسرے شیلف اور دوسرے سے تیسرے کی طرف کھچے چلے آرہے ہیں۔ کتابوں کی دکان کے اندر جاکر وہ باہر نکلنے کا راستہ ہی بھول جاتے۔ ایک ایک کتاب سے تاک جھانک ہو رہی ہے۔ ادھر ہم دروازے پر کھڑے یا جیپ میں بیٹھے انہیں کوس رہے ہیں۔ بعض اوقات ہم انہیں اتار کر خود چپکے سے فرار ہو جاتے اور جیپ واپس بھیج دیتے۔ مرشد کو اس پر بڑا دکھ ہوتا اس لیے نہیں کہ ہم نے ان کا انتظار کیوں نہ کیا۔ اس لئے کہ ہم نے ان کے ساتھ اکٹھے رہتے اور کام کرنے کے باوجود ہم اتنے کور ذوق اور بے حس کیوں تھے کہ کتابیں قطار در قطار اور منزل بہ منزل رکھی ہیں مگر ہم میس کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ مرشد کا بس چلتا تو وہ میس کے بجائے دوالفقیر یا کتابوں کی کسی دوسری دکان پر بستر لاڈالتے۔

دفتر سے مرشد کبھی غیر حاضر نہیں ہوئے ویسے ارادہ انہوں نے کئی مرتبہ کیا بعض اوقات محض اس خیال سے کہ یونٹ کا آفیسر کمانڈنٹ ہونے کی وجہ سے ان میں اور دوسروں میں آخر فرق ہی کیا ہوا؟ ان سے آخر کون سوال کر سکے گا۔ کہ آپ دفتر کیوں نہیں آئے؟ مگر پھر دفتر کے بغیر جی بھی نہ لگتا۔ ایک دو گھنٹے بعد ٹیلی فون آجاتا کہ جیپ بھیج دو۔ دفتر آئے اور کوئی چیز لکھنے بیٹھ گئے۔ ایک دفعہ اردو کے شاعروں کے تذکروں کا ایک سلسلہ اخبار میں شروع کر دیا اور کسی کتاب یا حوالہ کی مدد لیے بغیر بیسیوں شعر اوبھگتا دیئے۔ جن شاعروں کا ہم میں سے کسی کو نام بھی یاد نہ تھا، ان کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات

ہی نہیں، بلکہ ان تاریخوں میں اختلافات کی بحث، ان کے کلام کی خصوصیات اور چیدہ چیدہ اشعار یوں قلمبند کرتے چلے جاتے تھے جیسے کہیں سے نقل کر رہے ہیں۔

قلم اور زبان پر مرشد کا جتنا زور چلتا تھا زندگی کے دوسرے مسائل اتنے ہی ان کے قابو سے باہر تھے۔ کسی ادارے کی تکمیل ان سے نہیں ہو سکی ویسے جناب کے ارادے بھی ناقابل عمل ہوتے مثلاً وہی بالی کے سفر کا ارادہ لے لیجیے جس کی طرف سرسری سا اشارہ اوپر آچکا ہے۔ اس زمانے میں بالی کا سفر اتنا ہی آسان تھا جتنا کہ پنگ پر راولپنڈی سے واہ تک چلے جانا ہے۔ ایئر فورس کے ہوائی جہاز چاروں طرف بھاگے بھاگے پھرتے تھے اور پبلک ریلیشنز کا نام ہر سفر کے لئے کھل جا سم سم کے معنی رکھتا تھا۔ لیکن مرشد بھلا عوام الناس کی طرح سفر کیوں کرتے۔؟ مرشد کے بالی کے سفر کا تصور یہ تھا کہ ضمیران کے ساتھ ہو۔ کچھ پیدل، کچھ اکوں پر اور کچھ ٹٹوؤں پر وہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں پہنچیں۔ کھانے کا وقت جہاں آجائے پڑاؤ کر کے وہیں چولھا روشن کیا جائے ایک آدمی لکڑیاں چن رہا ہو دوسرا دیگچی مانجھ رہا ہو اور پگڈنڈی کے کنارے مرغی بھونی جا رہی ہو ——— اس طرح کا ایک اور شاعرانہ ارادہ ان کا یہ تھا کہ سنگاپور سے دو چار میل پر ایک چھوٹا سا جزیرہ وہ پٹے پر لے لیں اور باقی زندگی وہاں مطالعہ و تصنیف میں گزار دیں۔ گھنٹوں اس اسکیم کا ذکر اذکار رہتا۔ ایک دفعہ میں نے نہایت ہی غیر شاعرانہ سوال کر دیا کہ اس غیر آباد جزیرے میں بسر اوقات کی کیا صورت ہو گی۔ فرمایا ——— بھئی یہ جزیرے تو اللہ تعالےٰ نے جنت کے نمونے پر بنائے ہیں کہ فکر روزگار کا وہاں گزر تک نہیں ہے۔ اس مٹی میں آپ دھان کی مٹھی اٹھا کر پھینک دیں اور دوسرے مہینے فصل لپیٹ لیں۔ کھانے کے لیے مرغیاں پال لیں، پھر ناریل ہیں کہ آپ کے لیے آکل و شراب کے قاب سر پر اٹھائے کھڑے ہیں۔ صبح صبح ایک کشتی میں بیٹھ گئے اور کچھ تازہ بہ تازہ، تو بہ تو مچھلی پکڑ کر لائے۔ مولانا

انسان کو اور کیا چاہیے؟

مرشد دراصل اپنی ذات میں ایک وضع اور ایک تہذیب کے سمبل تھے لوگ کہتے ہیں مولانا چراغ حسن حسرت کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ ان کا جسدِ فانی ختم ہو گیا۔ مگر ان کا نام کبھی ختم نہ ہوگا ممکن ہے یہ سب درست ہو لیکن ہمیں اس میں تسلی کا کوئی سامان نہیں ملتا، حسرت کا نام زندہ رہ سکتا ہے۔ مگر ہم جانتے ہیں ہمارا مرشد اب یہاں نہیں ہے اور اس کے ساتھ ہی ادب و فن اور تہذیب و وضع داری کا ایک پورا دور تاریخ کے ایک موڑ کے اُدھر اوجھل ہو گیا ہے۔ مرشد ہی نہ رہے تو اب کون ہوگا۔ جو گھنٹوں اس تحقیق میں لگا رہے کہ جُوں جُوں کے بعد توں توں کہا جاتا ہے تو کیوں کہا جاتا ہے آج کسی لکھنے والے کی تحریر میں محاورے یا گرامر کی کسی غلطی کی طرف اشارہ کیا جائے تو جواب ملتا ہے کہ جناب میں تو اسی طرح درست سمجھتا ہوں۔ مرشد ذرا سے اشتباہ پر سند کے لیے پریشان ہو جاتے تھے ——— "سالک صاحب فلاں محاورے کے متعلق کچھ الجھن سی لاحق ہو رہی ہے۔ کچھ یاد پڑتا ہے کہ منشی دیا شنکر نسیم نے اس محاورے کو اس طرح باندھا ہے مگر اب وہ مقام ذہن سے اُتر گیا ہے۔ آپ کے ذہن میں تو کوئی سند ہوگی؟" ——— لیکن میں بھی کہاں سے کہاں پہنچ گیا آیئے پھر سنگاپور کی طرف!

دفتر میں مولانا کے چہرے پر خشونت، سی طاری رہتی تھی جس کی وجہ سے دفتر کے اوقات میں اُن سے کھل کر بات کرنے کی جرأت کوئی نہ کرتا۔ اس وقت وہ حسرت صاحب بلکہ بعض اوقات "سر" تک ہو جاتے تھے لیکن دفتر سے اٹھتے ہی سب حجابات اٹھ جاتے اور وہ حسرت صاحب سے اتر کر مرشد ہو جاتے۔ جیپ کی اگلی نشست پر جناب پھیل جاتے اور پچھلی نشست میں جاوید، انعام قاضی، ضمیر اور میں اب فقرے پر فقرہ چست ہو رہا ہے بات میں سے بات نکل رہی ہے، راستے میں اس لیے نکلنی سے بولتے کہ سنگاپور کے ٹریفک کے تمام شور و غل کے باوجود پٹڑی پر چلتے ہوئے

راہگیر ان کی بات سن سکتے تھے کئی دفعہ ایسا ہوا کہ کسی واقف کار نے کوئی ایسا انکشاف کر دیا جس پر غصہ، ندامت، تعجب یا کوئی مناسب ردِ عمل جو ہوتا وہ تو ہوتا ہی تھا سب سے زیادہ کوفت اس بات پر ہوتی، کہ "قوم" کا یہ قصہ باہر کیسے پہنچ گیا۔ بعد میں پتہ چلتا ——— "ارے بھئی کل جب تمہاری جیپ گزر رہی تھی میں براستہ روڈ پر "کون واہ" میں کھڑا تصویریں دیکھ رہا تھا کہ حسرت صاحب کی آواز نے چونکا دیا اور پھر جو کچھ وہ فرما رہے تھے اس نے اور بھی ——— الغرض دفتر سے باہر قدم رکھتے ہی مرشد کچھ اور ہو جاتے مگر داستان کا یہ حصہ ضمیر سے سنیے کہ وہ اس معاملہ میں ماہرِ مرشدیات" ہے۔

دفتر میں میرا ان کا واسطہ کچھ ویسے کم تھا، کچھ میں اس واسطے کو اور بھی کم رکھتا تھا اس واسطے سے بس یہ سمجھیے کہ کچھ خوف ہی آتا تھا۔ مرشد جب آواز دیتے، دل دہل جاتا۔ الٰہی خیر! نہ معلوم کمبخت کون سا محاورہ الٹا جا پڑا؟ کس روزمرے کو تکلیف پہنچ گئی؟ کہیں کوئی شتر گربہ تو نہیں پکڑا گیا۔ خدا معلوم تذکیر و تانیث کا کون سا شاخسانہ اٹھنے والا ہے؟ ہمیں مرشد کے سامنے اپنی جہالت کے اعتراف و اقرار میں کیا تامل ہو سکتا تھا تاہم نوجوانوں کی پوری معنوی نسل کو اپنے سامنے تختۂ دار پر کھینچتے ہوئے دیکھنے سے کتراتے ضرور تھے۔ ہمیں مرشد کی ڈانٹ سے زیادہ ان کی مایوسی و آزردگی کا ڈر تھا۔ وہ گاندھی جی کی طرح دوسروں کو سزا دیتے ہوئے اپنے آپ کو سزا دینے لگتے تھے۔

میں مرشد کی شاموں اور راتوں کا اردلی تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ دنوں کی نسبت اپنی شبوں میں کہیں زیادہ زندہ و تابندہ نظر آتے تھے۔ دن کو تو وہ اکثر ایک نہایت واہیات سے خول میں، جس کو انہوں نے اپنی شخصیت کے اوپر منڈھ رکھا تھا، سکڑ کر بیٹھے رہتے۔ بعض اوقات ان کا رویہ نہایت روکھی پھیکی سرد مہری سے جا ملتا۔ ہم نے بارہا یہ تماشا دیکھا کہ کوئی ملاقاتی آکر بیٹھتا ہے۔ مگر مرشد سگریٹ کا ٹن اس کے سامنے رکھ کر خول میں چھپے بیٹھے ہیں۔ وہ غریب پشیمان ہو کر اٹھنے لگا تو مرشد جیسے چونک

کر بولے ـــــ "ہوں ـــــ تشریف رکھیے مولانا، آپ سے تو ابھی بہت سی باتیں کرنا ہیں" ـــــ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا تو پھر مرشد غائب۔ دراصل ان کے اپنے اندر اتنا کچھ تھا کہ باہر دیکھنے کی انہیں فرصت نہ تھی نہ خواہش، البتہ شام کو جب آفتاب غروب ہوتا تو یہ آفتاب طلوع ہوتا۔ ان کی عادت تھی کہ دفتر سے آنے کے بعد کوئی کتاب سینے پر رکھ کر تھوڑی دیر کے لیے سو جاتے سرِ شام بیدار ہوتے، غسل کرتے، لباس بدلتے چھٹی کا دن ہوتا تو سرے سے اٹھتے ہی اس وقت، شیو بھی شام ہی کو بناتے۔ ان کے لیے جاگ کر سونا جتنا مشکل تھا، سو کر جاگنا اس سے زیادہ مشکل تھا۔ اور جاگ کر پھر کہیں باہر جانے کے لیے تیار ہونا تو گویا قطرے کا گہر ہونا تھا۔ صاف ستھرا لباس پہننے کا شوق ضرور تھا مگر اس شوق کو اتنی اہمیت بھی نہیں دے رکھی تھی کہ لباس خود پہننا بھی پڑے۔ سگرٹ، کتاب اور شراب کے علاوہ وہ کسی شے کو بھی کوئی خاص اہمیت نہ دیتے۔ فوجی وردی کی نوک پلک کے بارے میں سخت لاپرواہ تھے۔ مگر چونکہ بڑا جرنیلی قد کاٹھ پایا تھا اس لیے جو چیز جس طرح پہن لیتے، سج جاتی۔ وہ تیار ہوتے نہیں تیار کرائے جاتے تھے۔ ان کا "بیٹ مین" عنایت اللہ جس کو وہ علامہ کہتے تھے، بیگم حسرت پر تحسین و آفرین بھیجتے ہوئے اکثر کہا کرتا تھا ـــــ "میں تو صاحب کو بچوں کی طرح پال رہا ہوں"۔

مرشد تیار ہو کر بیٹھتے تو پوری قوم ان کے کمرے میں جمع ہو جاتی۔ میس میں ملحق بڑی اعلیٰ نشست گاہ موجود تھی۔ لیکن وہاں جا کر بیٹھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ اگر مرشد کا بس ہوتا تو وہ کھانا بھی اسی میز پہ کھاتے جس پہ سرسٹ ماہم، جیمز جوئس، عذرا پاؤنڈ اور بالزاک وغیرہ کے دوش بہ دوش حجامت کا سامان، عینک، گھڑی، سگرٹ اور ماچس، قلم اور کاغذ، معدے کے انگریزی چورن، موزے اور چھوٹی موٹی درجنوں دوسری چیزیں پڑی رہتی تھیں۔ "محفل نورانیاں"۔ اسی میز کے گرد جمتی۔ مرشد اس وقت اپنے آپ کو خول سے نکال کر میز پہ رکھ دیتے اس وقت ان کے چہرے کی شگفتگی اور گھنی

گنجان مونچھوں میں سے پھوٹ کر کان کی لوؤں تک پھیلتی ہوئی ایک دلآویز مسکراہٹ دیکھنے کی چیز ہوتی۔ شام ہوئی اور مرشد نے اپنا مخصوص نعرۂ مستانہ بلند کیا ـــــ "ذرا خان صاحب کو آواز دینا"۔

یہ خاں صاحب پوری یونٹ کے کوارٹر ماسٹر تھے جو عملاً مرشد ہی کے لیے وقف ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ بے چارے صبح سے اس آواز کے منتظر ہوتے اور آواز سنتے ہی میز کو کارگاہ شیشہ گراں بنا کر رکھ دیتے۔ مرشد کی "محفل شبینہ" کی پہلی مجلس ڈنر تک جاری رہتی اور ڈنر وہ گیارہ بجے سے پہلے شاذ ہی کھاتے۔ یہ "محفل شبینہ" ـــــ "ذرا خاں صاحب کو آواز دینا" ـــــ سے شروع ہو کر عموماً اس مقام پر ختم ہوتی جہاں یا تو حلق سے کوئی آواز نکل ہی نہ سکتی یا لوگ اپنے آپ کو آواز دینے لگتے۔ مرشد کو اپنے دور کے کسی شاعر کا کوئی شعر شاید ہی یاد ہو مگر اساتذہ قدیم کے بے شمار اشعار سینے میں محفوظ تھے۔ بالعموم وہ داغ سے شروع ہوتے پھر جوں جوں کیف بڑھتا جاتا توں توں غالب غالب و بیدل سے ہوتے ہوئے عرفی و نظیری، سعدی و حافظ کی طرف اوپر ہی اوپر چڑھتے جاتے۔ دوسروں کے شعر پڑھنے میں انہیں جتنی راحت ہوتی، اپنے شعر سنانے میں اتنی ہی وحشت ہوتی، ہم اصرار کرتے تو لاحول پڑھ کر ٹال دیتے لیکن محفل شبینہ کے آخری رسیلے لمحات میں ہتھیار ڈال دیتے اور پھر ایک نہایت پُرسوز، کھوئے کھوئے، ڈوبتے ابھرتے ترنم کے ساتھ، جس میں ماورائے سخن بھی ایک بات ہوتی، ڈھائی ڈھائی تین تین شعروں کی دو چار غزلیں سنا دیتے۔ ان کی مشہور غزل ـــــ "آؤ حسنِ یار کی باتیں کریں" ـــــ "ہمارا قومی ترانہ" تھی جس کے بعد مرشد حسنِ یار کی باتوں سے آگے نکل کر خود "آستانِ یار" کی طرف چل پڑتے ہاؤ ہو کی یہ محفلیں، مرشد کے کلاسیکی مذاقِ ادب، ان کے وسیع معلومات، دل نشیں ظرافت، شستہ و برجستہ بذلہ سنجی اور برمحل اعلیٰ اشعار کی ترشیح کے باعث ایک سدا بہار دبستانِ علم و دانش کا درجہ رکھتی تھیں باتوں باتوں میں ہم وہ کچھ سیکھ جاتے جو برسوں کے

باقاعدہ اکتساب سے بھی شاید ہی سیکھ سکتے بحث کے معاملہ میں ان کا معاملہ یہ تھا کہ اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے ـــــ چنانچہ انہیں چھیڑنے کے لیے ہم کوئی غلط نظریہ کوئی متنازعہ فیہ محاورہ، کوئی بھونڈا اسلوب بیان شیر شاہ سوری کا غلط سال جلوس، شبلی کے مآخذات، سیماب اکبرآبادی کا کوئی شعر، ـــــ غرضیکہ کوئی سی بات مصرعہ طرح بنا کر چھوڑ دیتے اور مرشد مشرق و مغرب کی وسعتیں سمیٹ کر دیکھتے دیکھتے معلومات کا ایک قطب مینار کھڑا کر دیتے کسی لفظ کی صحت کے درپے ہو گئے تو اردو، فارسی اساتذہ کے یکمشت پندرہ بیس اشعار گویا ایک دوسرے سے بندھے ہو چلے آرہے ہیں۔ قدیم اساتذہ میں سے وہ خدا معلوم کہاں کہاں سے ایسے ایسے گمنام لیکن جید شعرا کو ڈھونڈ نکالتے جن کو جاننا ادب کو جاننے کے لیے لازمی ہے مگر جانتا کوئی نہیں۔ اردو شاعری میں وہ حسرت موہانی اور اقبال کے بعد کسی شاعر سے کوئی سروکار نہ رکھتے۔ جن شعرا کا کلام نظر سے گزرتا تھا یا جن کو ذاتی طور پر جانتے تھے۔ مرشد نے ان کو صرف دو درجوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ سوجھ بوجھ کا شاعر اور بکواس ـــــ کسی لفظ کے حسب نسب کا مسئلہ درپیش ہے تو چراغ لے کر مصر و یونان کے اندھیروں میں اتر جاتے اور عرب و عجم، افغانستان کشمیر سے ہوتے ہوئے جب مراجعت فرماتے تو ترکی الاصل، عربی النسل، ایرانی نژاد ـــــ اور خانہ زاد الفاظ کے الگ الگ جلوس ان کے ہمرکاب ہوتے ـــــ تاریخ پر عبور کا یہ عالم کہ غیاث الدین بلبن کے رکاب داروں کے نام مع سن ولادت و وفات سن لیجیے۔ سکندر اعظم مقدونیہ سے چل کر جن راستوں سے ہوتا ہوا بیاس تک پہنچا تھا۔ مرشد ان راستوں کے پتھر پتھر سے واقف تھے ـــــ اسلام کے تہذیبی، معاشرتی اثرات پر ان کی نظر اتنی گہری تھی کہ صدیوں کی دھوپ چھاؤں کے ایک ایک سائے کو علیحدہ علیحدہ کر کے دکھا دیتے۔ دوسری طرف پراچین ہندو دیومالائیں بھی گویا گھر کی لونڈی تھیں۔ افسانوی دیوی دیوتاؤں کے باہمی رشتوں ناطوں جھگڑوں اور آویزشوں سے پورے پورے باخبر، علم طب سے

اتنا گہرا شغف کہ اگر وہ ادب کے بجائے طب میں جا پڑتے تو شاید زیادہ آسودہ رہتے۔

مزے کی بات یہ کہ فلسفہ ہو یا فلکیات، بات اس قدر سلجھا کر بیان کرتے کہ مولانا صلاح الدین احمد کے الفاظ میں "موضوع کو پانی کر کے چھوڑتے" تاریخ ان کا خاص مضمون تھا۔ مرشد جو کچھ بولتے تاریخ معلوم ہوتا۔ جو کچھ لکھتے تاریخ بن جاتا۔

مرشد موج میں ہوتے تو نکتہ طرازی و انجمن سازی کے لیے کوئی غلط بات کہنے کی بھی ضرورت نہ ہوتی اس کیفیت میں وہ صحیح بات کے پرزے بھی اڑا دیتے۔ بالخصوص جہاں ذاتی پسند یا رائے کی گنجائش ہوتی مثلاً اگر آپ گاندھی جی کی عظمت بیان کر رہے ہیں تو مرشد بندوق کی نالی گاندھی جی کی طرف سیدھی کر دیتے اگر آپ گاندھی جی کی مذمت کر رہے ہیں تو مرشد اپنے ترکش کے سارے تیر لے کر گاندھی جی کی حمایت میں سینہ سپر ہو جاتے۔ اصلیت، جہاں تک میں سمجھ چکا ہوں، یہ تھی کہ ایک عظیم جینئس ہونے کی وجہ سے ان کی اپنی اَنا کا جذبہ بڑا قوی تھا۔ وہ بڑی سے بڑی شخصیت سے مرعوب ہونے کو تیار نہ تھے۔ چھوٹوں کے سامنے وہ جس عاجزی سے بچھ جاتے تھے بڑوں کے سامنے اتنے ہی سرکش نظر آتے۔ لیکن پھر چند شخصیتیں ایسی بھی تھیں جن کے سامنے ان کی گردن ہر وقت جھکی ہوئی ملی۔ علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد کے خلاف وہ ایک لفظ بھی نہ سن سکتے۔

دوستوں کی محبت ان کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ، سب سے بڑی تسکین تھی مگر دوستی کرنے میں وہ تقدم یا تیزی کے قائل نہ تھے۔ مدت تک یہی نہ کھل سکتا کہ وہ دوست بننے پر آمادہ بھی ہیں یا نہیں لیکن اندر ہی اندر نامعلوم طور پر دوسرے کے دل میں سما جاتے اور دوستی میں ان کی بے بسی یہاں تک پہنچ جاتی کہ دوست اگر دشمن بھی ہو جاتا تو وہ اسے چھوڑ نہ سکتے۔ عالی ظرفی کا یہ حال تھا کہ وہ سالک صاحب کی سب سے بڑی عزت ہی اس لیے کرتے تھے کہ سالک صاحب فن میں ان کے سب سے بڑے حریف تھے۔ احمد شاہ بخاری، مجید ملک، مولانا صلاح الدین، صوفی تبسم، تاثیر، عابد، فیض

تاج کا ذکر ہمیشہ بڑی محبت اور شیفتگی کے ساتھ کرتے اور ہندوستان بھر میں بہت کم لوگوں کو ان کے پلّے کا آدمی سمجھتے۔ نیاز مندوں کی ادبی خامیوں پر اندر خانے خواہ ان عزیزوں کو کھا جاتے۔ مگر بیرونی معرکوں میں مرشد کا طاقتور قلم ان کی ڈھال بن جاتا۔ اپنے ساتھ بیدل نظیری ظہوری، فغانی وغیرہ کو بھی دوست کی کمک پر لے آتے۔ دوستوں سے وہ کمزوری کی حد تک محبت کرتے تھے افراد و اقدار کے بارے میں ان کے جمے ہوئے نظریات و تعصبات اتنے بھاری پتھر تھے کہ کوئی دوسرا آدمی تو کیا، ان چٹانوں کو وہ خود بھی اپنی جگہ سے ہلا نہ سکتے تھے۔ سنگاپور میں وہ اپنے لاہور کے بعض ایسے جگری دوستوں کا تذکرہ اکثر بڑے فخر سے کرتے تھے۔ جن میں سے ایک دودھ دہی کی دکان کرتا تھا۔ ایک لوہے کے نلکے نلکیاں بیچتا تھا۔ اور ایک حسرت سے دوستی کے علاوہ سرے سے کوئی کام ہی نہ کرتا تھا۔ وہ جب ان کی بے غرض محبت، بے ریا خلوص بے لوث وابستگی میں اپنے حسنِ بیان کا جادو جگاتے تو یوں معلوم ہوتا کہ یہ لوگ جیسے ناولوں کے ہیرو تھے جو کتابوں سے نکل کر لاہور کے گلی کوچوں میں چلے آئے ہوں۔ بعض اوقات مرشد عشرت و آسودگی کے ماحول میں جو وہاں انہیں میسّر تھا۔ ان دوستوں کی یاد میں تڑپ اٹھتے، مغموم ہو جاتے اور ملازمت ترک کر دینے کے منصوبے سوچنے لگتے۔ ان کے ایک عزیز دوست ریاض شمیم (اب لیفٹیننٹ کرنل[1]) جب اتفاقاً تبدیل ہو کر سنگاپور آ گئے۔ تو مرشد اس قدر خوش ہوئے کہ اس طرح بے تحاشا خوش ہوتے ہم نے انہیں کبھی نہ دیکھا تھا۔ ہفتوں بھر ملنے والوں سے ریاض ہی کا تذکرہ چلتا رہا۔

"مولانا سُنا آپ نے۔ ریاض شمیم بھی یہیں آ گئے۔"

"میں دہلی میں تھا کہ وہ دانا پور سے بدل کر دہلی آ گیا۔ پھر کلکتے اور اب میرے

[1] میجر جنرل ہو کر ریٹائر ہوئے

پیچھے پیچھے یہاں بھی۔"

"آپ ریاض شمیم سے ملے ہیں ——— ضرور ملیے گا ——— حسین بھی ہے ذہین بھی ہے۔"

ان کا سینہ یقیناً آرزوؤں اور ارادوں کا تلاطم زار ہوگا۔ مگر وہ اپنی آرزوؤں، محرومیوں کی کتھا سے دوسروں کو کبھی مکدر نہ کرتے۔ زندگی کے ہر روپ کو ایک انعام، ایک فیضان سمجھتے جن دو ایک آرزوؤں کی بآواز بلند پرورش کیا کرتے ان میں سے ایک سلسلہ وار آرزو یہ تھی کہ دریا کے کنارے ایک معقول سا گھر ہو، ڈھنگ کی لائبریری ہو، جس میں بیٹھ کر وہ سمرنا سے بغداد، بغداد سے سمرقند تک کی تاریخ لکھتے رہیں۔ اور چند یار جانی ہوں۔ جن کے ساتھ شام کو ہاؤ ہو ہوتی رہے۔ غالباً یہ تنہا آرزو ہے جس کی تکمیل کے لیے انہوں نے عملی اقدام بھی کیا۔ پونچھ میں دریا کے کنارے ایک مکان بنوا لیا تھا، کتابوں کا خاصا ذخیرہ جمع کر لیا تھا مگر افسوس کہ حالات اور زندگی نے انہیں وہ کام نہ کرنے دیا جو صرف وہی کر سکتے تھے۔

لاہور شہر اور اس کی زندگی سے مرشد کو عشق تھا ——— سنگاپور کہ جنوب مشرقی ایشیا کا پیرس سمجھا جاتا تھا۔ بڑا ہی جمیل و تاب ناک شہر ہے۔ جنگ کے بعد فتح کی مسرتوں نے ان دنوں اس کو کچھ اور زیادہ پیرس بنا رکھا تھا۔ شراب وافر، وقت اپنا۔ غالب نے جو بات آم کے بارے میں کہی ہے وہی بات اس خطّے کے زہرہ شمائلوں پر صادق آتی تھی کہ آم بھی تھے اور شیریں بھی۔ آباد میخانے، شاداب رقص گاہیں، خواب گوں ساحل گاتے ہوئے کیبرے، جگمگاتے ہوئے کلب، معمور ریستوران، ہیپی ورلڈ گریٹ ورلڈ کے طرب خانے، آزادی، فرصت، فراغت۔ مرشد کو اور کیا چاہیے تھا؟ انہیں اس شہر سے یک گونہ لگاؤ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ سنگاپور نے انہیں زندگی کے دو ایسے بہترین اور عہد آفرین سال دیئے تھے کہ ہر برس کے تھے پچاس ہزار دن۔ مگر اس کے باوجود

سوادِ رومۃ الکبریٰ میں انہیں اپنی وِلی یعنی لاہور کی یاد ہمیشہ تڑپاتی رہی۔ میں ہر وقت سائے کی طرح ان کے ساتھ لگا رہا ہوں۔ مجھے ایسا کوئی لمحہ یاد نہیں۔ جب وہ لاہور کی یاد سے غافل ہوئے ہوں۔

"مولانا یہ شہر بکواس ہے"۔

"مولانا اس شہر کی اپنی کوئی شخصیت نہیں"۔

"مولانا بنگالپور کو آپ اٹھا کر فرانس میں بھی رکھ سکتے ہیں" اور لاہور کے فضائل میں،

"مولانا، لاہور بجلی کا بٹن دبانے سے نہیں بن گیا"

"مولانا، لاہور ایک تہذیب، ایک وضع کا نام ہے"۔

"مولانا، لاہور، لاہور ہے"۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ایک دعوت میں مرشد ایک میجر سیٹھی سے اتنی سی بات پر سچ مچ لڑ پڑے تھے کہ سیٹھی کے والد لاہور کی سکونت ترک کر کے لکھنؤ جا بسے تھے۔

مرشد کی رندمشربی کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں۔ نہ اتنی معمولی چیز ہے کہ میرے چھپائے چھپ سکے۔ وہ خرابی کے پورے معنوں میں رندِ خرابات تھے۔ انہیں سگریٹ، کتاب شراب سے الگ کر کے دیکھا ہی نہیں جا سکتا۔ انہیں اس طرح دیکھنا غلط بھی ہوگا۔ پینے کے معاملے میں وہ شاعری کے روایتی بلانوش کی طرح دریا سمیٹ کر پی جاتے تھے۔ جتنی پیتے جاتے حواس اتنے ہی روشن ہوتے جاتے۔ بڑی مشکل یہ تھی کہ ان کے بہکنے کا آسانی سے پتہ بھی تو نہ چل سکتا تھا۔ آنکھیں عموماً ویسے ہی سرخ و مست رہتی تھیں پائے وہ یوں کب جاتے تھے کہ کھوئے جانے کا سراغ مل سکے۔ اگر کوئی ٹوکتا کہ مولانا آپ شاید بہک گئے ہیں تو جواب ملتا ——— مولانا آپ بہک گئے ہیں۔ میرا تو سر دامن بھی ابھی تر نہیں ہوا۔ پھر ہوش مندی کا ثبوت دیتے

ہوئے تین چار ساغر پے در پے خالی کر جاتے۔ ان کا بہکنا اگر کچھ تھا بھی تو ایک نہایت معصوم سا، بڑا علمی قسم کا بہکنا تھا۔ طنز نوکیلا ہو جاتا، لطیفے بھرپور ہو جاتے، اشعار کی روانی طغیانی پر آجاتی۔ معصیت و بخشش کے مضامین زور باندھ دیتے۔ جن اشعار کو وہ پہلے پینے کا عنوان بناتے تھے۔ انہیں اشعار کو بعد میں رونے کا سامان بنا لیتے۔ ہم نے اپنی سہولت کے لیے یہ علامت مقرر کر چھوڑی تھی کہ مرشد جس وقت لاہور یا سالک صاحب کے موضوع پر بلاوجہ ہی دوسروں سے الجھنے لگیں تو یہ سمجھیے کہ وہ بہک گئے۔ اس مرحلہ پر وہ خان صاحب کو بلند آوازیں دیتے خان صاحب قریب نہ پھٹکتے۔

مرشد ہر شام کو جس فراوانی سے پیتے، جس باقاعدگی سے رات کو "شگفتن گلہائے ناز" کی سیر کو نکلتے اور پھر جس یکسوئی کے ساتھ ان نظاروں میں الجھ کر رہ جاتے، اس کے بعد ان سے یہ توقع رکھنا کہ انہیں اپنے گھر بار، بیوی بچے کا بھی کچھ خیال ہوگا۔ ایک زیادتی کی بات تھی۔ بظاہر ان کی وارفتگی سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ ؎

دل میں ذوقِ وصل و یاد یار تک باقی نہیں

لیکن یہ سب قیاس ہی قیاس تھا۔ مرشد کی شخصیت کا سب سے حیرت انگیز پہلو یہی ہے کہ وہ اندر ہی اندر ایک نہایت جمے ہوئے گھریلو قسم کے انسان تھے بڑے شفیق باپ، نہایت رفیق القلب شوہر، اپنی ساری ماورائیت کے باوصف ان کا دل ہر وقت لاہور یا لوچھ میں اپنے بیوی بچے کے ساتھ دھڑکتا رہتا تھا گھر سے خط آنے میں دو روز کی تاخیر ہو جاتی تو پریشان ہو جاتے جوابی تاروں کا سلسلہ باندھ دیتے۔

بازار کی خرید و فروخت سے انہیں سخت وحشت ہوتی تھی۔ ان کی ضرورت کی اکثر چیزیں ہمیں لوگ خرید لاکر دیتے۔ مگر جب کبھی خود بازار میں نکلتے تو ظہیر و زینب

کے لیے ضرور کوئی نہ کوئی تحفہ خرید لیتے۔ ظہیر کو اتنے لمبے لمبے اور پیارے پیارے خط لکھتے کہ اگر اتنا وقت مستقل تصنیف کی طرف دیا ہوتا تو وہ "بغداد سے سمرنا" تک والی تاریخ لکھ ڈالتے ——— ایک مرتبہ آپ وہاں ذرا ایک ——— باقاعدہ عشق میں مبتلا ہو کر عقدِ ثانی پر آمادہ ہو گئے مہینوں تگ و دو ہوتی رہی سینکڑوں ڈالر کے تحائف لڑکی والوں کی نذر کر دیئے۔ مگر جب عقد کی ساعت قریب آئی تو ظہیر یاد آگیا ——— زینب یاد آگئی ——— پونچھ یاد آگیا ——— اور آخر ش اپنے ہونے والے معزز خسر کو یہ پیغام بھجوا دیا کہ مولانا مجھے معاف کر دو ——— مجھ پر لعنت بھیجو۔ مجھے بھول جاؤ!

مرشد کی گشتِ شبینہ کا انداز بھی کچھ اپنا ہی تھا، مغربی موسیقی سے انہیں ہول آتا تھا فلم دیکھنے کو وہ تضیعِ اوقات سمجھتے۔ البتہ چینی، ملائی، انڈونیشی اوپروں کو شوق سے دیکھتے۔ لیکن کسی ایک مقام پر دیر تک بیٹھے رہنا ان کے لیے قریب قریب ناممکن تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ کسی ابتدائی گیت پر یا منظر پر خوش بھی ہو لیتے۔ سر بھی ہلا دیا۔ ساتھ ساتھ کلچر کی بحث بھی اٹھاتے رہے مگر پھر دس پندرہ منٹ کے بعد اکتا بھی گئے۔

"مولانا یہ تو بکواس ہے ——— آیئے کہیں اور چلتے ہیں"۔

اس کے بعد کہیں اور ——— اور جب تک شہر کا آخری اوپرا بند نہ ہو جاتا "کہیں اور" کا سلسلہ بند نہ ہوتا۔ ریستورانوں میں بیٹھنے کا بھی یہی ہنجار تھا۔ ایک سے دوسرے میں دوسرے سے تیسرے میں۔ کہیں دو منٹ کو بیٹھ جاتے، کہیں لوگ بہت زیادہ ہوتے کہیں بہت کم ہوتے، ہر رات قریباً سارا شہر گھوم کر لوٹتے وہ تھوڑی سی مہلت میں بہت کچھ دیکھ لینا چاہتے تھے، کیسی بھی جگہ ہو، ایک مقام سے بہت جلد ان کی طبیعت بھر جاتی تھی۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی سے بھی شاید اسی لیے وہ بہت جلد اکتا گئے۔

سیر و سفر میں کبھی کبھار وہ بے مقصد و بے اختیار ہو کر ——— جیسے ندی میں کوئی سنگِ رواں آوارہ ——— گھومنے کے بھی بڑے حامی و مبلغ تھے۔

"مولانا ان نپی تلی شاہراہوں میں دھرا ہی کیا ہے؟"

"مولانا زندگی بڑی بیکراں چیز ہے"۔

"مولانا زندگی کو آگے پیچھے شمال جنوب ہر طرف سے دیکھنا چاہیے"۔

"مولانا آیئے آج ہم اپنے آپ کو شہر پر چھوڑ دیں"۔

اور اپنے آپ کو شہر پر چھوڑنے کے معنی یہ ہوتے کہ وہ حسرت صاحب جو صبح کی سیر میں بھی پیدل نہ چلتے تھے، گھنٹوں شہر کے دالان در دالان قسم کے عقبی کوچوں میں پھرتے۔ ایک مرتبہ اپنے آپ کو جزیرے پر چھوڑتے چھوڑتے ہم ایک ایسے ساحلی کمپونگ یعنی گاؤں میں جا نکلے جہاں تک پہنچنے سے پہلے ایک وسیع و طویل دلدل کے اوپر تنگ تختوں کے ایک جھولتے لرزتے "پل صراط" پر سے گزرنا پڑتا تھا۔ جن لوگوں نے مرشد کو دیکھا ہے وہ ان کی معصیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ مگر زندگی کو آگے پیچھے سے دیکھنے کے ولولے میں وہ اس "پل صراط" پر سے بھی گزر گئے!

یہاں ایک واقعہ یاد آگیا۔ انہیں دنوں مرشد کے دوست مشہور ادیب پروفیسر احمد علی ہندوستان سے چین جا رہے تھے۔ ان کا جہاز شب کے چند گھنٹوں کے لیے سنگاپور میں رک رہا تھا، مرشد ایک مدت سے ان کی راہ تک رہے تھے۔ اور ان کے چند گھنٹوں کے قیام کو پُر لطف بنانے کے لیے کوئی پورے تین شب و روز کی مصروفیت طے کر چھوڑی تھی، لیکن اتفاق دیکھئے کہ جس شام احمد علی وہاں پہنچے۔ مرشد کو سو کر جاگنے، جاگ کر اٹھنے، اٹھ کر تیار ہونے اور پھر دو تین ساغر برائے ملاقات میں اتنی دیر ہو گئی۔ کہ جب ہم لوگ جہاز پر پہنچے تو پروفیسر صاحب شہر کی گشت پر نکل چکے تھے۔ اب انہیں ڈھونڈنے کا مرحلہ شروع ہوا۔ جاوید نے کہا کہ اتنے بڑے اجنبی، پراسرار شہر میں

اندھا دھند تلاش سے کون مل سکتا ہے۔ لیکن مرشد بہت پُرامید تھے۔ فرمایا ——— کیوں نہیں ملے گا۔ مجھے معلوم ہے احمد علی کو کہاں ہونا چاہیے۔ میرے بھائی میں احمد علی کو جانتا ہوں" ——— تلاش شروع ہوئی تو احمد علی کو جہاں جہاں ہونا چاہیے تھا۔ ایک ایک مقام چھان مارا مگر وہ خدا معلوم کہاں غائب ہو گئے تھے۔ کوئی بارہ بجے کے قریب مرشد یہ کہہ کر کہ ذرا تازہ دم ہو کر ابھی پھر نکلتے ہیں۔ ایک چینی طرب خانے میں گھس گئے اور وہاں جام و مینا سے نہ معلوم کیا سرگوشیاں ہوئیں کہ خیالات کا دھارا احمد علی کو پا سکنے کی رجائیت کی طرف سے یکبارگی احمد علی کو نہ پا سکنے کی قنوطیت کی طرف مڑ گیا۔ بولے،

"مولانا یہ احمد علی تو ملتا دکھائی نہیں دیتا۔"

"کیوں؟" ——— ہم نے پوچھا۔

"مولانا چینیوں کے اس شہر میں احمد علی کا ملنا ناممکن ہے بات یہ ہے کہ سامنے کے رخ سے احمد علی بھی ساٹھ فیصد چینی معلوم ہوتے ہیں اور چینیوں کے انبوہ میں کسی چینی سے آپ خط و کتابت تو کر سکتے ہیں اسے شناخت نہیں کر سکتے ——— اب اس کو جہاز پر ہی پکڑیں گے۔

پھر وہیں بیٹھے بیٹھے مرشد نے جو احمد علی کی باتیں شروع کی ہیں کہ وہ کتنا پیارا آدمی ہے۔ کتنا نڈر ادیب ہے، کتنا قیمتی دوست ہے تو درمیان میں ہماری وقفہ بہ وقفہ یاد دہانیوں کے بعد طرب خانے سے اٹھ کر جب جہاز پر پہنچے تو جہاز ہانگ کانگ کو روانہ ہو چکا تھا بعد میں خط و کتابت سے معلوم ہوا کہ پروفیسر صاحب نے بھی اس شب اپنے آپ کو سنگاپور پر چھوڑ رکھا تھا۔

مرشد کھانے سے زیادہ پینے کے قائل تھے، تاہم ادب کی طرح کھانے کا بھی بڑا ہی کلاسیکی مذاق رکھتے تھے۔ ذائقہ تو بعد کی بات تھی۔ کھانے کی صورت بُری ہوتی

تو اس پر بھڑک اٹھتے۔ طبیعت منغض ہو جاتی۔ اشتہا مر جاتی۔ کھانے کے بجائے کھانا نہ کھانے کے حق میں تقریر کرتے۔ نوابانِ اودھ، سلاطینِ کشمیر اور قطب شاہی علی قلی خانوں کے مطبخوں، دسترخوانوں کے متعلق وہ جو وسیع ذاتی معلومات رکھتے تھے۔ ان معلومات نے مرشد کو اس ضمن میں کچھ اور بھی مشکل پسند بنا دیا تھا۔ ذائقے اور تنوع کے لحاظ سے کشمیری کھانے کو کھانوں کا بادشاہ مانتے۔ شب دیگ، گوشتابہ، بکھوانہ، آفتابہ وغیرہ کشمیری کھانوں کی ایک طویل فہرست تھی جو ہمیں ہر کھانے پر سننا پڑتی۔ بارہا مرشد نے شب دیگ خود اپنے ہاتھ سے دم کرنے کا پروگرام بنایا لیکن دیگ میسر آ سکی نہ شب۔ ایک مرتبہ ایک چینی لکھ پتی کی دعوت پر جب کوئی پچاس کورسوں کے ڈنر سے سابقہ پڑا۔ جس میں چینی باورچیوں نے چڑیا کی ایک چونچ میں ترش، نمکین، شیریں مچھلی تل کر سامنے رکھ دی تھی تو مرشد چینیوں کی عظمت کے بھی قائل ہو گئے تھے مگر قیادت کا جھنڈا پھر بھی کشمیر ہی میں لہراتا رہا۔

دو سال کے بعد مرشد ۸ فروری ۱۹۴۷ء کو ہم سے رخصت ہوئے۔ احباب کا ایک ہجوم الوداع کہنے کو ساحل پر موجود تھا جس میں فوجی افسر، سردار، سپاہی سبھی شامل تھے۔ مقامی ملاقاتیوں کا بھی ایک جمِ غفیر پہنچا ہوا تھا۔ ملائی معززین، عرب سوداگر، چینی آرٹسٹ اور ہیپی ورلڈ اور گرین ورلڈ کے خدمت گار ایک اجنبی کو رخصت کر رہے تھے۔ ان میں بہت تھوڑے تھے جو ادیب چراغ حسن حسرت کی عظمت سے واقف تھے۔ ان لوگوں کو انسان چراغ حسن حسرت کی محبت جزیرے کے کونے کونے سے کھینچ لائی تھی۔ ہم سے ہمارا مرشد جدا ہو رہا تھا۔ سپاہی ایک ایسے افسر کو رخصت کر رہے تھے جو افسروں کی نوع ہی سے مختلف تھا۔ مقامی احباب اس شخص کو الوداع کر رہے تھے جس سے مل کر وہ ایشیا کے ایک عظیم ملک کی روح میں جھانک سکتے تھے۔ ہیپی ورلڈ کے خدمت گار اس محسن سے محروم ہو رہے تھے جو چائے پیئے بغیر بھی بڑی باقاعدگی، بڑی فیاضی سے ان کو ٹپ دیتا تھا۔ اور جب عظیم ڈیور شاٹر

لنگر اٹھا کر آبنائے ملاکا کے کھلے دہانے کی طرف رینگنے لگا، تو ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے زندگی کے وہ دو سال ہماری پوری زندگی پر پھیل گئے ہوں۔ جذبات کے ایک مشترکہ جھٹکے سے ہر دل بوجھل، ہر آنکھ نمناک ہو گئی مگر جو شخص بچوں کی طرح بلبلا کر رو پڑا۔ وہ مرشد کا اردلی عنایت اللہ تھا۔ جو مرشد کو بچوں کی طرح پالتا رہا تھا۔

وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ

لاہور کا قطبؒ

مولانا صلاح الدین مرحوم اس دور کی ادبی شخصیتوں میں ایک الگ روش رکھتے تھے وہ ایک مینار نور تھے۔ مسافتیں جس کے حوالے سے ناپی جاتی ہیں، اور تہذیب جس کی روشنی میں راستہ ڈھونڈتی ہے۔ اردو ادب کی تاریخ، اپنے اس محسن اور صاحبِ طرز ادیب کو ہمیشہ یاد رکھے گی۔

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت

مولانا کی ذات میں محبوبیت و دل نوازی کے بہت سے اوصاف جمع ہو گئے تھے۔ ایک خوبی ان کی وسیع انسانی ہمدردی تھی۔ شہد سے زیادہ میٹھے۔ پھول سے زیادہ نرم، ہمہ شائستگی، یکسر خلق۔ آدمی ان کے سامنے بیٹھ کر اپنے آپ کو انسانی عظمت کے حضور بیٹھا ہوا محسوس کرتا۔ وہ جتنے بڑے ادیب تھے، اس سے زیادہ بڑے انسان تھے۔ مسرتوں کا سرچشمہ، محبتوں کا لنگر۔ مولانا کی موت کا زخم ابھی بہت تازہ ہے۔ ان کے لاتعداد مریدوں کی طرح، اس صدمے کی براہِ راست ضرب میرے دل پر بھی پڑی ہے۔ ابھی اس روداد کو میرے آنسو بھی بیان نہیں کر سکتے۔ میرے الفاظ کیا بیان کریں گے ——— ! ستاروں کا میلہ میرے سامنے سجا ہوا ہے، حیران ہوں، کس ستارے کو سرعنوان بناؤں؟

ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

دوسری جنگِ عظیم، اتحادیوں کے حق میں، لڑائی کا پانسا "العالمین" کی لڑائی سے پلٹا تھا۔ مولانا صلاح الدین احمد کا "ادبی دنیا" میری ادبی زندگی کا "العالمین" تھا۔ واضح شعور کے ساتھ میری شاعری کی عمر چار، پانچ برس ہو چکی تھی۔ میری نظمیں اِدھر اُدھر چھپ بھی رہی تھیں۔ مگر سب سے زیادہ خوشی مجھے اس دن ہوئی جب میں نے اپنی پہلی نظم "ادبی دنیا" میں دیکھی۔ اس دن کو، میں اپنے تاب دار ترین دنوں میں سمجھتا ہوں جیسے چوتھی جماعت میں وظیفے کا امتحان دینا ـــــ میٹرک کے امتحان میں دوسری کوشش میں کامیاب ہونا ـــــ "ادبی دنیا" ـــــ پوری ادبی دنیا کا جگمگاتا ہوا سورج تھا۔ اس میں جگہ پانا، ادبی دنیا میں جگہ پانا تھا، جو شاعر "ادبی دنیا" میں چھپتے وہ مجھے کسی اجنبی آسمان کے ستارے معلوم ہوتے۔ میں اسلامیہ کالج میں پڑھتا تھا۔ "ریواز ہوسٹل" کی چار دیواری میں میری شاعری کا خاصا چرچا تھا۔ ایک روز ہمت کر کے اپنی ایک نظم لکھ کر مولانا کے نام ڈاک میں ڈال دی۔ دل میں ڈر رہا تھا کہ ہمارا "نامہ بر" یقیناً مارا جائے گا۔ اگر جواب آیا تو عبدالکریم کے جوتوں کی طرح نظم ہی واپس آئے گی۔ چند روز بعد، جب مولانا کا مکتوب ملا تو یقین نہ آتا تھا کہ واقعی انہیں کا خط ہوگا۔ اس میں تو بڑے ہی کھلے دل سے، موتیوں کے سے لفظوں میں، مجھے شاباش دی تھی اور محنت کی ہدایت فرمائی تھی۔ پھر اگلے مہینے جب "ادبی دنیا" میں نظم چھپ گئی تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے ع

دونوں جہاں ہوں آج مرے اختیار میں

مولانا کے اس خط کو میں اپنی ادبی زندگی کی بنیاد سمجھتا ہوں۔ ادب و شعر کے لیے امنگ و اعتماد کی پہلی قندیل، میری ذات میں، اسی خط سے روشنی ہوئی۔ اس لمحے کی بے پایاں مسرت کا احساس آج بھی ایک نہری لکیر کی مانند، میرے محسوسات میں محفوظ ہے میں آج جو کچھ بھی ہوں، مولانا کا وہ خط ہوں، میں تو کاروانِ ادب و شعر کی گرد میں چلنے

والوں میں سے ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو ادب کی ایک پوری پود نے جس میں موجودہ دور کے کتنے ہی کج کلاہ شامل ہیں، کسی نہ کسی طرح اسی سرچشمۂ فیض سے رنگ و رس حاصل کیا ہے۔ مولانا صلاح الدین احمد اُردو ادب کے بادشاہ بھی تھے اور بادشاہ گر بھی۔

آتش آنست کہ در خرمنِ پروانہ زند

مجھے مولانا کے قریب رہنے کا موقع نہیں ملا۔ ہاں وقفہ بہ وقفہ ملاقاتوں کی سعادت حاصل رہی۔ جب کبھی لاہور جانے کا اتفاق ہوا، حتی الوسع ان کی خدمت میں حاضری کا ناغہ نہ ہونے دیا۔ ہم نیاز مندوں کے لیے شہر لاہور ان کی وجہ سے، مال روڈ، انارکلی وغیرہ سے ماورا، ایک جداگانہ معنویت رکھتا تھا ـــــ بالخصوص مولانا چراغ حسن حسرت کے انتقال کے بعد مولانا صلاح الدین احمد کے لیے دہرا پیار پیدا ہو گیا کہ یہ دونوں بزرگ آپس میں شباہت کی مشابہت رکھتے تھے۔ مولانا حسرت کے شاگرد میرے عزیز دوست کرنل مسعود احمد کے بقول مولانا صلاح الدین احمد سے مل کر ہمیں ایک "ٹکٹ" میں دو مزے مل جاتے ہیں۔ "وہی متبسم چہرہ، بھاری بھاری مونچھیں، قد کاٹھ۔ نرم و شیریں سلجھی سلجھی گفتگو۔

مولانا سے ملاقات "ادبی دنیا" کے دفتر میں ہوتی۔ لاہور میں کوئی دوسرا اپنے ٹھکانے پر ملے یا نہ ملے مولانا ضرور مل جاتے۔ وہ ان معنوں میں لاہور کے قطب تھے۔ میں جب کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کوئی نہ کوئی دوست (عموماً مجتبیٰ مسعود احمد یا کیپٹن انعام قاضی) ضرور ساتھ ہوتے۔ آپ ہمیشہ کشادہ خاطری سے ملتے، حالانکہ ہم بغیر اطلاع کے جا دھمکتے کام کاج چھوڑ کر ہمہ تن توجہ و شفقت بن جاتے۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ مولانا کرسی پر بیٹھے ہیں۔ سامنے لمبا چوڑا میز جس پر کاغذ ہی کاغذ، کتابیں ہی کتابیں، انبار اور مینار، جن کی اوٹ میں دفتر کا عملہ، منشی متصدی چھپ جاتے، ایک کونے میں ان کی چھڑی کھڑی ہوتی۔ پاس ہی کہیں ان کا مشہور و معروف "سولہ ہیٹ" جس سے الگ کر کے مولانا کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان کا ٹیلی فون عملاً دوسروں کی سہولت کے لئے وقف دیکھا۔ اہلِ علم اور اہلِ قلم

کا مرجع تو وہ تھے ہی۔ ہم نے ایک مرتبہ ہال نظمگری کا ایک اسکاؤٹ دستہ بھی دیکھا جس کے بیچ میں آپ

نشستہ اَم کہ نسیمے کند شکار مرا

کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی رہتی۔ آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ معروفیت کے اس حصار سے نجانے اپنے غم کاموں کے لیے کوئی ساعت کس وقت ملتی تھی؟

آخر آخر میں، اس معروفیت کے ہاتھوں مجبور ہو کر، احباب کے خطوط کے جواب تار سے دیتے۔ جو خرچ میں اضافے کی ایک نئی صورت تھی۔ مولانا کی زندگی میں نظم وضبط کا تسلسل ہمیشہ قائم رہا۔ عادات مقرر، معمولات کے پابند، گھنٹوں بے تکان کام کرتے۔ قلم پر ایسی حاکمانہ قدرت کہ فرصت کے ذرا ذرا سے شگافوں میں بہت کچھ لکھ لیتے اور جو کچھ لکھتے گویا موتی پروتے جاتے۔ دید و دانش کے موتی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ معروفیت کے اس سیلِ رواں میں ان کی کشادہ و بامروت پیشانی پر ناگواری کا کوئی ہلکا سا تاگا بھی نہ دکھائی دیتا۔ ان کے پاس بیٹھنے والا کچھ لے کر ہی اٹھتا۔

میں نے انہیں کسی کی برائی کرتے کبھی نہیں سنا۔ وہ اپنی جگہ چٹان ضرور تھے مگر کسی کو فرد تر نہ سمجھتے۔ ان کا کوئی حلقہ نہ تھا۔ وہ سب کے تھے۔ اپنے ادبی نظریات کے بارے میں ان کے ذہن میں کوئی دھند نہ تھی۔ مگر اپنے ادبی عقائد کو وہ سماجی تعلقات پر قطعاً اثر انداز نہ ہونے دیتے وہ کسی سمن زار ماوراء النہر کے باسی نہ تھے۔ زندگی کی کش مکش سے کترا کر گزرنا بھی ان کا شیوہ نہ رہا ہاں ان کی نگاہ ہمیشہ روشنی کی جویا رہتی۔ جس کا تذکرہ آگیا اس کی خوبیوں کا ذکر کیا۔ حتیٰ کہ ادبی و فکری مباحث میں، اختلاف رائے کے باعث، جن لوگوں نے ان کی ذات پر ناروا حملے کئے، ان کی طرف سے بھی مولانا کے دل میں کدورت کا سایہ رہتے نہ پایا۔ نظیری نے ایسے انسانوں کے بارے میں کہا ہے

دوستاں از بدگمانی، وحشت از من می کنند ورنہ من بر دشمن خود مہرباں گردیدہ ام

میرے دوست کرنل مسعود احمد، پہلی مرتبہ غالباً ۱۹۴۸ء میں میرے ساتھ، مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں کرنل مسعود کو تقریباً گھسیٹ کر ہی لے گیا تھا کیونکہ ان کی رائے میں عظیم فنکاروں کو، ان کے آرٹ ہی میں ملنا موزوں و مامون ہوتا ہے۔ مگر مولانا سے مل کر وہ بے حد محظوظ ہوئے کہ وہ زندگی آموز ہی نہ تھے۔ زندگی آمیز بھی تھے۔ مولانا تب سے مسعود کو "ادبی دنیا" کا اعزازی پرچہ برابر بھیج رہے تھے۔ مسعود اکثر کہا کرتے تھے، وی پی تو مولانا بھیجتے نہیں کہ چھڑالوں۔ سوچتا ہوں خود ہی کچھ رقم بھیج دوں۔ مگر میں جانتا تھا کہ مسعود یہ نہ کر سکیں گے کہ جب ان کے پاس وقت ہوتا ہے تو کام یاد نہیں رہتا اور جب کام یاد ہوتا ہے تو وقت نہیں ہوتا۔ لیکن ایک مرتبہ جب ہم دونوں لاہور چلے گئے اور مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے تو مسعود کو یہ بات یاد آگئی۔ اتفاق سے مولانا اس وقت تنہا بھی تھے۔ مسعود نے بہت جھجکتے جھجکتے کہا۔

"مولانا دیکھئے نا میں کتنی مدت سے ادبی دنیا مفت ڈکار رہا ہوں۔ مولانا حد یہ ہے کہ رجسٹری کے پیسے بھی آپ اپنی گرہ سے بھر رہے ہیں ——— مولانا میں اپنی کاہلی پر سخت نادم ہوں" ——— اور اتنا کہہ کر، مسعود نے پانچ سو روپے کا چیک، چپکے سے کھسکا کر جیسے رشوت دی جاتی ہے، مولانا کے سامنے رکھی ہوئی کتاب کے نیچے رکھ دیا۔ مگر مولانا چیک مسعود کو لوٹاتے ہوئے بولے۔

"مسعود صاحب! بعض اصحاب کو میں "ادبی دنیا" خود بھیجنا چاہتا ہوں ——— اپنی خوشی کے لیے ——— پھر قیمت کیسی؟"

مسعود نے کچھ اور اصرار کیا تو مولانا نے پوچھا!

"حال میں آپ کو کون سا شمارہ ملا تھا؟"

"جولائی کا"

اس پر مولانا نے رسالے کے ایک انبار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ——
"مسعود صاحب، جولائی کے شمارے کے چندے والے پرچے ابھی تک وہ رکھے پڑے ہیں۔"

مظفر آباد (آزاد کشمیر) میں مولانا چراغ حسن حسرت کی برسی پر ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا مولانا کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ مولانا کا لاہور نکلنا سخت دشوار تھا۔ مگر بکمال مہربانی ہماری دعوت قبول کر لی۔ راولپنڈی تک ہوائی جہاز سے آئے لیکن آگے موٹر پر پہاڑی سفر میں طبیعت خراب ہوگئی۔ مظفر آباد پہنچے تو اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں مشتاقانِ دید کا ہجوم ٹوٹ پڑا۔ ہم ملاقاتیوں کو روکنا چاہتے تو مولانا الٹا ہمیں روک دیتے کہ صاحبو کیا کرتے ہو۔ میں خود سے ملنا چاہتا ہوں۔ پھر جلسے میں مقالہ پڑھا آخر تک بیٹھے رہے۔ مقالات سے ملا ہوا مشاعرہ بھی مقطعے تک سنا، حالانکہ طبیعت ناساز تھی اور مشاعروں میں ان کے لیے بیٹھنا کچھ آسان نہ تھا۔

اگلے دن ہم نے انہیں راولپنڈی میں روکنا چاہا مگر نہ رکے۔ دو چار گھنٹے آرام کر کے شام کے ہوائی جہاز سے لاہور روانہ ہو گئے۔ لاہور میں، جلد سے جلد واپس پہنچنے کی مجبوریاں کچھ اس نوعیت کی تھیں۔ "سرگودھا سے ڈاکٹر وزیر آغا آئے ہوں گے۔"

"ادبی دنیا" کی کاپیاں.....

"کراچی سے اے ڈی اظہر، اردو کے بارے میں تبادلۂ خیالات کرنے آ رہے ہیں۔"

"رات کو منارڈ ہال میں انجمن....."

ہم نے معذرت کی کہ مولانا اس سفر سے آپ کو بہت زحمت ہوئی۔ فرمایا —— "میں تو بہت خوش ہوں کہ اس بہانے احباب سے ملاقات ہوگئی۔ ایک نیا علاقہ دیکھ لیا۔ کچھ تھوڑا سا قرض اپنے دوست مولانا حسرت کا بھی چکا دیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ سڑک کا سفر اور بالخصوص پہاڑی علاقے کا سفر ان پر ہمیشہ گراں گزرتا ہے۔ پھر وہ لاہور سے چلے بھی علیل سے تھے۔ لیکن ہم سے انہوں نے اشارتاً بھی تو اس کا ذکر کرنا پسند نہیں کیا —— اسی مروت و دل نوازی کا دوسرا نام صلاح الدین احمد تھا۔

میں یہاں تک لکھ چکا تھا کہ دفتر میں میرے نوجوان رفیق کار مسٹر بشیر تبسم ملنے آ گئے۔ وہ اردو کے ایم اے ہیں۔ اور اپنی اردو دوستی کی لگن میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ مجھے کچھ لکھتے دیکھ کر پوچھا۔ آپ کیا کر رہے ہیں؟ میں نے عرض کیا: مولانا صلاح الدین احمد مرحوم کی صحبت میں گزری ہوئی کچھ یادوں کو واپس بلا رہا ہوں۔ اس پر تبسم نے اپنا ایک واقعہ سنایا۔

"میں ایم اے اردو سال اوّل میں پڑھتا تھا اور اردو کے ہر طالب علم کی طرح مولانا سے ملنے کا انتہائی متمنی تھا۔ منٹگمری کالج سے میرے اردو کے استاد ڈاکٹر الف۔ ر نسیم جب کبھی لاہور آتے تو مولانا کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتے۔ ایک مرتبہ وہ مجھے بھی اپنے ہمراہ مولانا کی خدمت میں لے گئے۔ اور میرا تعارف کراتے ہوئے کہا یہ میرے شاگرد تھے۔ اب ڈاکٹر سید عبداللہ کے شاگرد ہیں۔ یہ سن کر مولانا نے فرمایا۔ —— پھر تو یہ میرے بھی عزیز ترین ہوئے —— میں نے عرض کیا —— مولانا میں "ادبی دنیا" بڑے شوق سے پڑھتا ہوں —— یہ سن کر مولانا خوش ہوئے —— بولے —— اچھا! مگر صاحبزادے طالب علمی کے زمانے میں بعض اوقات آدمی اپنے شوق کی تمام کتابیں خرید نہیں سکتا "ادبی دنیا" آپ یہاں سے لے جایا کریں۔"

آخری دفعہ کی ملاقات میں بھی مسعود یا شاید (اردو کے منفرد مزاح گو شاعر) نذیر احمد شیخ (مرحوم) میرے ساتھ تھے۔ مولانا حسب معمول کچھ لکھ رہے تھے۔ شاید ریڈیو کے لیے کوئی تقریر زیر قلم تھی۔ حسب معمول، دیکھتے ہی قلم رکھ دیا۔ تپاک سے ملے۔ ہم نے کام میں مخل ہونے پر معذرت چاہی تو ہنس کر بولے —— بہت اچھا ہوا کہ آپ آ گئے ورنہ میرے دل پر بوجھ سا رہتا۔"

"بوجھ کیسا؟" ہم نے پوچھا

"بات یہ ہے" مولانا بولے "میں ہر روز بس اتنا ہی کام کرتا ہوں، جتنا کہ

میرے نان ونفقہ کے لیئے ازبس ضروری ہو۔ آج دن بھر کی مزدوری ہو چکی تھی یہ مضمون لالے کے کھاتے میں جا رہا تھا"۔ پھر دیر تک اسی ہمدردی و شگفتگی کے ساتھ جوان کی سرشت کا خاصہ تھا، باتیں کرتے رہے۔ ان کی صحت بظاہر خاصی تھی۔ البتہ بیگم کے انتقال سے چہرے پر اضمحلال و آزردگی کے آثار پیدا تھے۔ باتوں باتوں میں دوپہر کے کھانے کا وقت آگیا تو اصرار کر کے ہمیں، قریب ہی لاہور کے ایک اعلیٰ ریستوران میں لے گئے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کو بھی فون کر کے بلا لیا۔ کہنے لگے میں دوپہر کا کھانا دفتر کے آس پاس کسی ہوٹل میں ہی کھا لیتا ہوں۔ کون گھر جائے؟ اور اب تو گھر میں بیوی بھی نہیں ہیں، بچیوں کو کیا زحمت دوں۔ یہ صرف بچیوں ہی کی بات نہ تھی۔ یہ مولانا کی سیرت و اصول کی بات تھی۔ وہ بڑے سے بڑے دکھ کو اندر ہی اندر پی جاتے تھے مگر دوسروں کو آزردہ کرنا یا کسی کو خفیف سے خفیف زحمت دینا ہرگز پسند نہ کرتے تھے۔

ریستوران سے اٹھ کر مولانا ——— "ایوانِ ادبی دنیا" کے زینوں سے اوپر چڑھ گئے۔ جہاں سے پھر اترتے ہوئے میں نے ان کو کبھی نہ دیکھا۔ اور میری ارادت سے پوچھیے تو مولانا اب بھی وہیں اپنی کرسی پر بیٹھے ہیں ..... وہی میز، وہی کتابوں کے ڈھیر، وہی مسکراتا ہوا چہرہ ..... کونے میں چھڑی ..... اور کتابوں کے مینار پر مولانا کا سولہ ہیٹ۔

گر آمی از درِ پیرِ مغاں سر بر نمی گیرد
دل اینجا، دلبر اینجا، مدعا اینجا، اُمید اینجا

——— (مولانا کے انتقال پر لکھا گیا)

چیونٹی اور پہاڑ

ابوالاثر حضرت حفیظ جالندھری کے چوتھے مجموعہ کلام "چراغِ سحر" کی اشاعت، تاریخ ادب کا ایک اہم واقعہ ہے۔ اوّل تو اس لیے بھی کہ اب ان کے کسی نئے مجموعے کی توقع کچھ اٹھتی جا رہی تھی توقع اس لیے نہیں اٹھ رہی تھی کہ خدانخواستہ حفیظ صاحب بیٹھ گئے تھے۔ وہ تو اس وقت پچھتر برس کی عمر میں بھی ماشاءاللہ جوالوں والا "تہیہ طوفان" رکھتے ہیں۔ ان کا قلم جولانی سے چل رہا ہے نظم میں بھی اور نثر میں بھی؛ چنانچہ "چراغِ سحر" کے ساتھ ساتھ چیونٹیوں کی زندگی کے بارے میں نثر کی ایک کتاب حال ہی میں منظرِ عام پر آئی ہے۔ نام ہے "شاہنامہ" کے اسلوب پر "چیونٹی نامہ" لوگوں کو "چیونٹی نامے" پر حیرت ہوئی ہے۔ مجھے "چراغِ سحر" کی اشاعت پر حیرت ہوئی ہے کہ ایک مدت سے حفیظ صاحب کی طبیعت جتنی شعر کہنے کی طرف راغب ہوئی ہے۔ اتنی شعر کی اشاعت پر آمادہ نہیں ہوتی۔ چیونٹی نامے پر حیرت اس لیے نہ ہوئی کہ اس کا مسودہ اتنی مدت سے پڑا تھا کہ اگر اب چھاپہ خانے میں نہ جاتا۔ تو اس کو چیونٹیاں خود کھا جاتیں۔ مجھے حفیظ صاحب کی خدمت میں ۱۹۳۹ء سے نیاز حاصل ہے۔ کئی برس ایک محکمے میں ان کے نیچے کام کرنے اور ایک ہی مکان میں اوپر قیام کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اور ان کی شفقت میری متاعِ فخر ہے۔ اس طویل مدت میں ہم نے یہ بھی دیکھا کہ حفیظ صاحب کے جتنے گہرے مراسم چیونٹیوں سے ہیں اتنے انسانوں سے بھی نہ ہوں گے۔ وجہ یہ کہ چیونٹی ان کے بقول، انسانوں سے کہیں زیادہ محنتی،

مخلص اور منظم و منتظم مخلوق ہے۔ شاعر حفیظ "پبلک" پراپرٹی ہے میں ایک عرصے سے روزمرہ کے حفیظ کے بارے میں کچھ لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ مگر وہ جو انہوں نے کہا ہے کہ:۔

؎ ارادے باندھتا ہوں سوچتا ہوں توڑ دیتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ایسا نہ ہو جائے

سو میں بھی ارادے باندھتا اور توڑتا ہی رہ گیا اور حفیظ صاحب اتنے میں شخص سے شخصیت بن گئے۔ لیجیے ان کا ایک شعر اور یاد آگیا:۔

حفیظ اپنی ترقی شعر میں یہ ہے کہ اس فن کو
بہت آساں سمجھتے تھے بڑا مشکل سمجھتے ہیں

یہ شعر و شاعری کے علاوہ ان کی شخصیت پر بھی حاوی ہے۔ چنانچہ سوائے شاعری کے ان کی کوئی چیز آسان نہیں رہ گئی۔ بازار میں آپ کبھی ان کے ہمراہ سودا سلف خرید کر دیکھئے ایک روپے کی چیز پر پانچ روپے کی فاعلاتن فاعلات کرتے ہیں۔ سبزی والے کے کھارے سے ٹماٹر اس طرح سے چھانٹتے ہیں جیسے انتخاب کلام واغ کر رہے ہیں۔ گوشت کی عمدگی اور تازگی کے مسئلے پر قصابوں سے اس شد و مد کی بحث کرتے ہیں کہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اب تک کسی قصاب کے ہاتھوں قتل نہیں ہو چکے۔ گوشت ترکاری سے یاد آیا کہ شاعری کے علاوہ پیدل چلنا اور ہانڈی ریندھنا، ان کے محبوب مشغلے ہیں۔ نہ وہ دوسروں (بالخصوص دوستوں) کا شعر آسانی سے پسند کرتے ہیں نہ دوسروں کی ہانڈی کو، گھر میں اپنا کمرہ اور اپنی ہانڈی الگ رکھتے ہیں۔ ان کا کمرہ دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ ؎

آگ ہے، ہانڈی ہے، چولھا ہے دھواں ہے زندگی

صوفے کرسیاں، میز ملاقاتیوں کے لیے رکھے ہیں، ملاقاتی نہ ہوں، تو ان پر کتابیں پڑی رہتی ہیں۔ خود فرش پر نشست رکھتے ہیں۔ سونا بھی فرش پر پسند کرتے ہیں۔ تین طرف کتابیں، بیاضیں، خطوط، کاغذات، چوتھی طرف چولہا، کھانے پینے کے برتن، چٹنی، اچار، چولہا

معجون، مربے وغیرہ، ایک طرف ذہن کی ورکشاپ پر غزل ابل رہی ہے۔ دوسری طرف چولھے پر قیمہ۔ ادھر مصرعۂ تر ادھر لقمۂ تر۔ ساتھ ساتھ دوستوں سے گلچھپ۔

حفیظ صاحب، ابوالاثر اپنے "پتھر اور دھات" ہی کے زمانے میں بن گئے تھے۔ بعد میں "خان بہادر احسان الملک بہادر" ہوئے۔ پھر انگریزی میں ترجمہ ہو کر ڈائرکٹر جنرل تک پہنچے۔ مگر طبعاً وہ ہاتھی، گھوڑے کے آدمی کبھی نہیں رہے۔ ہمیشہ چیونٹی کے آدمی رہے.... پیدل آدمی۔

ان کا پکایا ہوا سالن ضرور کھانا چاہیے۔ مگر ان کے ساتھ پیدل گشت کی سفارش میں نہیں کر سکتا۔ ناپ تول کے اعشاری نظام کے مطابق راولپنڈی میں ان کی روزانہ پیدل گشت کو سیدھا کر کے ناپا جائے تو شام کے وقت انہیں گوجر خان میں ہونا چاہیے جو دوست ان کے ساتھ جتنا پیدل چل سکے، اتنا ہی ان کے دل کے قریب۔ جس طرح ان کا خانساماں ہانڈی کے سوا باقی سب کام کرتا ہے اسی طرح ان کا ڈرائیور کبھی کبھار موٹر چلاتا ہے کوئی دوست موجود نہ ہو تو حفیظ صاحب ڈرائیور کو لے کر پیدل گشت پر نکل جاتے ہیں۔ وہ بیک وقت دو حیثیتوں سے چلتے ہیں۔ ایک وہ جیسے کوئی تھانیدار اپنے حلقے کا دورہ کر رہا ہو کہ معاشرے میں کوئی بدنظمی تو سر نہیں اٹھا رہی۔ اور دوسری حیثیت وہ جیسے کوئی شاعر، کوئی فنکار، علم و ادب کی پیاس بجھانے کے لیے زندگی کے مظاہر کے سامنے جھولی پھیلائے گھوم رہا ہو۔ چلتے میں وہ مسافت کم زندگی زیادہ طے کرتے ہیں۔ کوئی منظر ایسا نہیں جس میں ان کے لیے کوئی سبق لطیفہ، تماشا وغیرہ موجود نہ ہو۔ وہ تنہا بھی چلیں، تو زندگی کا جلوس ان کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ راہ چلتے ہوئے کسی دکان پر کوئی سائن بورڈ لکھا نظر پڑ جاتا تو اس کو پڑھے، بلکہ گائے بغیر قدم نہیں اٹھاتے۔ سائن بورڈوں کی انگریزی عبارت ان کے مشہور و مقبول ترنم میں سننے کے لائق ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک ہر عبارت میں آہنگ مضمر ہوتا ہے۔ بعض سائن بورڈوں کی عبارت کی تنہائی دور کرنے کی خاطر دوسرا مصرعہ یا ٹکڑا وہیں فی البدیہہ گنگنا دیتے ہیں۔ مثلاً:۔

بُدھو کا آرا　　روشن ستارا

پیدل چلتے ہوئے ان کی سب سے زیادہ توجہ چیونٹیوں کی طرف رہتی تھی۔ ماڈل ٹاؤن میں ان کی کوٹھی کے بیرونی باغ میں چیونٹیوں نے اپنا بہت وسیع ہیڈ کوارٹر قائم کر رکھا ہے۔ آپ صبح و شام دو وقت اس پڑاؤ کو دیکھنے جاتے ہیں کہ ان کے ٹریفک کے نظام میں کوئی خلل تو نہیں آگیا؟ چیونٹیوں کے بارے میں معلومات کا دانہ مل جاتا ہے، اسے اٹھا کر اپنے کاغذات میں محفوظ کر لیتے ہیں۔ یہ کتاب انہوں نے چیونٹی چیونٹی کر کے جمع کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابھی اتنی بڑی ایک اور کتاب کی چیونٹیاں ان کے پاس فالتو پڑی ہیں۔ راہ چلتے ہوئے چیونٹیوں کا کوئی جلوس آتا جاتا ملے تو ٹھٹک کر ماجرے کی تہہ تک پہنچ کر رہیں گے کہ کیڑیوں کا جنازہ جا رہا ہے، برات ہے یا فرقہ وارانہ فساد؟ ویسے ان کے انداز معاشرت اور اسلوبِ خانہ داری میں حفیظ صاحب کے ورک کا یہ عالم ہے کہ کیڑیوں کی قطار دیکھ کر بتا دیتے ہیں کہ آیا راشن کی قطار ہے یا ملکہ کی سواری ـــــ کسی موٹے تازے پھٹے ہوئے مکوڑے کو غضب ناک نظروں سے دیکھتے ہوئے ارشاد فرمائیں گے: "اس حرام خور کو دیکھتے ہو؟ یہ سود خور مہاجن ہے غنڈوں کا سرغنہ، غریب چیونٹیوں کا استحصال کر رہا ہے۔" اور غریب چیونٹیوں کو حفیظ صاحب مہر و شفقت سے چھلکتی ہوئی۔ کچھ ایسی احسان مند نگاہوں سے دیکھتے ہیں کہ ایسی نگاہوں کے لیے ان کے دوست تمنا کرتے ہیں۔ "چیونٹی نامے" کو نثر میں لکھا دیکھ کر یک گونہ اطمینان ہوا۔ ورنہ مجھے تو ڈر تھا کہ وہ چیونٹیوں سے اپنے گھر سے لگاؤ، ان کے عادات و خصال کے بارے میں وسیع معلومات اور سب سے زیادہ اپنی قادر الکلامی کے بہاؤ میں چیونٹیوں کو بھی منظوم کر دیں گے جو ان کے لئے نسبتاً آسان بھی ہوتا۔ مگر انہوں نے یہ کتاب نثر میں لکھی ہے اور حق یہ ہے کہ نثر کے میدان میں بھی اپنا جھنڈا گاڑ دیا ہے۔ یہ کتاب لکھ کر حفیظ صاحب نے زبان اور انسان دونوں کی خدمت کی ہے۔ چیونٹیوں کے معاشرے کی

تصویر، ایسے دلکش اور مؤثر انداز میں کھینچی ہے کہ اس میں انسانوں کے لیے ایسی بہت سی عبرتیں سمٹ آئی ہیں کہ بے اختیار چیونٹی کے نقشِ قدم پہ چلنے کو جی چاہتا ہے۔

"چراغِ سحر" کی اشاعت پر میں اپنے جذبۂ حیرت کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بے حد خوش گوار حیرت ہے۔ میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ قیامِ پاکستان کے بعد ایک عرصے تک ہمیں قیام و خرام کا ایسا موقع حاصل رہا ہے کہ ان کے شعر کی "پہلی اذان" ہمارے ہی کانوں میں پڑتی تھی۔ گزشتہ ربع صدی میں ہم نے حفیظ صاحب کو اپنے کسی شعر پر پورے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے نہیں دیکھا؛ حالانکہ شعر وہ اس ریاضت جانکاہی سے کہتے ہیں کہ شاعر اور شعر دونوں پر ترس آتا ہے۔ شعر ان پر موسلا دھار نہیں برستا، بوند بوند ٹپکتا ہے۔ پہلے تو وہ خیال اور مضمون ہی کو اپنے ذہن کی "چاٹی" میں رکھ کر مدتوں اسے دودھ کی طرح بلوتے رہتے ہیں۔ ایک شعر کہنے کی خاطر بیک وقت درجنوں نظائر کو زیرِ تفتیش رکھتے ہیں۔ اپنے مفہوم تک کئی رستوں سے ہو کر پہنچتے ہیں۔ ان کی رائے میں ہر خیال اپنے اظہار کے لئے الفاظ بھی اپنے ساتھ لاتا ہے۔ مگر شاعر کو یہ الفاظ ڈھونڈنے پڑتے ہیں ایک کٹھن اور طویل تعاقب کا عمل ہے۔ یہ تلاش کا کم و بیش ویسا ہی عمل ہے جس طرح کوئی شکاری جھاڑیوں میں چھپے ہوئے تیتر کو تلاش کرتا ہے۔ اس تلاش کے دوران بعض شکاریوں کی طرح بعض شاعر بھی راستے میں ہار تھک کر تیتر کی بجائے فاختہ مار لاتے ہیں لیجیے جذبہ تو الفاظ میں ڈھل گیا، مگر اب حفیظ صاحب نے شعر کے پیکر کو خاتم کاری کے عمل کی خاطر "خراد" پر چڑھا دیا تاکہ اس کے پیرہن میں کوئی سلوٹ اور چہرے پر کوئی مہاسہ باقی نہ رہے۔ شعر کے حسن و جمال کا کمال ان کے نزدیک یہ ہے کہ اس کا زیور، شعر کے اندر ہو کہ الفاظ اگر ہاتھ باندھ کر ان کے سامنے آ بھی جائیں، تو دفترِ روزگار کے امیدواروں کی مانند سو میں سے نوّے لفظوں کو اُلٹے پاؤں واپس جانا پڑتا ہے۔ وہ چٹانوں کے پھول اور پھولوں کے تلعے بنانے کے قائل نہیں ایک رنگ کے مضمون کو سرد

ایک ہی رنگ میں باندھتے ہیں۔ سو رنگ میں نہیں باندھتے اور اس قدر کم الفاظ میں باندھتے ہیں کہ بعض اوقات آدھا مضمون کھلا رہ جاتا ہے۔ ؎

سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے

شعر کو بہترین الفاظ کی بہترین ترتیب کہا جاتا ہے۔ حفیظ صاحب کے نزدیک الفاظ کی بہترین ترتیب کی پہچان یہ ہے کہ شعر کو سخت اللفظ میں بھی پڑھیں، تو وہ ٹھنک اٹھے۔ سو، اپنے لفظوں میں طاہرہ سید کے لہجے کی شیرینی بھرنے کے بعد جب حفیظ صاحب بالآخر (اور بادلِ ناخواستہ) اپنے شعر کو "خراد" سے اتارتے ہیں، تو وہ دراصل دس بارہ جڑواں شعروں کا عطر ہوتا ہے۔ آسان شعر کو جس مشکل سے حفیظ صاحب کہتے ہیں اس کی دوسری مثال اس خاکسار کے علم میں نہیں ہے۔ ان کا شعر بظاہر نہایت سادہ و سلیس، بن بلایا ہوا شعر معلوم ہوتا ہے۔ مگر جتنا غور کرو اتنی ہی پرتیں کھلتی جاتی ہیں۔

شعر، شاعر کی معنوی اولاد ہوتا ہے۔ حفیظ صاحب سچ مچ اُسے اپنے کلیجے کا ٹکڑا سمجھتے ہیں وہ اس کی نوک پلک فی الواقعہ اسی لگن اور ممتا سے سنوارتے جس طرح کوئی سگھڑ ماؤں اپنے بچے کو ہی سنوار کر، منہ دھو دُھلا کر، لبوری چُپڑ کر مدرسے بھیجتی ہے۔ آپ اس کا بستہ بھی خود باندھتے اور اس ہنرمندی سے باندھتے ہیں کہ نہ کوئی "الف" گرتا ہے نہ کوئی "ی" دبتی ہے۔ الفاظ کو وہ اس طرح ناپ ناپ کر اور گِن گِن کر رکھتے ہیں کہ پاؤ چھٹانک والے وزن میں شاید ان کے مصرعے ہم وزن ہی نکلیں۔ خوب سے خوب تر کی تلاش ان کے ہاں ہر لحظہ جاری رہتی ہے۔ وہ اپنے شعر کے کسی چوکھٹے کو قطعی نہیں سمجھتے۔ ہم نے انہیں ۱۹۷۲ء میں ۱۹۷۳ء کے اشعار سے دست و گریباں دیکھا ہے۔ ان کی پہلی کتاب کا دوسرا ایڈیشن ان کی دوسری کتاب کا پہلا ایڈیشن معلوم ہوتا ہے۔ ان کی زندگی کی طرح ان کے شعر کی بردہ مندی بھی ان کی بے پایاں محنت کا ثمرہ ہے۔ قدرت نے ان کو شاعر ہی پیدا کیا تھا لیکن اگر وہ فن پر اتنی عرق ریزی نہ کرتے تو پیدا ہو کر شاعری کا انگوٹھا ہی چوستے رہتے۔

حفیظ صاحب کی شاعری مشاہدات و محسوسات کا ایک وسیع اور رنگارنگ نگارخانہ ہے رواں صدی کی دوسری دہائی کے آغاز میں اردو شاعری نے جس حفیظ کی ارادت کی مندری اپنے کانوں میں ڈالی تھی، وہ مٹی کی خوشبوؤں، موسموں کے رنگ رس، جوانی کی دھڑکنوں، مکھڑوں کی چھب منظروں کی سحرکاری اور گیتوں کے نغمہ زاروں کا شاعر تھا۔ ان کی اچھوتی نظموں، بانکی غزلوں اور کنولدے گیتوں میں نغمگی کا جادو بھی تھا۔ اور زندگی کی دھوپ چھاؤں بھی، شکایات بندگانِ خدا بھی اور حکایتِ زُلف و رخِ بتاں بھی۔ پروفیسر احمد شاہ پطرس بخاری نے نغمہ زار کے دیباچے میں اسی شاعر کو "ساحر" کہا تھا۔ حفیظ کی ریاضتِ فن اب نصف صدی کا قصہ ہے۔ دو چار برس کی بات نہیں۔ اس طویل مدت میں ان کا فن مختلف رخوں سے وقفِ تابانی زمین و زماں رہا ہے مگر ان کے فکر و فن کے بنیادی محور حفیظ کے تین عشق ہیں۔ عشقِ رسولؐ، عشقِ دین اور عشقِ پاکستان۔ حفیظ صاحب اپنی نمایاں انفرادیت کے ساتھ اکبر، حالی اور اقبال کی لڑی کے شاعر ہیں۔

شاعری تشبیہات اور استعارات کا کاروبار بھی ہے۔ حفیظ صاحب کے لیے میں نے "پہاڑ" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ میں نے ان کی شاعری کے بارے میں جب بھی سوچا ہے، کسی وسیع کوہستان کا نقشہ ذہن میں کھلتا گیا ہے جس میں وادیاں بھی ہیں، چوٹیاں بھی، اور کھائیاں بھی، پھول اور چشمے بھی اور ننگی چٹانیں بھی۔ ترائی کے علاقے میں جس کو نغمہ زار کہنا چاہیے، ستاروں اور بہاروں اور گل رخوں کے جھرمٹ ہیں، بے آب و گیاہ پتھروں کے منطقوں کی صلابت و سنگینی جُلسا دینے والی ہے لیکن کچھ عجیب بات ہے کہ ان سنگین منطقوں کی عظمت و جبروت کا بھی یہ عالم ہے کہ اگرچہ:

نہ اس میں گھاس اگتی ہے اس میں پھول کھلتے ہیں
مگر اس سرزمیں سے آسماں بھی جھک کے ملتے ہیں

جغرافیہ کی رُو سے یہ پہاڑ کہیں بھی واقع ہو اس کی پگڈنڈیاں دوسری طرف جاکر کشمیر میں اترتی ہیں اور اس کے بڑے بڑے درّوں کے رُخ ارضِ حجاز کی طرف کھلتے۔ بعض چوٹیاں گاہے گاہے آتشیں لاوا بھی اگلتی ہیں۔ مجموعی طور پر اس سلسلۂ کوہستان کو "کوہِ ہندوکش" کہنا کچھ غلط نہ ہوگا۔

"چراغِ سحر" کی بیشتر نظمیں قیامِ پاکستان کے بعد کی تخلیقات ہیں اور کسی نہ کسی ملّی واقعے یا سانحے کی آنچ سے تپ کر نکلی ہیں۔ یہ ایک ایسے شاعر کا کلام ہے۔ جس کا مرنا جینا پاکستان سے وابستہ ہے۔

حفیظ صاحب نے بعض نظموں کے ساتھ کچھ وضاحتی اشارات بھی رقم فرمائے ہیں۔ بظاہر یہ رَمل میں رجز ملانے والی بات ہے، البتہ یہ بات ضرور ہے کہ ان اشارات سے ان کی ذہنی سمت کے علاوہ ان کی زندگی کا ایک سوانحی خاکہ بھی خود بخود سامنے آتا گیا ہے۔ حفیظ ہماری ان چند اہم شخصیتوں میں سے ہیں جو زندگی کے ایک پورے دور کی دھڑکن اور علامت بن جاتی ہے اور وقت کی لکھی ہوئی سرخیوں میں ان کا خون بھی شامل ہوتا ہے۔ ان سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ مگر ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حفیظ صاحب کا ایک شعر ہے ؎

اگر موج ہے بیچ دھارے چلا چل
وگرنہ کنارے کنارے چلا چل

وہ جس طرح ہاتھی گھوڑے کے آدمی نہیں رہے، اسی طرح کنارے کے آدمی بھی نہیں رہے وہ منجدھار کے آدمی ہیں ؎

لے چل ہاں منجدھارے میں لے چل ساحل ساحل کیا چلنا
تُو مری اتنی فکر نہ کر میں خوگر ہوں طوفانوں کا

میں عرض کر چکا کہ اس مجموعے کی بیشتر منظومات کا پہلا لمس ہمارے

حصے میں آتا رہا ہے۔ ان دنوں میں اور محبی کرنل مسعود احمد (جو آجکل روزنامہ مشرق میں احوالِ واقعی کے عنوان سے ایک بے حد شگفتہ کالم لکھتے ہیں) اور محبی عزیز ملک صاحب اور برادرم کپتان انعام الحق قاضی (مدیر روزنامہ بادِ شمال راولپنڈی) حفیظ صاحب کی خدمت میں تقریباً روزانہ حاضر ہوا کرتے تھے اور ان کی ہر تازہ نظم سن کر ہاتھ جوڑ کر عرض کرتے: "حفیظ صاحب قبلہ، آپ تو مٹھاس اور رس کے شاعر تھے آپ کے لہجے میں تلخی، جھنجلاہٹ اور قنوطیت کے سائے گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔ کرنل مسعود اپنی فوجی لغت میں کہا کرتے: جناب ابوالاثر شعر تو دور مار (LONG RANGE) توپ ہونا چاہیے یا پھر "پیراشوٹ" کی طرح چپکے چپکے قاری کے شعور میں اترنا چاہیے۔ مگر حضور کا شعر تو سنگین تھان کر دست بدست لڑائی کرتا ہے"۔

مجھے حفیظ صاحب، شعر و ادب کا نکمٹو مکوڑا سمجھتے ہوئے چنداں لائقِ خطاب نہ سمجھتے۔ ہاں، مسعود کو ہنس کر جواب دیتے "جان من کہ نیل جی! حرنیل جی! بعض مرحلوں میں اگلے مورچوں میں دست بدست لڑائی بھی تو ناگزیر ہو جاتی ہے" کبھی کبھی ان موقعوں پر اپنا یہ شعر بھی سنا دیا کرتے ؎

اس نئے دن کو ہوں میں رات سمجھنے والا
ہے کوئی آج مری بات سمجھنے والا

یہ آج سے کئی برس پہلے کی بات ہے۔ اس اثنا میں حفیظ صاحب کی بہت سی باتیں ہماری سمجھ میں آگئی ہیں، مگر نہ جانے کیوں ان کا یہ شعر بھی بار بار ذہن میں سر سرانے لگتا ہے۔ ؎

حفیظ اک طنز گفتار و شگفتہ کار شاعر تھا
نہ جانے میں کہاں اس ہمنوا کو چھوڑ آیا ہوں

مگر مجھے معلوم ہے کہ میں ساحل سے منجدھار کے آدمی کو آواز دے رہا ہوں۔

پوٹھوار کا بابائے اُردو

میں جن دنوں ثانوی جماعتوں میں پڑھتا تھا، عبدالعزیز فطرت شعر لکھتے تھے۔ ان کی تخلیقات بلند پایہ جرائد میں کثرت اور عزت سے شائع ہوتی تھیں۔ ان کا شمار ملک کے ممتاز شعراء میں ہوتا تھا۔ کوہستانِ جہلم کے الگ تھلگ ماحول میں رہتے ہوئے، اس وقت تک میں یہی سمجھتا تھا کہ بڑے بڑے شاعر ——— لاہور، دہلی، لکھنؤ اور حیدرآباد وغیرہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ فطرت صاحب کو میں کم از کم لاہور کا شاعر سمجھتا تھا۔ لیکن کچھ مدت بعد، جب راولپنڈی تک میری آمدرفت کی صورتیں پیدا ہونے لگیں تو اپنے دوست جناب عزیز ملک سے جو ان دنوں گارڈن کالج راولپنڈی کے طالب علم تھے۔ اور آگے چل کر اردو کے منفرد افسانہ نگار ہوئے، یہ معلوم ہوا کہ فطرت راولپنڈی کے رہنے والے ہیں اور ڈاک کے محکمہ میں ملازم ہیں۔

اب کچھ ٹھیک یاد نہیں۔ غالباً ۱۹۳۷ء کی بات ہے کہ میں راولپنڈی آیا تو شہر میں ایک مشاعرے کا آوازہ کان پڑا۔ میں شاعری کی الف، ب، ت کرنے لگ گیا تھا۔ اور راولپنڈی میں کسی بھی مشاعرے میں بار پانے کی دلی تمنا رکھتا تھا۔ عزیز ملک، میرے تعارفی و مفاہمتی بزرگ مشاعرہ میں لے گئے جو گارڈن کالج کے ہال میں آراستہ تھا۔ آپ نے سٹیج پر جا کر منتظم مشاعرہ کے کان میں کچھ پھونکا اور وہ دوسرے ہی لمحہ میرے پاس تشریف لے آئے۔ گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ میری آمد پر کمال خوشنودی

بلکہ اپنی خوش قسمتی کا اظہار فرمایا اور مجھے اپنے ساتھ سٹیج پر لے گئے۔ یہ فطرت سے پہلے اتفاق دیکھیے کہ ملک عبدالعزیز فطرت سے میرا تعارف عبدالعزیز ملک کی وساطت سے ہوا۔

راولپنڈی میں اردو زبان و ادب کے فروغ کے سلسلے میں، فطرت صاحب کی لگن اور سعی کا تذکرہ میں عزیز ملک کی زبانی سن چکا تھا۔ بعد میں یہ روداد خود میری اپنی آنکھوں کے سامنے سے گزرتی رہی۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلسل ایک ربع صدی تک راولپنڈی میں ادبی و تہذیبی سطح پر جو کچھ ہوتا رہا، عبدالعزیز فطرت ہی کی وجہ سے ہوا۔ پوٹھوار کی سرزمین اس مذاقِ شعر و ادب کے لحاظ سے ایک سنگلاخ اور تاریک بیابان تھی۔ فطرت پہلے لوگوں میں سے ہیں جو شعر و ادب کے چراغ کو ہتھیلی پر رکھ کر نکلے اور اس لحاظ سے تنہا شخص ہیں جو کمال ثابت قدمی سے مسلسل پچیس تیس برس تک اس شمع کی لَو کو اپنے خونِ جگر سے تیز سے تیز تر کرتے چلے گئے۔ تاآنکہ ماحول میں چراغاں کا سماں پیدا ہو گیا۔ وہ تخلیق ادب کے علاوہ ترویجِ شعر و ادب کی بے پایاں لگن رکھتے تھے۔ خدمتِ فن کا یہ جذبہ ان کی زندگی کا مشن بھی تھا اور ان کے روح کی آسودگی تھی۔ خطہ پوٹھوار کی ادبی تاریخ کا ایک پورا دور عبدالعزیز فطرت کے نام سے منسوب رہے گا۔ اور تاریخ ادب کا کوئی تذکرہ اردو کے اس خاموش، مخلص، اور اَن تھک خدمت گار کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔

فطرت صاحب ایک مدت تک میرے لیے حضرت مولانا عبدالعزیز فطرت رہے درمیان میں دوسری جنگِ عظیم کا ایک طویل وقفہ بھی حائل رہا۔ لیکن قیامِ پاکستان کے بعد جب راولپنڈی میں یک جائی کی صورت پیدا ہوئی تو ہماری نیازمندی ایک ہی جست میں دوستی بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ دوستوں کی ایک چوکڑی میں تبدیل ہو گئی۔ یہ چوکڑی

فطرت، ڈاکٹر گزن، نذیر شیخ اور راقم الحروف پر مشتمل تھی۔ تیرہ چودہ برس یہ معمول رہا کہ نذیر شیخ شام سے ذرا پہلے اپنی موٹر پر میرے ہاں آجاتے، وہاں سے ہم دونوں مری روڈ پر ڈاکٹر گزن مرحوم (ان کا انتقال ستمبر ۱۹۶۴ء میں ہوا) کے مطب پر دستک دیتے۔ فطرت صاحب عموماً پہلے سے وہاں موجود ہوتے اور پھر ہم لوگ ڈیڑھ دو گھنٹے بازار کی گشت پر نکل پڑتے جس کا نام تھا "چکوتھی گشت"۔ دوسرے احباب میں سے پروفیسر رزمی صدیقی مرحوم، عزیز ملک ابوصالح، اصلاحی مرحوم اور پروفیسر کرم حیدری بھی اس اس گشت میں اکثر شریک رہے۔ فطرت صاحب اس گشت کا انتظار کچھ اس اشتیاق و بے چینی سے کیا کرتے تھے، جیسے ماں ـــــ بچے کا انتظار کرتی ہے۔ ناغہ ہو جاتا تو دوسرے دن ان کا فون آجاتا ـــــ کہ حضرت سلامت یہ کیا؟ ..... یہ کیوں! محبت و یگانگت کے اس ماحول میں ہم ایک دوسرے کو اصل ناموں سے کم ہی پکارتے تھے۔ مولانا عبدالعزیز فطرت اس انجمنِ ناز و نیاز میں "فطرت عالی مقام" بلکہ صرف "عالی مقام" رہ گئے تھے۔

یہ ذاتی پس منظر میں نے قدرے تفصیل سے اسی لئے بیان کیا ہے کہ میں تاثرات فطرت صاحب کو محض سونگھ کر نہیں لکھ رہا، بلکہ سترہ اٹھارہ برس تک ان کو بہت قریب سے دیکھنے (چکھنے) کے بعد لکھ رہا ہوں۔ قرب بڑھتا ہے تو عموماً کشش گھٹ جاتی ہے۔ مگر فطرت معمولی آدمی نہ تھے۔ ان سے قرب جتنا بڑھتا، ان کے واسطے پیار اور تکریم کا جذبہ بڑھتا ہی چلا جاتا ـــــ اخلاص، ایثار، انکسار قناعت اور خود داری کی صفات نے ان کی ذات میں ایک عجیب کشش پیدا کر دی تھی۔

وہ اردو زبان کے محض ادیب و شاعر ہی نہ تھے اس کے پرستار بھی تھے۔ ان کے اس ذوق و شوق کی طرف سرسری سا اشارہ پہلے کر چکا ہوں۔ جن لوگوں نے ان کے ادبی اجتماعات دیکھے ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ اپنے ذوق و نظر کی دلآویزی و دلنوازی

کو کس طرح رنگ و خوشبو بنا کر محفل کے دروبست میں پھیلا دیتے تھے ذہانت، نفاست، شگفتگی اور محنت کی جو چمک ان کی طبیعت میں موجود تھی، وہی ان کی محفلوں میں نمایاں تھی۔ ان کو مشاعروں کا انتظام کرتے دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے یہ شخص شعر کی پوجا کر رہا ہو۔ اسی خلوص کا اعجاز تھا کہ دلوں کو جلا دینے والی جو خالص تہذیبی و ادبی فضا عبدالعزیز فطرت کی سجائی ہوئی محفلوں میں نظر آتی تھی یہ رنگ مالا انہیں محفلوں کا مقدر تھی۔

بڑے مشاعروں کے موقعوں پر باقاعدہ مشاعرہ تو ایک ہی شب کا ہوتا مگر "سدا بہار" (ان کے مکان) میں شاعری کے رتجگے کئی کئی رات برپا رہتے۔ شعر، چائے لطیفے، قہقہے وہ ہما ہمی ہوتی کہ اچھی خاصی شادی کی تقریب کا گمان ہونے لگتا۔ مہمانوں کی خاطر مدارات میں ان کی دل کی خوشی، چاندنی بن کر ان کی آنکھوں سے چھلکنے اور ماتھے پر چمکنے لگتی۔ خود دوڑے دوڑے پھر رہے ہیں۔ یوسف، رفیق اور ایوب محسن ان کے بھائی، ظفر اور صفدر ان کے بیٹے، ہر وقت کمک پر کمربستہ رہتے، اور آپ وقفہ بہ وقفہ، مہمانوں کو نئی سے نئی کوئی نعمت کھلانے کے لیے نئے سے نئے بہانے تراشتے چلے جاتے کہ ذرا دیکھیے پشاور سے بشیر نے کچھ انگور بھیجے ہیں۔ یہ گرما کوئٹے سے تحفے میں آیا ہے۔ یہ آم ..... یہ گلاب جامن ..... وہ خود بھی خوش خور تھے مگر میرا احساس ہے کہ جتنی راحت وہ دوسروں کو کھلانے میں محسوس کرتے تھے اتنی آسودگی خود کھانے میں شاید ہی محسوس کرتے تھے۔ مشاعرے تو مشاعرے "سدا بہار" کی محفلیں یوں بھی سدا بہار تھیں۔ جب بھی وہاں گئے، سخن وروں اور سخن دوستوں کا میلہ بپرا ہوا پایا۔ دنیائے شعر و ادب کے جتنے مشاہیر راولپنڈی میں عبدالعزیز فطرت کے ہاں قیام کرتے رہے ہیں، یہ امتیاز شاید ہی کسی دوسرے فردِ واحد کے حصے میں آیا ہو ـــــ راولپنڈی میں اگر کسی مکان کو "کعبۂ سخن" کا نام دیا جا سکتا ہے تو وہ اسی عالی مقام کا گھر تھا۔

فطرت بے انتہا مصروف شخص تھے۔ دوستوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ ذوق و ضرورت کے مختلف رشتوں سے ان کی ذات کے گرد، دراصل دوستوں کے کئی مختلف حلقے پھول پھل رہے تھے۔ یہ ان کے ظرفِ ایثار و مروت کی وسعت تھی، کہ فطرت صاحب ہر حلقے کی زندگی اور آبرو سمجھے جاتے تھے۔ برادری و رشتہ داری کا سلسلہ اس سے بھی زیادہ وسیع تھا۔ جس کی شادی، غمی، مسائل و معاملات کے خیال کو وہ ہر وقت اپنے سینے سے لگائے رکھتے تھے ان کی ملازمت سخت تھکا دینے والی تھی۔ فرائض منصبی کو وہ اس تندہی، دیانت داری اور ذمہ داری سے انجام دیتے کہ ڈاک خانے میں انسپکٹر ڈاک خانہ جات کے سوا کچھ اور معلوم ہی نہ ہوتے۔ ذمہ دار شوہر، شفیق باپ مخلص دوست، اعزہ و اقربا سے دلی رابطے اور اپنے دل میں انسانوں کی ہمدردی اور خدمت کا وسیع جذبہ رکھنے والے عبدالعزیز فطرت کا ایک ایک لمحہ مصروفیت میں پرویا رہتا تھا ذاتی تفکرات اور محرومیوں سے ان کا دل خالی نہ تھا۔ مگر کوئی چیز بھی ان کی طبعی خوش دلی، خوش کلامی، خوش سوادی پر کبھی غالب نہ آسکی۔ مسرت کی تلاش اور مسرت سے لطف اندوزی ان کی زندگی کا اسلوب خاص تھا۔ میں نے ان کو کبھی آزردہ نہیں دیکھا۔ نہ کبھی کسی کی شکایت ان کی زبان سے سنی۔ اپنے بچوں، اپنے بھائیوں، اپنے دوستوں، اپنے رشتہ داروں کی باتیں وہ اس شیفتگی سے کیا کرتے کہ گویا ایک ایک بوند سے مسرتوں کا دریا کشید کر رہے ہوں۔ بڑے تو بڑے وہ چھوٹوں کا بھی ادب کرتے۔ بزرگ وہ کسی کے تھے ہی نہیں وہ سب کے دوست تھے ——— ہمہ شفقت ——— ہمہ ملائمت ——— ہمہ شگفتگی۔

ننھے بچوں سے بے پناہ محبت تھی۔ عزیزوں کے بچے ان کے گھر آتے تو اندر ممانیوں، خالاؤں سے زیادہ بیٹھک میں انہیں سے چمٹے رہتے۔ آپ ان سے باقاعدہ بچوں کی طرح کھیلتے کہانیاں بیان کرتے، تالیاں بجاتے، قہقہے لگاتے بچوں کے لیے

جیب میں کوئی نہ کوئی "چیجی" ڈالے رکھتے۔ گلی محلے میں ان کا نکلنا دشوار تھا۔ دہلیز سے باہر نکلے نہیں کہ چاروں طرف سے بچوں کا تانتا کرتا ہوا غول ان سے آکر لپٹ جاتا۔ کہانی سنا دو جی! کاغذ کی کشتیاں بنا دو جی! بے تکلفی کا یہ عالم کہ آپ نے بچوں کے اور بچوں نے آپ کے عجیب عجیب ہنسانے والے نام رکھے ہوئے تھے۔ آپ اس پر خوب خوش ہوتے۔

وہ بڑے اونچے مرتبے کے ادیب اور وسیع شہرت کے شاعر تھے۔ غوث تو خیر کیا معنی کرختگی یا سرد مہری کا بھی کوئی سایہ ان میں موجود نہ تھا۔ ادعا یا تعلّی سے سخت کراہت ادبی اجتماعات میں امتیاز کی نشستوں سے دور بھاگتے۔ کیا چھوٹا کیا بڑا سب کی تعظیم، سب کا لحاظ۔ سب کے لیے کلمۂ خیر، اپنا کلام، از روئے انکسار ہمیشہ تامل سے سناتے۔ اپنے شعر یاد بھی کم ہی رہتے۔ دوسروں کا کلام شوق و اصرار سے سنتے۔ اچھے شعر پر تڑپ اٹھتے۔ اچھے شعر اور اچھی بات سننے کا ان سے زیادہ مشتاق گاہک میری نظر سے نہیں گزرا۔

چائے اور میٹھے کے رسیا تھے۔ البتہ نفاست کا خیال ضرور رکھتے۔ چائے عمدہ ہوتی تو گھونٹ گھونٹ واری قربان ہو ہو کر پیتے۔ مٹھائیوں کی سیرت پر بھی فریفتہ تھے اور ان کی صورت کے بھی غلام تھے اور اس حد تک کہ مثلاً اگر لڈو یا امرتی کی شکل غیر متناسب ہوتی تو رغبت کم ہو جاتی تھی۔ ان کی نظر شاید ہر چیز میں فن کے جمالیاتی اور ذوقی تناسب کی متلاشی رہتی تھی۔ ——— شہر میں مٹھائی کے جس استاد کا شہرہ ان تک پہنچتا، وہ خواہ کسی تنگ و تار کوچے میں خوانچہ لگا کر بیٹھتا ہو، آپ اس تک ضرور پہنچتے ——— اس معاملے میں ان کا شیوۂ سخن فہمی" کا تھا، غالب کی طرفداری کا نہ تھا" ہماری "چکوتھی گشت" میں مٹھائی خریدنے کا قلمدان انہیں کے سپرد تھا۔ آپ مٹھائی کا ڈبہ لے کر موٹر کی پچھلی نشست پر بیٹھ جاتے اور دانہ دانہ نکال کر مفصل مقدمے اور دیباچے کے ساتھ، ہمیں کھلاتے جاتے۔ مٹھائی کی کسی دکان کے سامنے سے تانگہ جھانک کیے بغیر چپ چپاتے گزر جانا ان

کے واسطے سخت کٹھن مرحلہ ہوتا ـــــ آخری دو برسوں میں جب ڈاکٹروں نے ذیابیطس کی وجہ سے میٹھا بند کر دیا، حسرت سے کہا کرتے "ـــــ مٹھاس بند ہو جانے سے زندگی سے مٹھاس نکل گئی ہے ـــــ" پرہیز کے احساس اور تاکید کے باوجود بعض اوقات اعلیٰ سیرت و صورت کی مٹھاس دیکھ کر آپ بے قابو ہو جاتے اور پتہ نہیں کس شاعر کا یہ شعر پڑھ کر دو چار دانوں پر ہاتھ صاف کر ہی جاتے ؎

اب کیا سنور سکیں گے ہم آوارگانِ شوق
صدیوں کے جبر نے تو سنوارا نہیں ہمیں

فطرت صاحب عادتاً کارفرما اور منتظم آدمی تھے۔ مگر ملنساری، مروت اور بیگار کی مصروفیتوں کے سبب سے گھر کے دھندوں پر توجہ نہیں دے سکتے تھے۔ حد یہ ہے کہ اپنی زندگی میں اپنا کلام بھی مرتب نہ کر سکے۔ کبھی کسی گھریلو کام میں مصروف ہوتے تو سخت بیزاری کے موڈ میں پائے جاتے۔ دوستوں سے معذرت کرتے یارو! ایک منٹ معاف کرنا میں ابھی اس جنجال کو ختم کرتا ہوں مالی لحاظ سے وہ ہمیشہ ناآسودہ رہے۔ مگر اپنی آزردگی کو کبھی انہوں نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وہ صحیح معنوں میں شاکر اور قانع انسان تھے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد آپ نے ایک دکان بھی کھولی۔ عمارتی لکڑی کے تختے کرائے پر چلانے کا منصوبہ تھا۔ اصغر مال کے قریب ایک وسیع احاطے میں تختوں کا انبار جمع کر لیا تھا ایک روز ان کی تلاش میں ہم پہنچے تو دیکھا کہ پیڑوں کے ایک جھنڈ پر براق سفید چادر کا پلنگ بچھا ہوا ہے ساتھ دو تین کرسیاں رکھی ہیں اور آپ بے رنگ، خشک تختوں کے سامنے شاداب گملوں کی قطار آراستہ کر رہے تھے ہنس کر بولے کاروبار اپنی جگہ پر ہوتا رہے گا۔ میں نے سوچا نشست کے لیے ذرا ڈھنگ کی جگہ تو بن جائے۔ تختے چل بھی نکلے تھے مگر اتنی دور چلے گئے تھے کہ تھوڑے ہی دنوں میں دکان کا تختہ ہو گیا۔ بڑی مشکل یہ تھی کہ گاہک عموماً واقف کار لوگ تھے جن سے کرائے کا تقاضا کرتے ہوئے

آپ کو شرم آتی۔ کسی بات کا تقاضا کرنا فطرت کے تقاضائے فطرت کے خلاف تھا۔ وہ عمر بھر جدوجہد تو کرتے رہے مگر تقاضا کبھی نہ کر سکے۔

مارچ ۱۹۶۵ء میں راولپنڈی کے ادیبوں اور شاعروں نے ان کی ساٹھویں سالگرہ پر "جشنِ فطرت" کے عنوان سے ایک دھوم دھامی تقریب کا اہتمام کیا۔ اس تقریب کو وہ چھ سات برس سے ٹلتے چلے آ رہے تھے۔ نیازمندوں گھیر گھار کر مجبور کیا تو بس اس حد تک راضی ہوئے کہ اچھا میں آ جاؤں گا لیکن کسی مشورے میں ہرگز شامل نہ ہوں گا۔ تقریب کے سلسلے میں انہوں نے صرف ایک فرمائش کی تھی۔ کہنے لگے۔ فلاں محلے میں میرا ایک غریب دوست رہتا ہے وہ کورا ان پڑھ آدمی ہے مگر میرے بچپنے کا جگری دوست ہے تقریب میں اس کو ضرور بلوایئے تقریب کے دن صبح ان سے ملاقات ہوئی تو دھوم دھام کے احساس سے ان پر سخت دہشت طاری تھی۔ ہمیں اندیشہ تھا کہ مبادا عین وقت پر آپ تقریب میں شرکت سے انکار کر دیں اور اگر ایفائے عہد ان کی سرشت کا خاصہ نہ ہوتا تو کچھ عجب نہیں کہ وہ جلسے میں سرے سے تشریف ہی نہ لاتے۔

سفر میں ان جیسا خوشگوار ساتھی مشکل سے ملے گا۔ ان کی شاداب باتوں اور چست چمکیلے جملوں سے سفر ایک دلکشا ادبی تفریح بن جاتا۔ ساتھیوں کی دیکھ بھال اور ان کے ڈسپلن کی باگ ڈور انہی کے ہاتھ میں ہوتی۔ ڈیرے پر جا کر جب تک ایک ایک چیز کو جا بجا قرینے سے جما کر رکھ نہ لیتے، آرام نہ کرتے۔ صبح کی چائے کا انتظام رات ہی سے کر رکھتے۔ سحر خیز تھے۔ رات کے تین بجے بھی سوتے تو پانچ بجے اٹھ بیٹھتے مناظرِ فطرت سے عشق تھا۔ اٹھتے ہی باہر گھومنے نکل جاتے۔ شجر و حجر، جوہباروں اور شاخساروں سے نسیمِ صبح کے لہجے میں گفتگو فرماتے شیو، غسل، نماز سے فارغ ہو کر، میز پر چائے کا سامان چن کر، پیار سے چھلکتے ہوئے ترنم میں آواز دیتے۔ شیخ صاحب آیئے! آ جایئے!

صفائی ستھرائی، طہارت کا بڑا خیال رکھتے ـــــ اچھے بھرپور غسل کو زندگی کی

نعمتوں میں شمار کرتے۔ ——— صاف ستھرا غسل خانہ جہاں بھی مل جاتا فوراً نہانے کے لیے کمر کھولنے لگتے ہم لوگ کسی ہوٹل میں قیام کرتے تو آپ سب سے پہلے غسل خانے کا جائزہ لیتے۔ غسل خانہ اچھا ہے تو ہوٹل پاس ورنہ فیل ——— ان کے بس میں ہوتا تو گرمیوں کا پورا موسم کسی اعلیٰ غسل خانے کے ٹب میں گزار دیا کرتے۔

فطرتِ ہر لحاظ سے ایک خوش ذوق آدمی تھے اپنے شعر کی طرح اپنے بستر پر بھی ہلکی سی شکن برداشت نہ کر سکتے۔ اس معاملے میں اس قدر زکی الحس تھے کہ کسی دوسرے کے بستر پر شکن دیکھ لیتے تو سو نہ سکتے۔ سلیقہ اور ترتیب ان کا خاصہ تھا۔ اپنی کتابوں کاغذوں اور کپڑوں کو انتہائی ترتیب سے تہہ کر کے رکھتے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو پرانے رسائل و جرائد کے تراشوں کے انبار کمروں کی چھتوں تک جا پہنچتے۔

فطرت صاحب مذہب سے دلی اور گہری وابستگی رکھتے تھے۔ وہ ایک راسخ العقیدہ اور باعمل مسلمان تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ عشق تھا۔ مگر دین سے اپنے شغف کو اپنی ذات تک ہی محدود رکھتے تھے۔ دکھاوے سے ان کو خوف آتا تھا۔ عمر کے آخری دور میں حج بیت اللہ اور روضۂ رسولِ کریمؐ پر حاضری کی آرزو میں بے چین رہنے لگے۔ اشعار پر نعتیہ رنگ غالب آگیا تھا۔ ۱۹۶۶ء میں اللہ پاک نے ان کو اس سعادت سے بھی سرفراز کر دیا۔ حج سے واپس آئے تو چہرے پر چھوٹی چھوٹی پُرنور داڑھی تھی۔ کہنے لگے۔ واپسی کی مجبوری تھی۔ اس لیے واپس آنا پڑا، ورنہ سیری نہیں ہوئی ——— زندگی کی اس عزیز ترین آرزو کے بر آنے کے بعد غالباً ان کو زندگی کی مزید احتیاج باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اگست میں بیمار ہوئے۔ اور ۵ اکتوبر کے آفتاب کے ساتھ پوٹھوار کا یہ آفتاب بھی غروب ہو گیا:

ہوا کے دوش پہ جاتا ہے کاروانِ نفس عدم کی راہ میں کوئی پیادہ پا نہ ملا

فطرت۔ زندگی میں بھی بلند مقام تھا۔ اب اور بھی بلند ہو گیا ہے!

اُردو ادب کا منگلا ڈیم*

احمد ندیم قاسمی اس دور کی ایک اہم ادبی شخصیت ہیں۔ فردا ——— حال سے کٹا ہوا نہیں، بندھا ہوا ہوتا ہے۔ ہر دور میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ تاریخ ان کی زندگی ہی میں، ان کی پائیدار عظمت کی نشان دہی کر دیتی ہے۔ ندیم انہی اہلِ قلم میں سے ہیں، جن کی روشنی حال سے نکل کر فردا میں جھلملا رہی ہے۔ ان کی آواز ہمارے دور کی نمائندہ آواز ہے جو دھڑکن اور روشنی بن کر زندگی کے دل میں اتر گئی ہے۔ ندیم کے بارے کچھ لکھنے کی نیت سے جب تک قلم اٹھایا نہ تھا، ان کے متعلق کچھ لکھنا سہل معلوم ہوا۔ لیکن جب لکھنے بیٹھا تو یہ مرحلہ انتہائی دشوار نظر آیا۔ ذہن میں جھانکتا ہوں تو دور دور تک، پھولوں اور ستاروں اور نغموں کا "میلہ چراغاں" بھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ندیم کی شخصیت پر جتنا غور کرتا ہوں اتنا ہی اس کا پیکر رنگوں اور خوشبوؤں میں تحلیل ہو کر فضا میں پھیلتا چلا جاتا ہے۔ کاش! اس لطافت اور شیرینی کو کما حقہ بیان کرنے کے لیے موزوں الفاظ موجود ہوتے اور اگر موجود ہیں تو میری دسترس میں بھی ہوتے۔

---

* یہ مضمون نومبر ۱۹۶۷ء میں گورنمنٹ کالج راولپنڈی کی ایک تقریب کے لیے لکھا تھا۔ آجکل زیرِ تعمیر تربیلا ڈیم مکمل ہونے پر منگلا ڈیم سے بڑا آبی ذخیرہ ہوگا۔ مگر میں نے مضمون کا عنوان تبدیل کرنا مناسب نہ سمجھا۔ علامت کی معنویت ایک دوامی چیز ہے (ض جنوری ۱۹۷۶ء)

زندگی میں مختلف اور مصروف راستوں پر چلنے کے سبب سے آرزو کے باوجود مجھے ندیم سے دوستی کی پینگیں بڑھانے کا موقع تو نہ مل سکا۔ لیکن میں ان سے محبت ضرور رکھتا ہوں یہ محبت چونکہ وصال سے زیادہ فراق کی راہوں سے گزرتی رہی ہے، لہٰذا اس کی شدت کا اندازہ میں ہی کر سکتا ہوں۔ جب میں پہلی مرتبہ ان سے بغل گیر ہوا تھا تو طبیعتیں پہلے ہی ایک دوسرے سے بغل گیر ہو چکی تھیں، یہ ذات سے ذات اور محسوسات سے محسوسات کی ملاقات تھی توقع یہی تھی کہ اس پس منظر سے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر برآمد ہوں گے۔ اور زندگی کے راستے پر قدم سے قدم ملا کر چلیں گے لیکن دو ہی قدم چلے ہوں گے کہ مجھے معلوم ہو گیا کہ ان کے قدم جیل خانے کی طرف اٹھ رہے ہیں۔ قصہ کوتاہ یہ کہ میں اپنی روٹی کے انتظام میں اور وہ دوسروں کی روٹی کے بندوبست میں اپنے اپنے راستوں پر مصروف ہو گئے۔

دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد (دکن) کی وہ جانیں، لیکن پنجاب کے جتنے ادیب آج عمر کے لحاظ سے پچاس برس کے پیٹے میں ہیں، ان میں سے بیشتر آج سے کوئی تیس برس پیشتر پنجاب کے مختلف کالجوں میں تحصیل علم کے مختلف مرحلوں سے گزر رہے تھے اور ایک بات ان سب میں مشترک تھی کہ

جو ذرہ جس جگہ تھا وہاں آفتاب تھا

یعنی کالج کے ادبی حلقوں میں ان کا طوطی بولتا تھا۔

ان میں سے بیشتر شعرا نے آگے چل کر زندگی کے سامنے قلم رکھ دیا جیسے کوئی سپاہی دشمن کے سامنے تلوار رکھ دے۔ ہمارے کالج (گورنمنٹ کالج کیمبل پور) میں ملک اختر حسین (بعد میں لیفٹیننٹ جنرل)، شیر محمد شاد (بعد میں کرنل) اور بخشی انور علی انور (آج کل پرنسپل گورنمنٹ کالج مری) کا طوطی برابر برابر بول رہا تھا۔ ان میں سے اختر اور شاد ادب کا میدان چھوڑ کر جنگ کے میدان میں چلے گئے۔ سبز طوطی کی آواز سے کان موڑ کر انہوں نے

دوسری جنگ عظیم میں جنگل گرین وردی (JUNGLE GREEN) پہن لی۔ البتہ بخشی انور علی انور کی پیش قدمی بفضلہٖ تعالیٰ اب تک محاذِ ادب پر جاری ہے۔ ہم لوگوں کی ادب سبھا کالج کی "ٹک شاپ" میں جما کرتی جہاں کبھی گرم کرارے سموسوں اور کبھی نرم ٹھنڈے شربتوں کے ساتھ ساتھ ادبی مسائل زیرِ بحث رہتے۔ ادبی مسائل میں عموماً مختلف کالجوں کے درس گاہی جریدوں کو جو ہماری لائبریری میں بہت ہی آتے اور التزام سے بھی آتے بطورِ خاص خوردبین لگا کر دیکھا جاتا، ایک مرتبہ، سری پرتاپ سنگھ کالج سری نگر کے ایک شاعر بلبل کے اس شعر کا کئی روز تک تذکرہ ہوتا رہا۔

مرا نام گل ہے تخلص ہے بلبل
سلامٌ علیکم اڑا چاہتا ہوں

احمد ندیم قاسمی کا غلغلہ پہلے پہل ہمارے ہاں ہماری اس ادب سبھا میں اٹھا (بعد میں یہ پتہ چلا کہ وہ کیمبل میں زیرِ تعلیم بھی رہے)۔ ہوا یہ کہ ایک دن شاد صاحب ایک رسالہ اٹھا لائے (غالباً صادق ایجرٹن کالج، بہاول پور کا میگزین تھا) جس میں سے انہوں نے ایک نظم اپنے ایک مخصوص جارحانہ ترنم میں پڑھ کر سنائی اور پھر دوٹوک لہجہ میں فیصلہ صادر کرتے ہوئے بولے ——— اس کو کہتے ہیں عالم آرائی۔

یہ کسی پیر زادہ احمد ندیم قاسمی کی نظم تھی۔ نظم میں دیہاتی زندگی کی اتنی خوبصورت اور سچی عکاسی کی گئی تھی کہ جیسے ایک ایک شعر کے چہرے پر خود میرے اپنے گاؤں کی سنہری دھوپ چمک رہی ہو پھر یہ نہیں کہ شاعر محض کیکر، پھلاہی، شہتوت کے درخت گنواتا چلا گیا ہو۔ یا کسی کسان کے ہاتھ میں حقہ تھما کر خود کسی نہر میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا ہو۔ ایسا نہ تھا، نظم میں الہڑپنے کی معصومیت بھی تھی اور نوجوانی کی اُمنڈتی ہوئی روحانیت بھی۔ مگر اس کا ریشہ ریشہ زندگی کی دھڑکنوں سے تپا ہوا تھا، منظر کا جسم، جس قدر خوبصورت تھا۔ اس کی روح اتنی ہی دردمند تھی۔ مجھے یاد ہے "ادب سبھا" میں کالج کے دانشوروں کی ہندولابی

کے گورمکھ منوہر لال دھوپر نے کہا تھا ——— "اس لوک کے شبد بنسری بجاتے ہوئے آتے ہیں"۔ ہمیں جب کبھی کوئی غیر معمولی ادبی نعمت دستیاب ہوتی تو ہم لوگ اس کی قدر و قیمت پر مذاکرہ کرنے کی نیت سے ایک باقاعدہ وفد کی صورت میں پروفیسر مولوی انعام علی بیگ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے کہ کیمبل پور میں مذاق شعر و ادب کی آخری مہر انہیں کے پاس سمجھی جاتی تھی۔ آج بھی ہم اس نظم کا جلوس باندھ کر ان کے پاس پہنچے۔ مولوی انعام علی بیگ عربی کے استاد اور فارسی کے شاعر تھے۔ ایک دو غزلیں اردو میں بھی کہہ رکھی تھیں۔ ادبیات پر ان کے نقد و نظر کا انداز کچھ ایسا ہوتا کہ نظم یا غزل سن کر کوئی لمبی چوڑی بحث اٹھانے کے بجائے کوئی ایک عارفانہ سا جملہ کہہ دیتے جس کی تعبیر و تفسیر آپ اپنی توفیق کے مطابق خود کرتے رہیے۔ مولوی صاحب کے سامنے نظم کی خواندگی کا فریضہ شاد صاحب نے اپنے مخصوص ترنم میں ادا کیا۔ ترنم کے بعد مولوی صاحب نے وہ نظم دوسری مرتبہ تحت اللفظ میں سماعت فرمائی کیونکہ ان کے بقول شعر کی قدر و قیمت کا اندازہ ترنم سے نہیں، تحمل، تعمق، تفکر وغیرہ سے ہوتا ہے۔ شاہ پڑھ چکے، تو مولوی صاحب نے رسالہ اپنے ہاتھ میں لے کر ایک مرتبہ پوری نظم کو، دل ہی دل میں، چبا چبا کر خود پڑھا پھر کچھ دیر آنکھیں بند کر کے اپنے اندر دیکھتے رہے۔ پھر دائیں بائیں سر ہلانے کے بعد ارشاد فرمایا:

"یہ گھوڑا اگر دوڑتا رہا تو ریس (RACE) جیت جائے گا"

اس کے بعد پیرزادہ احمد ندیم قاسمی کی جو چیز جہاں بھی نظر آتی ہم لوگ اس کو "ٹک شاپ" میں باجماعت پڑھتے خوبیوں کے علاوہ ان کے شعروں میں سے "کیڑے" پکڑنے کی بھی بہت کوشش کرتے مگر عموماً ہر نظم کے بعد مولوی انعام علی بیگ صاحب کو جا کر اطلاع دینا پڑتی۔

"جناب آپ کا گھوڑا بڑی تیزی سے دوڑ رہا ہے"

اور مولوی صاحب یہ سن کر ایسی مسکراتی ہوئی نگاہوں سے ہمیں دیکھتے جیسے فی الواقع انہیں کا گھوڑا دوڑ رہا ہو ——— قاسمی صاحب کی چیزیں زیادہ تر دور افتادہ ضلعی پرچوں میں نظر آتیں ——— دھوپر اگرچہ ہندو تھا مگر چونکہ میانوالی میں پلا بڑھا تھا، اس لیے پنڈت تلوک چند محروم کی معنوی اولاد معلوم ہوتا تھا۔ یعنی فارسی اردو میں ڈھلا ہوا ہندو۔ ایک روز دھوپر ایک نیا رسالہ اٹھا لایا، اور رسالے کو ہلاتے ہوئے بولا۔

"ایں گلِ دیگر شگفت ——— ذرا یہ کہانی دیکھو" ——— یہ پیرزادہ احمد ندیم قاسمی کا افسانہ تھا۔ بصیرت کی اس وقت نہ ہمیں خبر تھی نہ ضرورت۔ ہم تو لذت، کشش اور تاثر کے گاہک تھے، سو یہ سب نعمتیں ان کے افسانے میں بڑے ہی پیارے توازن اور بانک پن کے ساتھ موجود تھیں۔ بصیرت نیچے نیچے خود بخود چلی آئی تھی۔ شعر کی طرح ان کی نثر بھی سیدھی دل میں جا کر ترازو ہوتی۔ کہانی میں کپاس کے ہنستے ہوئے پھولوں کے درمیان روتی ہوئی زندگی کا کوئی مرقع پیش کیا گیا تھا۔ افسانے کے اکثر کردار ہمیں اپنے ہی رشتہ دار معلوم ہوئے یہ ۳۵-۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ ایک دو برس بعد میں ندیم کو چھو کر بھی دیکھ لوں گا یہ ۳۷ء یا ۳۸ء کا واقعہ ہے۔ ندیم شہرت کے زینے تیزی سے طے کر رہے تھے۔ میں اسلامیہ کالج کے ریواز ہوسٹل میں رہتا تھا۔ جہاں ایک طرف مختار صدیقی، اختر ہوشیارپوری اور تالیش صدیقی، ایسے طلبا شاعر مقیم تھے جو آگے جا کر مشاہیر ادب میں شمار ہوئے وہاں دوسری طرف جہلم سرگودہا اور میانوالی کی طرف کے خالص توانا و تندرست، فٹ بال اور کبڈی کے کھلاڑی طلبا کا بڑا "ڈپو" (DEPOT) قائم تھا۔ شاعر طبع ہونے کے باوجود چونکہ میں تن و توش اور لباس کی وضع و تراش نیز عام نشست و برخواست میں انہی طلبا کا ہم سخن و ہم قدم تھا، لہٰذا ادب و شعر کے معروف حلقوں کی طرف ہمارا گزر کم ہوتا۔ طلبا کا یہ گروہ طرے دار پگڑیاں باندھتا، اور لمبی لمبی اچکنوں کے ساتھ تنگ موہری کی بھاری، تہہ دار چنی ہوئی شلواریں پہنا

کرتا۔ مونچھیں اگر نکل آتیں تو ہم لوگ ان کو واپس نہیں جانے دیتے تھے۔ ہمارا زیادہ وقت گھی پی کر ورزش کرنے۔ انارکلی میں گھومنے گھامنے یا کسی نہ کسی شاخسانے میں الجھ کر ہاتھا پائی، مار کٹائی وغیرہ کے مشغلوں میں گزرتا۔ عجیب بات ہے کہ ندیم سے میری پہلی ملاقات کسی "حلقۂ سخنوراں" میں نہیں ہوئی۔ بلکہ اسی "حلقۂ پیلِ تناں" میں ہوئی وہ ایک روز ریواز ہوسٹل میں مقیم پانچ چھ نیازیوں سے ملنے آئے تو اس نرغے میں مجھ سے بھی ملاقات ہوگئی، سہ پہر ڈھلنے پر جب انارکلی میں ستاروں کے اترنے کا وقت ہوا، تو نیازیوں کا جتھا، طرّے لہراتا شلواریں کھڑکھڑاتا انارکلی کی یلغار پر نکل گیا۔ مگر میں اور ندیم دیر تک بیٹھے ادب و نشر کی باتیں کرتے رہے۔ ندیم ابھی تک پیرزادہ احمد ندیم قاسمی تھے۔ شاعر کا نام اس وقت سکڑتا ہے جب اس کی شہرت پھیلنے لگتی ہے۔ وضع قطع وہی تھی جو ہونی چاہیے تھی۔ گاؤں کا ٹھیٹھ نوجوان جیسے اپنی کسی نظم یا افسانے میں سے ابھی ابھی نکلا ہو۔ لباس سادہ مگر ستھرا۔ خلوص۔ سچائی اور انکسار کا پیکر۔ میٹھا میٹھا دھیما سا لہجہ، بات ٹھہر ٹھہر کر سوچ سوچ کر گویا کوئی لفظ ادا کرنے سے قبل اس کی ذمہ داری بھی قبول کر رہے ہوں۔ چہرے پر ایک شرمیلی سی مسکراہٹ۔ آنکھوں میں وہ غیر معمولی چمک جو مروّت ہمدردی اور خوش خیالی کے جذبے اور افق پار کسی چیز کی مسلسل تلاش کی کاوش سے پیدا ہوتی ہے۔ اور ہاں رخسار پر زخم کا وہ نشان بھی، جو ندیم کی شخصیت کا "قومی نشان" ہے، ان کے خدوخال کی کشش کو تقسیم کر کے علیحدہ علیحدہ بیان کرنا مشکل ہے۔ ہاں مجموعی طور پر ان کو دیکھ کر ایک مردانہ جاذبیت اور شریفانہ وقار کا احساس ہوتا ہے۔ بعد میں جیسے جیسے ان کا فن نکھرتا گیا، ان کے لباس میں بھی نفاست اور سلیقے کا رکھ رکھاؤ سنورتا چلا گیا۔ ندیم شاعری کے علاوہ زندگی میں بھی کام آنے والے ایک صحت مند، خوش ذوق اور صاف ستھرے انسان ہیں۔

ندیم ان دنوں کالج سے تازہ تازہ نکلے تھے اور دو ایک سرکاری ملازمتوں کو

سونگھ سانگھ کر، اب لاہور میں اپنی پسند و مذاق کا کوئی کام تلاش کر رہے تھے۔ ادبی حلقوں میں اگرچہ ان کی شہرت تیزی سے پھیل رہی تھی۔ تاہم لاہور میں وہ ابھی نووارد تھے۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ اس عظیم شہر میں جناب مولانا غلام مرشد یا ریواز ہوسٹل کے "چند نیازیوں" کے سوا وہ کسی شخص سے متعارف نہیں ہیں۔ گویا جہاں تک لاہور کی زندگی کا تعلق تھا میں ندیم سے سینئر تھا چنانچہ میں نے پہلے تو اپنی پروازِ خیال کے مطابق ان کو سرکاری ملازمت ترک کرنے پر ایک طرح کی سرزنش کی کہ پیارے یہ تو نے بُرا کیا کیونکہ ادب میں روٹی نہیں ملتی۔ پھر ادب کے میدان میں ان کو مشورہ دیا کہ بھائی صاحب یہاں کے ایڈیٹروں سے بھی کچھ راہ و رسم نکالو۔ یہ لوگ شعر نہیں واقفیت چھاپتے ہیں۔ مجھے یاد ہے، ندیم نے مسکرا کر جواب دیا تھا ——— "میرے شعروں میں جان ہو گی تو چھپ جائے گا، ورنہ اس کا نہ چھپنا ہی بہتر ہے"۔ یہ جواب سن کر مجھے شاید ایک جھرجھری سی آئی اور دل میں شاید کچھ کچھ ہنسی بھی۔ مجھے اس وقت اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ دورِ افتادہ میں اُگا ہوا یہ سادہ سا نوجوان ایک روز لاہور شہر کے دل پر حکومت کرے گا اور اُردو ادب کا ایک پورا دور اس کے نام سے اور کام سے روشنی پائے گا۔

لاہور کی ادبی زندگی میں ان دنوں ابوالاثر حفیظ جالندھری اور شاعرِ رومان حضرت اختر شیرانی کا طوطی بول رہا تھا۔ حفیظ صاحب کوٹھیوں میں رہتے اور موٹروں میں گھومتے یوں بھی کچھ قاعدے، کچھ لیے دیئے سے، دور کے ڈھول بعض اوقات غلط بھی سنائی دیتے ہیں۔ ہم نے از خود یہ فیصلہ کر لیا کہ ہم حفیظ کے آدمی نہیں اختر کے آدمی ہیں۔ شاعرِ رومان ایک تو ویسے ہی نوجوان نسل کے ذہن پر چھائے ہوئے تھے۔ پھر کالج کے آس پاس کے گلی کوچوں میں جھومتے جھامتے مل جائے اور اللہ بخشے پہلی ملاقات ہی میں غریبت کا پردہ چاک کر کے الگ پھینک دیتے۔ ان سے ملاقات سہل بھی تھی اور خوشگوار بھی، مجھ سے پہلے ثابش صدیقی ان کے راسخ مریدوں میں شامل ہو چکا

تھا۔ میں بھی تلاش کے وسیلے سے ان کے حلقے میں پہنچا۔ وہ اپنے نامور والد علامہ پروفیسر حافظ محمود شیرانی کے ساتھ فلیمنگ روڈ کی ایک دو تین منزلہ حویلی میں رہتے تھے جو ایک احاطے کے اندر واقع تھی۔ پہلی منزل سے بھی پہلے، ایک تنگ نیم تاریک سی بغلی کوٹھڑی میں ان کی نشست رہتی۔ خواب گاہ بھی یہی تھی۔ ایک چارپائی پر بستر، سامنے میز پر رسالہ رومان کا دفتر اور حجامت کا سامان، ملاقاتی بھی یہیں آکر ان سے اپنے اپنے حسن یار کی باتیں کرتے ندیم سے ان کے ہاں کبھی کبھی ملاقات ہو جاتی۔ اختر کی محفل میں چونکہ بندہ و صاحب و محتاج و غنی بالکل ایک ہو جاتے تھے۔ اس لیے ان کے بعض چھوٹے چھوٹے نیازمند بھی ان کے سامنے گفتگو میں خاصی بے تکلفی کا انداز اختیار کر لیتے۔ ندیم غالباً واحد نوجوان تھے جو اختر کے حضور میں سرتاپا ادب کا مرقع بنے۔ خاموش بیٹھے رہتے۔ اختر اگر خاص طور پر ان سے کوئی بات پوچھتے تو جواب میں کوئی جچی تلی بات کہہ دیتے۔ جو چمکیلی بھی ہوتی اور اطلس، کم خواب میں لپٹی ہوئی بھی، ورنہ گھنٹوں بیٹھے رہتے اور وہی ——— جی جناب ——— بہت اچھا ——— بجا ارشاد فرمایا ——— کی سرحد سے آگے تجاوز نہ کرتے۔ اختر کے نیازمندوں میں سب سے زیادہ سنجیدہ سب سے زیادہ مؤدب اور پارسا ندیم ہی تھا۔ یوں لگتا جیسے وہ اختر شیرانی کو دیکھنے، ان کی باتیں سننے، ان کی دیکھ بھال کرنے کی غرض سے وہاں کسی "ادبی یاترا" پر آئے بیٹھے ہوں۔ ندیم کی اس دا میں عبادت کی سی پاکیزگی، خلوص اور لگن کا انداز ملتا۔

اختر شیرانی بھی ان کو بہت عزیز رکھتے۔ محبت تو وہ سبھی سے کرتے، لیکن ندیم کی عزت بھی کیا کرتے۔ ندیم لاہور سے باہر ہوئے اور ان کا خط آگیا تو اختر ان کے خط کو ایک قلبی لطف کے لگاؤ کے ساتھ، اپنے احباب اور نیازمندوں کو سنایا کرتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نوجوان پیرزادہ احمد ندیم قاسمی کے اخلاص و اخلاق کا یہ پرتو اس کی شخصیت کے ایک بہت ہی اہم رُخ کی ترجمانی کرتا ہے۔ میری رائے میں ندیم کی وسیع انسانی ہمدردی اس کے دل و نگاہ کی روشنی اور بصیرت، اس کی دردمندی اور دل نوازی نے جو اس کے عظیم فن کا امتیاز خاص ہیں، ندیم کی اعلیٰ سیرت ہی سے جنم لیا ہے یہ روشنی اس کی کشید ہے!

اس اثنا میں، لاہور سے جب میرا آب و دانہ اٹھا تو کوئی دس بارہ برس کی مدت کے بعد دوسری جنگِ عظیم میں سے گزرتا ہوا راولپنڈی میں آ بیٹھا۔ اب کبھی کبھار ندیم سے "روزنامہ امروز" کے دفتر میں (پیر و مرشد) مولانا چراغ حسن حسرت کی بارگاہ میں ملاقات ہو جاتی مولانا حسرت "امروز" سے رخصت ہوئے تو اخبار کی کرسیٔ ادارت ندیم کو تفویض ہوئی۔ اس عرصے میں ندیم کی شہرت و عظمت کا آفتاب افق پر کئی نیزے بلند ہو چکا تھا۔ وہ ایک بلند پایہ شاعر، منفرد افسانہ نگار، بالغ نظر نقاد، اور ایک باکمال صحافی اور انشاء پرداز کی حیثیت سے مانے جا چکے تھے۔ ان کی ریڈیائی نگارشات کی دھوم تھی۔ ان کے فکاہی کالم کی خوشبو دور دور تک پھیل رہی تھی۔ کامیابی کے ساتھ دو ایک فلموں کے مکالمے لکھنے کا سہرا بھی ان کے سر بندھ چکا تھا۔ گویا عسکری زبان میں وہ بیک وقت چھ سات مختلف محاذوں پر لڑ رہے تھے مورچہ کھود کر بیٹھے ہوئے نہ تھے، آگے بڑھ کر لڑ رہے تھے۔ ان کا قلم ایک کے بعد ایک، خوابوں کا جزیرہ سر کرتا چلا جا رہا تھا۔ ادب کا عام قاری حیران تھا کہ دیکھو جس راستے سے گزرتا ہے پھول اگاتا، چراغ جلاتا چلا جا رہا ہے جتنا سفر طے کرتا ہے اتنا ہی تازہ دم دکھائی دیتا ہے۔ سوادِ اعظم کے دل میں ندیم کے لیے پیار اور تکریم کے جذبات، اس کی تخلیقات کو ملتا اور درد کے حوالے سے، ندی سے دریا اور دریا سے سمندر بن رہی تھیں۔ مگر خواص کے بعض حلقوں میں کچھ اندیشے بھی لرزتے نظر آتے کہ ادب کی عظمت کا اندازہ تعداد سے نہیں، معیار سے کیا جاتا ہے۔

ندیم نے ابھی تک جس رنگ سے جتنا لکھا تھا گو وہ اعلیٰ ادب ہی تھا۔ پھر اس کے فکر و نظر کی خوبیاں اور خوب صورتیاں، ندیم کے ادب کو باقی اعلیٰ ادب سے

جدا اور ممتاز بھی کرتی تھیں۔ تاہم برس دو برس میں ایک آدھ غزل لکھنے والے شاعروں کو خدشہ تھا کہ مقدار کا اتنا بوجھ اٹھا کر چلنے سے اس کی کمر دوہری ہو جائے گی۔ اولاد اتنی زیادہ ہو تو وہ توانا و تندرست اور آسودہ خوشحال نہیں رہ سکتی۔ ایک قسم کی مٹی سے بیک وقت کئی مختلف اقسام کے پودے، پھل، پھول، درخت اور ترکاریاں گا کر، ان کی یکساں پرورش کرنا قریب قریب امر محال ہے ان لوگوں میں اکثریت ان اصحاب کی تھی جو خود بھی تخلیقی ادب کی توفیق نہیں رکھتے تھے اور دوسرے یہ کہ نسبتاً آرام دہ اور زیادہ منفعت بخش دھندوں کی مصروفیات نے ان کے دل میں تخلیقی عمل کے قرب سے گزرنے کی لگن یا تڑپ بھی باقی نہیں رہنے دی تھی۔ البتہ تنقید کے لہجے میں انگریزی اور فرانسیسی کے چلتے ہوئے جملے خوب چست کر لیتے تھے تو ان گنی گیانیوں کا قیاس تھا کہ دیکھ لینا آگے چل کر ندیم کی نثر، ندیم کی شاعری سے آگے نکل جائے گی۔ اس کا افسانہ کسی نقطے پر آ کر جم جائے گا۔ نقد و نظر کی صلاحیت کسی موڑ پر اچانک بھاگ جائے گی اور شاعری میں تو ایسی خانہ جنگی بپا ہو گی کہ نظم غزل کو اور غزل نظم کو مار کر ہی دم لے گی۔ ان کا خیال تھا کہ ادب کی مختلف چھ سات اصناف اگر ایک ہی صف میں پہلو بہ پہلو "مارچ" کرنے لگیں تو صف سیدھی نہیں رہ سکتی۔ کامن ویلتھ کی طرح کے وسیع اور متنوع لشکروں کو پریڈ کے بغیر لے کر چلنا، کوئی آسان کام نہیں۔ اس عالم میں تو لکھنے والا بکھر کر ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ کوئی ٹکڑا یہاں گرے گا، کوئی وہاں، مزید برآں جب ندیم نے کوچۂ صحافت میں قدم رکھ کر، صحافت کے "ملک الموت" یعنی روزانہ فکاہی کالم سے بھی پنجہ کشی شروع کر دی تو معاملہ بہت سنگین ہی ہو گیا۔ یہ ہر روز نیا کنواں کھود کر پانی پینے کے مصداق تھا۔ اچھے اچھے اس میدان میں اترے مگر دوسروں کو ہنساتے ہنساتے بیچاروں کی اپنی ہی گھگھی بندھ گئی۔

یہ اندیشے اپنی جگہ پر کچھ غلط نہ تھے، ندیم کے ظرف و ذہانت سے کمتر آدمی

واقعی ادب میں ٹامک ٹوئیے مارنے لگتا۔ میں تو اسے ندیم کے حوصلے، استقامتِ کار، فن سے اس کے عشق اور اس کی غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں کا معجزہ کہوں گا۔ کہ اس نے جس صنف میں بھی قلم اٹھایا، نہ صرف یہ کہ اس کی روایت کو چار چاند لگا دیئے بلکہ اس کے راستے میں فن و فکر کے نئے نئے چراغ بھی روشن کرتا چلا گیا۔ حد یہ ہے کہ وہ صحافت کو بھی ادب کی سطح پر لے آیا۔ جلال اور جمال اس کے فن کے دو توام جذبے یا مظاہر ہیں۔ مگر جمالیات میں اس کا وجدان و احساس اتنا لطیف اتنا متوازن اور دل فریب ہے کہ الفاظ ان کے قلم سے پھول بن کر برستے ہیں۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ندیم اس دور کی عظیم ادبی شخصیتوں میں سے ہے۔ گزشتہ آٹھ دس برسوں میں اس حقیقت کا اعتراف دل سے گزر کر زبانوں پر بھی آ گیا ہے۔ عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ جو شخص زندگی میں ہی "شخص" سے "شخصیت" بن جائے وہ اس انداز میں بات کرتا ہے جیسے وہ کسی اونچے مینار سے نیچے میدان میں کھڑے لوگوں سے مخاطب ہو مگر ندیم کا انکسار بڑھتا جا رہا ہے، مجھے ان سے بھی اب گلہ ہے گا ہے ادب کے "ہوائی اڈوں" یعنی مشاعروں میں یک جائی کا موقع مل جاتا ہے۔ اسی اکتوبر میں جب واہ چھاؤنی کی افسر کلب نے ان کے اعزاز میں ایک شام کی تقریب آراستہ کی تو ہم دونوں نے کرنل شیر محمد شاد کے گھر میں ایک پوری شب عمر رفتہ کو آوازیں دینے میں گزاری مجھے تو آج کا ندیم بھی وہی ندیم معلوم ہوتا ہے جو تیس (۳۰) برس پہلے مجھے ریوالز ہوسٹل میں ملا تھا۔ بلکہ یہ شاخِ اثمارِ شیریں سے جس قدر بھرتی جا رہی ہے اتنی ہی جھکتی جا رہی ہے پچھلے دنوں جب میں یہ سطور لکھ رہا تھا۔ صدر پاکستان نے عظیم منگلا ڈیم کا افتتاح کیا تھا۔ ندیم کے تذکرے میں جب نگاہ اس کی تخلیقات کی رنگا رنگی کی طرف جاتی تو ذہن "منگلا" کی طرف بھی منتقل ہو جاتا۔ اور مجھے ندیم کی ذات بھی ادب و تہذیب کا ایک عظیم

"منگلا ڈیم" معلوم ہوتی ۔ چند مماثلتیں دیکھیے۔

منگلا ڈیم اور ندیم

منگلا تعمیر کا کارنامہ ہے۔	ندیم، تخلیق کا سرچشمہ ہے۔
منگلا ڈیم نے دریا کو تسخیر کیا۔	ندیم نے دلوں کو تسخیر کیا۔
منگلا زمینوں اور کھیتوں کو سیراب کرے گا۔	ندیم دلوں اور خیالوں کو سیراب کر رہا ہے
منگلا سے چھ سات نہریں نکلیں گی۔	ندیم کی چھ سات نہریں چل رہی ہیں۔
منگلا عظیم الشان منصوبہ ہے۔	ندیم عظیم الشان انسان ہے۔

میری دعا ہے کہ خداوند رحیم و کریم خشت و سنگ کے "منگلا ڈیم" اور ادب و تہذیب کے "منگلا ڈیم" ——— ہمارے ان دونوں عظیم سرچشموں کو مدتوں سلامت رکھے کہ یہ دونوں ہمارے عزم اور آبرو کی علامت ہیں۔

اُردو ادب کا کوہ کن

حضرت احسان دانش ایک گراں تہذیبی متاع ہیں۔ اس دور کو انہوں نے اتنا کچھ دیا ہے کہ ہمیں ان کا احسان مند ہونا چاہیے۔ ان کے ایک دیرینہ نیاز مند کی حیثیت سے میں ایک مدت سے ان کے بارے میں اپنے تاثرات لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ مگر بدقسمتی سے میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کے سمندِ شوق پر جب تک کوئی مہمیز نہ لگے، وہ قدم آگے نہیں اٹھاتے۔ بارے کہ "جہانِ دانش" کی اشاعت پر اس آرزو کی تکمیل کی تقریب نکل آئی۔ اگرچہ یہ اسی نوع کی آرزو ہے کہ جس کے بارے میں کسی نے کہا ہے ع

وہ کہتے ہیں کہ نکلی ہے میں کہتا ہوں نہیں نکلی

احسان صاحب اندر باہر سے مزدور ہیں۔ زمانے کی خو کچھ بھی رہی۔ انہوں نے اپنی وضع نہیں بدلی جو کرتا ٹوپی وہ کاندھلے سے پہن کر نکلتے تھے، وہ نہ سہی، مگر ویسا ہی لباس آج تک پہنتے ہیں۔ کبھی تکلف کی بہت موج آگئی تو اوپر شیروانی یا واسکٹ "اوڑھ" لیتے ہیں۔ "اوڑھ" میں نے اس لیے کہا کہ وہ شعر جتنا چست کہتے ہیں، لباس اتنا ہی ڈھیلا رکھتے ہیں۔

میں نے پہلی بار انہیں ۱۹۳۲ء یا ۱۹۳۳ء میں انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں دیکھا،

جونواں کوٹ میں انجمن کے یتیم خانے کے کشادہ دالان میں منعقد ہوا تھا۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ میں گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم کے اسکاؤٹ دستے کے ساتھ سامعین کو پانی پلانے کی خدمت پر مامور تھا اب تو یہ یاد نہیں کہ جلسے کا صدر کون تھا، یا تقریریں کن کن بزرگوں نے فرمائیں۔ ہاں، دو شاعروں کا نقش اسی وقت سے ذہن میں مرتسم چلا آتا ہے۔ ایک تھے ابوالاثر حفیظ جالندھری اور دوسرے احسان بن دانش کاندھلوی حفیظ صاحب ابوالاثر بن چکے تھے۔ یوں بھی بچوں کے "پھول" اخبار میں ان کی "تُرم دم تُرم دم قسم" کی نظموں کی وجہ سے ہم لوگ ان کے نام سے آشنا تھے۔ مگر احسان کا نام بالکل نیا تھا۔ ناظم جلسہ نے جب ان کو نظم پڑھنے کی دعوت دی، تو ہم نے یہی سوچا کہ اگلی قطاروں میں بیٹھے ہوئے دوہرے تہرے جسموں والے معتبرین میں سے کوئی بزرگ کھانستے کھنکارتے اٹھیں گے، لیکن وہ تو ایک بالکل ہی نوجوان، بلکہ لڑکا سا شاعر اٹھا گہرا سانولا رنگ سر پر ٹوپی تن پر شاید شیروانی بھی۔ دونوں کا رنگ شاید سیاہ ہی تھا کہ ان کی پہلی جھلک کا جو تصور میرے ذہن میں قائم ہے اس میں سنولاہٹ کے سائے بہت گہرے ہیں تو ہم لوگ ان کو دیکھ کر خاصے حیران ہوئے بات تھی ہی ایسی۔ وہ اگر ہمارے اسکول میں ہوتے، تو بس یہی ایک دو جماعتیں ہم سے آگے ہوتے۔ ممکن ہے پیچھے ہی ہوتے کہ ہمارے مدرسے میں ان سے بھی بڑے بڑے لڑکے پچھلی جماعتوں میں اٹکے پڑے تھے ان کو دیکھ کر یہ احساس بھی ہوا کہ اگر وہ ہمارے اسکول میں ہوتے تو ان حاضر باش طلبہ میں سے ہوتے جو چھ چھ سات سات کوس سے پیدل چل کر آتے۔ مگر کیا مجال جو ایک ناغہ بھی ہو جائے۔ جیسا کچھ بھی کھاتے تھے گھر پر ہی کھاتے ان کی فیس عموماً معاف ہوتی۔ فیس لگ جاتی تو مدرسہ چھوٹ جاتا۔ مرغی کے لیے تکلے کا زخم بھی بہت ہوتا ہے ع

نگاہ سے بھی بدن پر نشان پڑتا ہے

جب یہ لڑکا شاعر نظم پڑھنے کے لیے اٹھا تو ہمیں یہی توقع تھی کہ اول تو ہماری جماعت کے ملک الشعرا رشید عالم عیش کی طرح لڑکھڑا کر چاروں شانے چت گر پڑے گا یا نظم پڑھتے وقت ہونٹوں سے زیادہ ٹانگیں کانپتی رہیں گی۔ مگر صاحب اس نوخیز شاعر نے تو پہلے شعروں ہی میں سماں باندھ دیا۔ نظم میں یتیم بچوں کی محرومیوں کی ترجمانی کی گئی تھی۔ شعر بھی اچھے ہوں گے لیکن اتنا ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ سامعین کی آنکھیں تر ہوتی جا رہی تھیں۔ نظم وہ ترنم کے ساتھ سنا رہے تھے جس میں بلا کا جادو تھا۔ لوگ آواز کی لہروں کے ساتھ ساتھ جھوم رہے تھے ہمارا اسکاؤٹ دستہ بھی مٹی کے آب خوروں کو مشکوں پر ٹکا کر ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ہمہ تن گوش۔

۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۸ء تک جب مجھے اپنی تعلیم کے سلسلے میں لاہور میں رہنا پڑا۔ تو ان کو دیکھنے اور سننے کے مواقع بھی ملتے رہے، مگر یہ دُور ہی کا جلوہ تھا۔ آپ ان دنوں غالباً کسی کتابوں کی دکان پر کام کرتے تھے۔ یوں مشاعروں کی کامیابی کے لیے ان کا نام "باکس آفس ہٹ" کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ وہ مشاعرے کے ان چند "اسٹار شعرا" میں سے تھے جن کا صرف "گلا" ہی نہیں بولتا تھا "کاغذ" بھی بولتا تھا۔ اب ایک مدت سے وہ تحت اللفظ میں پڑھتے ہیں مگر کشتوں کے پشتے لگا دینے کی کاٹ اب بھی وہی ہے۔ ان کا شعر کسی بیساکھی کا محتاج نہیں۔

احسان صاحب کی شاعری پر تکان کا سایہ آج تک نہیں آیا، وہ خود جتنے بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں، ان کا شعر اتنا ہی جوان ہوتا جا رہا ہے، مگر جس دور کا ذکر ابھی میں کر رہا ہوں، وہ ان کے عنفوانِ شباب کا دور تھا۔ اردو شاعری میں ان کی آواز بنیادی طور پر کوئی بالکل نئی یا اجنبی آواز تو نہ تھی کہ وہ روایت کی پوری میراث کو سر پر اٹھائے ادب کی "جرنیلی سڑک" پر ہی چل رہے تھے۔ مگر ان کے اسلوب میں تخلیقی تازگی اور توانائی کا جوہر بہت نمایاں تھا۔ مناظر فطرت کے حسن کو الفاظ میں

جملکارنے کے ہنر پر ان کو خاص دسترس حاصل تھی۔ ان کی شاعری تصویروں کی شاعری تھی۔ تشبیہات ان کے شعروں پر اسی طرح اترتی تھیں جیسے بہار کے موسم میں شاخیں شگوفوں سے بھر جاتی ہیں۔ طبقاتی ناہمواریوں، ناآسودگیوں اور ناانصافیوں کی عکاسی میں وہ انجمن میں تنہا تو نہ تھے۔ مگر اس درد کی کسک ان کے اپنے لہو سے کشید ہو کر نکلتی تھی۔ اس لیے وہ بجا طور پر، شاعرِ مزدور کے نام سے پکارے جاتے تھے۔

اس وقت کا لاہور ادب و تہذیب کے عظیم میناروں کا شہر تھا۔ علامہ اقبال تو خیر کوہ ہمالیہ تھے۔ مولانا ظفر علی خاں بھی سیاست و صحافت و خطابت کی نسبتوں سے چیزے دیگر تھے۔ ادبی مجلسوں کی صدارت پر عموماً جسٹس سر عبدالقادر اور راجہ نریندر ناتھ جیسے اہلِ علم و اہلِ نظر بزرگ فائز ہوتے تھے جو اپنے لطیف اور بلیغ تعارفی۔ تعریفی، توجیہی جملوں سے محفل کی لطافت و معنویت کو چار چاند لگا دیتے تھے جہاں تک عام ادبی ماحول کا تعلق تھا حفیظ جالندھری، پروفیسر پطرس بخاری، شاعرِ رومان اختر شیرانی، ڈاکٹر تاثیر، مولانا تاجور نجیب آبادی۔ مولانا صلاح الدین احمد، مولانا حامد علی خان، سید عابد علی عابد، صوفی تبسم اور اسی طرح کے بلند و بالا کئی دوسرے ادبا و شعرا لاہور کے ادبی حواس پر چھائے ہوئے تھے۔ حلقہ ارباب ذوق کی باقاعدہ نیو تو ابھی تک نہیں اٹھائی گئی تھی لیکن نوجوان قلم کاروں کا ایک جیالا حلقہ میراجی کے گرد جمع ہو گیا تھا اور ترقی پسند تحریک کا چرچا تو سارے ہندوستان میں چل نکلا تھا نوجوانوں میں سے فیض، راشد، حفیظ ہوشیارپوری، ندیم اور یوسف ظفر کے "شاعرانہ لب و رخسانہ" کا رنگ افق پر چھلک پڑا تھا۔ اور اس مدینۂ علم و فضل میں احسان دانش ایک ایسا خاص محنت کش، مکتبی تعلیم سے قطعاً کورا شخص ادب کے بلند ترین دریچوں پر دستک دے رہا تھا۔ مشاعروں میں ان کی خاص دھاک تھی۔ مزدوروں کے شب و روز حیات سے متعلق ان کی چند نظمیں مشاعروں میں اس قدر مقبول تھیں کہ لوگ ان سے

کوئی دوسری نظم سنتے ہی نہ تھے۔

ادبی حلقوں میں گو ان کی مقبولیت بڑھ رہی تھی، مگر ان کے بارے میں اس نوع کی چہ میگوئیاں بھی گشت کرتی رہتی تھیں ..... کاندھلے اور ماڈری بولی میں کوئی بہت زور بھی مارے گا، تو کتنی کچھ بڑی شاعری کر لے گا؟ علم کے بغیر دانش کا دریچہ آخر کیوں کر کھلے گا؟ زندگی بہترین کتاب اور زمانہ بہترین استاد سہی، مگر گنجی نہائے گی کیا نچوڑے گی کیا؟ لیکن لوگ بھول رہے تھے کہ اصل چیز تحصیل علم کی لگن اور مضبوط قوتِ ارادی ہے نہ کہ مکتب کی چار دیواری۔ اردو ادب میں آج احسان دانش کو جو مقام حاصل ہے، وہ اس لگن کا ثمرہ ہے۔ احسان صاحب کو جب ہم نے دیکھا، تو ان کے ہاتھ میں کدال کے بجائے قلم تھا، لیکن ان سے مل کر ایک بات ہمیشہ محسوس ہوئی کہ وہ جب چاہیں قلم چھوڑ کر کدال پکڑ سکتے ہیں، سیلاب جن راستوں سے گزرتا ہے ان پر اپنی سلین چھوڑ جاتا ہے۔ ان کی زندگی کا سادہ، بے تکلف، درویشانہ چلن سخت سے سخت مشقت اور لگاتار محنت کرنے کی صلاحیت، صعوبات اسی گزرے ہوئے سیلاب کے نشانات ہیں۔ جن سے ان کی گزرگاہِ حیات زرخیز ہو گئی ہے۔ ہم نے ان کے افلاس، ان کی جدوجہد کی باتیں سنی تھیں، مگر سچی بات یہ ہے کہ اس پس منظر کا صحیح اندازہ "جہانِ دانش" کے مطالعہ ہی سے ہوا۔ میری طرح بے شمار دوسرے لوگوں کو بھی شاید اسی سرگزشت سے معلوم ہو گا کہ وہ باقاعدہ اینٹ گارا ڈھونے والے مزدور تھے۔ مٹی کھودنے، چمڑا گانٹھنے کا کام انہوں نے کیا۔ مالی چوکیدار اور چپڑاسی رہے۔ لاہور کے بازاروں میں سُرمہ، منجن بیچنے والوں کی طرح مجمع لگا کر اپنے اشعار فروخت کئے اور حد یہ ہے کہ ریہٹ میں بیل کی طرح جُت کر پانی بھی کھینچنا پڑا۔

"جہانِ دانش" ان کی خودنوشت رودادِ حیات کی پہلی قسط ہے جو

۶۴۷ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ کائنات کی عظیم ترین اور دلچسپ ترین حقیقت خود انسان ہے ہر شخص کا سینہ تجربوں کا دفینہ ہے۔

خاشاک نے بھی دودھ پیا ہے زمین کا

لیکن ہمارے ادب میں خودنوشت تذکروں کا ذخیرہ نسبتاً بہت کم ہے پھر ایک صنف کی حیثیت سے اس پر بیشتر ایسے لوگوں کا تسلط ہے جن کی زندگی تو ہرچند بھرپور نہ تھی البتہ تجوریاں بھری ہوئی تھیں اپنے خیالات عموماً انہی لوگوں نے لکھے ہیں جن کی ڈیوڑھی پر ہاتھی جھومتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نوع کے اکثر تذکرے انسانوں سے زیادہ ہاتھیوں کے تذکرے معلوم ہوتے ہیں، یا پھر شجرۂ نسب کے ایسے زینے کہ ان پر چڑھتے ہوئے آپ نامور جرنیلوں اور عالم پناہ تاج داروں سے ملاقات کرتے ہوئے حضرتِ آدم تک جا پہنچتے ہیں۔ مگر ضمیرِ آدم تک نہیں پہنچ سکتے۔ خودنوشت کا رواج کچھ اس لیے بھی نہ چل سکا کہ اس میں بسا اوقات کچھ "پردہ نشینوں" کے نام اور چند ایک ایسے "سخت مقامات" آجاتے ہیں جن سے لوگ دبے پاؤں گزر جانا پسند کرتے ہیں۔ "جہانِ دانش" ایک عام آدمی کی رودادِ حیات ہے عام بھی اتنا کہ بالکل ہی پچھلی صف کا آدمی مگر پھر بھی یہ روداد ایک ایسے عالی ہمت شخص کی روداد ہے جس نے زندگی کا تمام راستہ خود اپنے ہاتھوں سے چٹانیں کاٹ کاٹ کر بنایا ہے، میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مجموعی طور پر ابھی تک اس صنف پر جاگیرداروں کی "مونا پلی" قائم تھی۔ "جہانِ دانش" کی اشاعت سے اس "مونا پلی" پر اگر پہلی نہیں تو پہلی بھرپور ضرب یقیناً لگی ہے۔

احسان صاحب نے نثر بھی بہت لکھی ہے، لیکن ایک شاعر کی حیثیت سے ان کی شخصیت اتنی راسخ اور تناور ہو چکی ہے کہ ان کی نثر کی طرف نظر نہیں جاتی، مگر اپنی نظم کی طرح اپنی نثر میں بھی وہ کھری اور خوب صورت تشبیہات کے چراغ اس کثرت سے روشن کرتے چلے جاتے ہیں کہ بعض جھرمٹوں پر تو "میلہ چراغاں" کا سماں بندھ جاتا ہے۔ ان کے

ذخیرۂ الفاظ کی ندرت اور وسعت دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اردو کا یہ مزدور شاعر الفاظ کا بہت بڑا ساہوکار ہے۔ محنت کش طبقوں کے معمولات و محسوسات کی ترجمانی کے لیے آپ نے بے شمار "نشیں، پسماندہ، خوابیدہ اور پنشن یافتہ" لفظوں کو جس محرمانہ انداز میں، دوبارہ "حاضر نوکری" پر کمربستہ کر دیا ہے۔ وہ آپ ہی کا حصہ ہے جس طرح ملتان کے چار تحفے گرد، گرما، گداد گورستان ہیں "جہانِ دانش" کے چار تحفے دانش، حوصلہ، صداقت اور اردو ہیں۔ اس کے پڑھنے سے آپ کھیت بھی اردو میں جوت سکتے ہیں اور پھاوڑا بھی اردو میں چلا سکتے ہیں۔ مجھ کو اس کے مطالعہ سے ایسا لگا کہ اردو میری بیٹھک سے اٹھ کر میرے باورچی خانے میں آگئی ہے۔ ممکن ہے بعض نقاد کہیں کہ صاحب فلاں لفظ کا ندھلے کا لفظ ہے، لکھنؤ کا نہیں دہلی والوں نے فلاں لفظ کا مزار اداغ کے وقت سے حقہ پانی بند کر رکھا ہے۔ ادب کی ایسی تنگ چڑھی بحثیں اپنی جگہ پر سہی، ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ "جہانِ دانش" سے "جہانِ اردو" کو وسعت ملی ہے۔ نیز وسعت نہیں، زیبائی و رعنائی کا وہ تخلیقی پیرہن بھی ملا ہے، جس کے لمس سے کھردری چٹانوں کی یہ حکایت شبنم اور ریشم کے لہجے میں بیان ہو گئی ہے۔

احسان صاحب کی زندگی آبِ رکنا باد کی گلگشت نہیں، کھردری چٹانوں کا دشوار گزار سلسلہ ہے، لیکن اس بیابان میں رومان کا ایک لمبا چوڑا، سچ مچ کا نخلستان بھی پایا جاتا ہے۔ یہ شمعی طوائف سے ان کے ربط و ضبط کی داستان ہے۔ مجھے معلوم نہیں احسان صاحب اپنی روزمرہ کی نجی زندگی میں سچ بولنے کی کتنی عادت اور قدرت رکھتے ہیں۔ مگر سرگزشت کی دھڑکنوں میں صداقت کا شعلہ برابر فروزاں نظر آتا ہے جو اس کتاب کی سب سے نمایاں خوبی ہے۔ شمعی کا واقعہ بھی انہوں نے کسی لگی لپٹی کے بغیر کھول کر قارئین کے سامنے رکھ دیا ہے شمعی ایک طوائف تھی، مگر ان کے کھینچے ہوئے اس کے باطنی سراپے کے مطابق ــــــ اس میں طوائفیت نہیں آئی تھی۔ شب و روز اخلاقی

کوچوں میں رہنے کے باوجود شرافت سے دستبردار نہیں ہوئی تھی۔"

وہ نہایت شستہ ادبی ذوق رکھتی تھی۔ بے شمار منتخب اشعار اس کو ازبر تھے احسان صاحب کے نام اس کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نثر بھی نہایت عمدہ لکھ لیتی تھی۔ وہ ایک امیر عورت بھی تھی۔

شمی ان سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھی۔ وہ بے چاری تو اپنا سب کچھ ان پر نچھاور کرنے پر تلی ہوئی تھی، بلکہ ایک موقع پر جب آپ کاندھلے سے لاہور اٹھ آئے تھے۔ تو ان کی سفارش پر شمی ان کے ایک لاہوری دوست محمد شفیع سے عقد کرنے پر بھی آمادہ ہوگئی تھی۔ تاکہ کسی طور احسان صاحب کا قرب تو حاصل رہے۔ احسان صاحب بھی ہر چند دل میں اس کے لیے نہایت "نرم گوشہ" رکھتے تھے۔ مگر تعلقِ خاطر کے اس احساس کو انہوں نے انس و ہمدردی کے جذبے سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ وہ تو خیر آٹھوں پہر ان کی راہ تکتی رہتی تھی۔ یہ بھی اس کے ہاں جاتے، تو آرام کرسی پر بیٹھتے، چائے پیتے، کتابیں پڑھتے، مگر جوانی اور امنگوں کے بھرپور برساتوں کے درمیان معاملات کبھی "شرارت" کے مرحلے تک نہ پہنچے۔ وہ بارہا (جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے) سر جھکائے پھولوں سے لدی ہوئی چنبیلی کی طرح ——— ان کے ——— "بازوؤں کے نیم دائرے میں" بھی نظر آتی رہی۔ مگر ان کا ہاتھ کبھی بے ٹھکانا نہ پڑا۔ ان کے اس رویے پر یک گونہ حیرت بھی ہوئی ہے کہ اس طرح کا مرنجاں مرنج عشق کرنا گوشت پوست کے ایک عام جوان آدمی کے قابو کی چیز نہیں بالخصوص جبکہ ؎

وہ کہے پی آج تو تھوڑی سی پی میرے لیے

مگر پھر اسی رویے سے دل میں ان کی وقعت اور عظمت کا اضافہ بھی ہوتا ہے۔ ان کے مضبوط قوتِ ارادی، ان کے محکم ضابطۂ اخلاق اور ان کی غیر متزلزل انفرادیت کا قائل ہونا پڑے گا۔ دیکھیے کیسی کڑی آزمائش سے کتنی استقامت و سلامتی کے ساتھ

گزر گئے۔ منجدھار میں کھڑے رہے اور دامن کو تر نہ ہونے دیا۔ رہی حیرت کی بات تو اس کے ازالے کے لیے انہی کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

اس کی جانب سے تو ہے دعوتِ دیدار مجھے
کر نہ دیں میری نگاہیں کہیں انکار مجھے

ایک اور شعر میں تو مجھ جیسے "متحیران" کو گویا براہِ راست ٹھوکا دے کر ارشاد فرمایا ہے ؎

جس کا مدت سے ہے شیشے کے مکانوں میں رواج
ہم پہ اس عشق کی تہمت نہ لگائی جائے

زندگی کے واقعات سے ظاہر ہے کہ تاریخی تسلسل ہی سے لکھے گئے ہیں، مگر احسان صاحب سن و سال کے جھنجھٹ میں نہیں پڑتے، سو یہ تو پتہ چل جاتا ہے کہ آپ پہلی بار کاندھلہ سے لاہور کون سی ریل گاڑی میں آئے تھے۔ مگر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آپ کس سال میں وارد ہوئے؟ بہرحال "جہانِ دانش" ان کے لگ بھگ نصف صدی کے تجربات و مشاہدات کا مرقع ہے۔ جس میں ایک اہم ادبی ماحول اور معاشرے کے عوامی دھارے کی چلتی پھرتی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی بھرپور ادبی زندگی کے باعث کتاب کا ایک سیکشن بجا طور پر "آل انڈیا مشاعروں" کے لیے وقف ہوگیا ہے۔ قاری ان کی انگلی پکڑے پکڑے پورے ہندوستان میں گھوم کر مشاہیر، اکابر شعراء سے ملاقات کر لیتا ہے، مگر چونکہ ایک مشاعرہ دوسرے مشاعرے سے چنداں مختلف نہیں ہوتا، بلکہ شعراء کا لباس اور طرزِ نشست و برخاست بھی تقریباً یکساں ہوتی ہے۔ لہٰذا قدرتی طور پر اس سیکشن میں قدرے یکسانیت کا احساس ہوتا ہے جیسے کوئی بہت بڑا مشاعرہ اس طرح جم جائے کہ اکھڑنے میں نہ آئے۔

احسان صاحب کا دور نہایت اہم سیاسی تحریکات کا دور تھا۔ توقع تھی کہ وہ

اس رُخ پر بھی بھرپور نگاہ ڈالیں گے، مگر ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے اپنے ذہنی سفر کو ادب کی شاہراہ تک ہی محدود رکھا ہے یا ممکن ہے کہ ان مباحث کو کتاب کے دوسرے حصے کے لیے اٹھا رکھا ہو۔ بہرحال اس بات میں شبہ نہیں کیا ولولۂ حیات اور کیا محاسنِ ادب" جہانِ دانش" اس دور کی اہم اور یادگار تصنیفات میں شمار ہوگی۔

ان کی زندگی ایک شدید اور مسلسل جدوجہد کی روداد ہے۔ سٹالن گراڈ کی لڑائی کی طرح ان کو ایک ایک قدم پر جنگ لڑنی پڑی ہے۔ افلاس کے خلاف، جہالت کے خلاف، ظلم کے خلاف اور ناانصافی کے خلاف۔ یہ کانٹوں پر تڑپ کر پھول تخلیق کرنے کی داستان ہے۔ بیشک تاریخ میں اس سے زیادہ کٹھن اور نتائج کے اعتبار سے کہیں زیادہ بارآور جدوجہد کی مثالیں موجود ہیں۔ دانش و حکمت اور خود شعر و ادب کے لحاظ سے بھی کتنے ہی بلند تر اور روشن تر مینار موجود ہیں۔ مگر ایسے لوگوں کی تعداد شاید اتنی زیادہ نہ ہو جنہوں نے ان کے جیسے حالات میں قلم و قرطاس کی ہمدمی کو اپنا نصب العین بنایا ہو اور اس میں درجۂ کمال حاصل کیا ہو ان کی طرح کے مزدوروں کو ہم نے لکھ پتی ٹھیکیدار بنتے دیکھا ہے۔ لیکن احسان دانش نے عمر بھر شعر و ادب کا کوہ کن رہنا پسند کیا۔ ان کی ساری عمر سخت پتھر توڑنے میں گزر گئی۔ مگر انہوں نے اپنے ضمیر کو، اپنے فقر کو کسی قیمت پر نہیں بیچا، اور ہم ان کی تحصیلِ علم کی اسی امٹ لگن اور فقرِ غیور کی اسی قلندرانہ ادا پر فریفتہ ہیں، انہی کا ایک شعر ہے ؎

جانے کیوں اس ایک ہی صورت پہ مچلی ہے نظر
شہر میں ہیں گندمی مٹی کے پیکر اور بھی

آوازِ دوست کی چند لہریں

علمی و ادبی حلقوں میں" آوازِ دوست" کے مصنف کا آوازہ چند برس پیشتر" مینارِ پاکستان" کے مضمون کی اشاعت پر بلند ہوا تھا۔ اس سے پہلے ان کی تقریروں کا شہرہ تھا مگر یہ چرچا مخصوص ادبی و تہذیبی محفلوں تک ہی محدود تھا۔" مینارِ پاکستان" پر ان کا مضمون شائع ہوا تو سچی بات یہ ہے کہ" عنوان" دیکھ کر ماتھا کچھ تھوڑا سا ٹھنکا بھی تھا کہ کہیں تعمیراتی کمیٹی کے سربراہ کی رپورٹ ہی نہ ہو اور سرکاری رپورٹوں میں عموماً مواد کم اور ملبہ زیادہ ہوتا ہے۔ ملازمت میں یوں بھی، اکثر کلالیو کے ہاتھوں" کارلائل" کا گلا گھٹ کر رہتا ہے۔

مختار مسعود کے بارے میں یہ گمان تو نہ تھا کہ وہ چندے میں سمیٹی ہوئی عام کینڈے کی کوئی ایسی جامد رپورٹ لکھیں گے جس کے پڑھنے سے ٹھیکیداروں کا بھلا ہو گا لیکن تکنیکی اور بالخصوص تاریخی پہلو سے اس موضوع میں کچھ ایسے" مقاماتِ آہ و فغاں" بھی آتے تھے کہ جب تک ایک ہاتھ میں قلم اور دوسرے میں علم نہ ہو، آدمی ان مقامات سے گزر نہ سکتا تھا، یہ مینار خشت و سنگ کا کوئی عام انبار نہ تھا۔ یہ تو جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے ——" ہماری نظریاتی تاریخ کی ضرورت، تحریکِ آزادی کی علامت، دین کی سرفرازی کا گواہ اور ہماری تاریخ کا نشانِ خیر ہے" —— اس کے بارے میں کچھ لکھتے ہوئے یہ احتیاط از حد ضروری تھی کہ" مینارِ پاکستان" لکھتے لکھتے کہیں" گلبرگ" نہ لکھ دیا جائے۔

ارادت اور عبث کی داستانیں اپنی جگہ پر اہم تو بے شک ہوتی ہیں مگر اکثر کچھ ایسی دلچسپ نہیں ہوتیں۔ مینار بنانا مشکل ہی سہی" مینار پڑھوانا" بھی کوئی آسان کام نہ تھا۔ لیکن ان کا مضمون ہمارے ادب میں بھی مینارۂ نور ثابت ہوا۔

محض ایک کتاب لکھنے پر تو کئی اہلِ قلم کو وسیع شہرت و قبولیت ملی ہے مثلاً ابھی چند روز پیشتر کرنل محمد خاں نے جنہیں اردو ادب کا جنرل رومیل کہنا غلط نہ ہوگا "بجنگ آمد" لکھ کر دنیائے ادب کو اچانک ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ لیکن صرف ایک مضمون لکھنے پر اس طرح کا امتیاز میری محدود معلومات کے مطابق ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے بعد شاید مختار مسعود ہی کے حصے میں آیا ہے۔ شوکت تھانوی کی "سودیشی ریل" نے بھی دُور دُور تک ارتعاش پیدا کیا تھا۔ لیکن اس مضمون کی نوعیت قطعاً مختلف تھی۔

"آوازِ دوست" کو ہم نے شوق سے بھی پڑھا اور شُبہ سے بھی، ہم نے ابھی تک ان کی چند تقریریں ہی سنی تھیں، وہ بھی شدہ شدہ، لمبے لمبے وقفوں کے بعد۔ ان کی تقریر کا سبھاؤ اور تھا۔ ہر موضوع پر اعلیٰ "پی ڈگری" (PIDIGREE) کے چاق و چوبند، نک سک سے درست، ہم وزن، ہمنوا اور ہم زلف الفاظ ہاتھ باندھ کر ان کے سامنے حاضر رہتے تھے۔ خطابت کا طنطنہ معنویت کے بطن سے ابھرتا تھا گویا گن پر سوار آتی تھی۔ یہ نہیں کہ برانچ ریلوے لائن کے انجنوں کی طرح بھاپ زیادہ اُگلیں اور فاصلہ کم طے کریں۔ ان کی تقریریں سن کر بعض اوقات حیرت ہوتی کہ جب وہ ایک ایک لفظ کو پہلے روئی کے پُولے کی طرح نرم کرتے ہیں اور پھر گویا باقاعدہ کسی فیتے سے ناپ ناپ کر بولتے ہیں تو شعر کیوں نہیں کہتے۔ آج کل تو بعض باقاعدہ شاعروں نے بھی شعر کے فنی مطالبات کی جانب جارحانہ بے پرواہی کا کم و بیش وہی رویّہ اختیار کر رکھا ہے جس کی جھلک پنجابی زبان کے کسی شاعر کے اس مصرعہ میں ملتی ہے

ع: میم: مرجانا جگ چھڈ دینا، دنیا ٹنگ جانی اُتے کیکاں دے

مختار مسعود نے ایک جگہ لکھا ہے ——— "بڑے آدمی جتنے کتابوں میں ملتے ہیں اتنے زندگی میں نہیں ملتے" ——— یہی بات ذرا تصرف کے ساتھ خطیبوں کے بارے میں اس طرح کہی جا سکتی ہے کہ ——— "بڑے خطیب جتنے زندگی میں ملتے ہیں اتنے کتابوں میں نہیں ملتے"۔ تقریر کا پڑھا، عموماً تحریر میں اتر جاتا ہے۔ فکر و فن کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کتاب ہی سے ہوتا ہے۔ کتاب وہ ظالم چیز ہے کہ مصنف کے بارے میں بے لاگ گواہی دے ڈالتی ہے جس طرح میدانِ حشر میں انسانوں کے اعضا انسانوں کے بارے میں دیں گے۔ مختار مسعود کے متعلق سرگرمیوں میں ہی سہی مگر بات یہ بھی سننے میں آتی تھی کہ جناب سارا مسالہ تو وہ مینار میں بھر چکے ہیں اب لکھیں تو کیا لکھیں؟

مگر کتاب دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ان کے فکر و فن کی زرخیزی اور دلآویزی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے بلکہ اب تو وہ مینار پر بھی بیٹھے ہیں اور دوربین بھی لگا رکھی ہے کسی موضوع پر لکھنے کے دو ہی معروف طریقے ہیں، ایک تو باقاعدہ منصوبہ بندی والا، وہ سائنٹفک طریقہ ہے جو شہرۂ آفاق مفکر اور مورخ پروفیسر ٹائن بی نے تجویز کیا ہے اور مختار مسعود نے جن کا خلاصہ یوں بیان کیا ہے کہ ——— "مسئلہ زیرِ بحث پر خوب سوچیے اور جب موضوع پر پوری گرفت ہو جائے اور اس کا خاطر خواہ خاکہ ذہن میں آجائے تو پھر اس کے جز بنائیے، یہاں تک کہ وہ اکائی آجائے کہ جس پر آپ پڑھنا بند اور لکھنا شروع کر دیں۔

"پرورشِ لوح و قلم" کا دوسرا طریقہ ہم سے "اہلِ توکل" کا ہے کہ ؎

ذوقِ اس بحرِ فنا میں کشتیٔ عمرِ رواں
جس جگہ پر جا لگی وہ ہی کنارہ ہو گیا

یعنی جب کبھی لکھنے کی "ایمرجنسی" (EMERGENCY) لاحق ہوئی قلم اٹھا کر

لکھنا شروع کر دیا اور جس نقطے پر، معلومات، حافظے یا ہاتھوں نے جواب دے دیا۔ وہیں ہتھیار ڈال دیئے مگر جب "آوازِ دوست" کا مطالعہ کیا تو خدا کا شکر ادا کیا کہ اس میں خیال و فکر کی اکائیاں، دہائیوں کے حساب سے ملتی ہیں آپ جس کی بھی انگلی پکڑ لیں بیشک میلوں چلتے جایئے۔

خیال و فکر کی پہلی اکائی "انتساب" ہی میں دیکھ لیجیے۔ کتاب والدہ مرحومہ اور والد مرحوم کی یاد سے منسوب کی گئی ہے، نام سے نہیں، قبر سے۔ قبر بھی کہاں؟ "ایک پرِ کاہ" اور ایک پارۂ سنگ کے نام۔ وہ "پرِ کاہ" جو والدہ مرحومہ کی قبر پہ اُگنے والی گھاس کی پہلی پتی تھی ——— اور وہ پارۂ سنگ" جو والد مرحوم کا لوحِ مزار ہے"۔ "انتساب" پڑھ کر مجھے تو ایسا لگا جیسے گھاس کی وہ ننھی سی پتی جو سینکڑوں من مٹی کا سینہ چیر کر ابھر آئی تھی، بیٹے کے لیے ماما کی دعا بھی تھی۔ اور پیغام بھی ——— دعا کہ بیٹا تجھ کو پاک پروردگار زندگی میں ہمیشہ ہرا بھرا رکھے ——— اور پیغام ——— کہ زندگی کی نشوونما کا عمل کبھی رُکتا نہیں۔

میرا چھوٹا بیٹا امتنان انٹرمیڈیٹ کے دوسرے درجے میں پڑھتا ہے وہ کرکٹ کے میدان میں کافی ہونہار اور ہمجولیوں کے حلقے میں خاصا مسخرا سمجھا جاتا ہے میں جب یہ کتاب پڑھ رہا تھا تو وہ باہر دالان میں کرکٹ کھیل رہا تھا۔ میں نے اسے اپنے پاس بلا کر "انتساب" کا صفحہ کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ "انتساب" کے لفظ سے تو وہ مانوس تھا البتہ "پرِ کاہ" اور "پارۂ سنگ" کے معنی اسے پوچھنے پڑے۔ معنی معلوم ہوئے تو چند لمحے کچھ سوچتا رہا۔ پھر یکایک بولا ——— "اباجی! یہ اپنے اباجی کو کبھی بھی آؤٹ (OUT) نہیں کرنا چاہتے"۔ وہ یہ جملہ کہہ کر بھاگ گیا۔ جب اس نے میری طرف دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں ایک ایسی گھٹا سی امنڈتی ہوئی نظر آئی جو آج کل کی نسل کے بچوں میں کبھی کبھی ہی دکھائی دیتی ہے

دیباچہ نگاری میں آپ نے بالکل نئی شاہراہ کھولی ہے۔ یہ شاہراہ تو خیر کھلتے ہی

بند ہو جاتی ہے یہ کہنا چاہیے کہ ایک نئے رُخ پر ادبی ٹریفک کھول دیا ہے مختصر دیباچے ہم نے پہلے بھی دیکھے ہیں لیکن اس جیسا "اڑدپر سفیدی" کے برابر دیباچہ ہماری نظر سے پہلے نہیں گزرا۔ انہوں نے گویا "السلام علیکم" کہہ کر کتاب کی کنجی قاری کے ہاتھ میں تھما دی ہے۔ کہ

ع اب مجھے ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

ایجاز کا یہ انداز کتاب میں ہر جگہ موجود ہے۔ الفاظ کی کفایت سے ایسا لگتا ہے کہ جیسے ان کو ایک ایک لفظ خرید کر لکھنا پڑا ہے۔ البتہ وہ لوگ جو گھنی اور گہری بات تک نہیں پہنچ سکتے وہ ممکن ہے کہ ان کے دیباچے سے یہی سمجھیں کہ آپ نے مشہور گلوکارہ تصور خانم کے گائے ہوئے اس مقبول پنجابی گیت کو مشکل اردو میں ڈھال دیا ہے، جس کے مکھڑے کے بول کچھ اس طرح سے ہیں ؎

اوئے میں کہیا گل سُن جا!
نئیں نئیں کچ نہیں!

جا! جا!

"آوازِ دوست" میں اس کے دو معانی شامل ہیں۔ ایک تو وہی "مینارِ پاکستان" اور دوسرا "قحط الرّجال" دوسرے مضمون میں انہوں نے چند ممتاز و نامور شخصیتوں کے بارے میں اپنے تاثرات قلمبند کیے ہیں۔ شخصیتیں مختلف ہیں مگر کہانی مربوط ہے۔ شخصیتوں کی حکایت ان کے "آٹوگراف البم" کے ساتھ ساتھ گھومتی ہے جو آپ نے ۱۹۳۵ء میں علی گڑھ کے ایک ہندو فوٹوگرافر ورما کی دکان سے چھ آنے میں خریدا تھا۔ ان سے متعلق دو ایک ذاتی باتیں بھی یہیں سن لیجیے ——— آپ شہرِ اقبال میں پیدا ہوئے ذہنی طور پر رہائش بھی شہرِ اقبال میں رکھتے ہیں۔ پہلی سے سولہویں جماعت تک جو کچھ بھی پاس کیا، علی گڑھ میں پاس کیا۔ جہاں ان کے نامور والد اور "اقبال نامہ" کے فاضل مولف پروفیسر شیخ عطاء اللہ صاحب مرحوم اقتصادیات کے استاد بھی تھے۔ علی گڑھ میں آپ طلبہ کی اس نسل میں شامل تھے جس نے قائداعظم کی گاڑی کھینچی تھی

اور مولانا ابوالکلام آزاد کی ریل گاڑی رو کی تھی۔

علی گڑھ اسلامی ہند کا معروف ترین علمی اور تہذیبی گہوارہ تھا۔ ہر ریل گاڑی سے اگر دو مشاہیر وہاں اترتے تھے، تو چار سوار ہوتے تھے، مشاہیر بھی سولہ آنے کھرے مشاہیر کہ ان میں جیسا کہ مختار مسعود نے بڑے آدمیوں کی شناخت کے سلسلے میں لکھا ہے۔ "ایک پوری نسل اپنا سراپا دیکھ لے۔ آج کی طرح کے محض "مشتہر مشاہیر" نہیں کہ جن کی شہرت میں بقول ان کے "صرف قوتِ خرید کو دخل ہوتا ہے"۔ علی گڑھ میں تو البم کی "ذخیرہ اندوزی" کی رفتار خاصی تیز رہی مگر قیامِ پاکستان کے بعد اس میں وہ گہما گہمی نظر نہیں آئی۔ کچھ تو اب لوگ ہی چھوٹے ہو گئے ہیں اور کچھ اتنے میں یہ خود بڑے ہو گئے تھے۔ پاکستان میں قحط الرجال کے سناٹے کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ نے لکھا ہے "پہلے بیس سالوں میں مائیں صرف افسر اور تاجر جنتی رہیں" اقبال نے بہت پہلے اس حقیقت کی نشان دہی اس طرح فرمائی تھی ؎

وائے اُں، قومے کہ سلطان زاد و درویشے نزاد

کتاب میں جن جن لوگوں کا تذکرہ آیا ہے، وہ سب لوگ ان کے "ہیرو" نہیں ہیں۔ مجھے تو ان میں صرف ایک شخصیت نظر آتی ہے۔ جس کی راہ میں دیدہ و دل بچھاتے ہوئے انہوں نے اپنے پاس کچھ بچا کر نہیں رکھا، وہ ہے قائداعظم کی شخصیت۔ مسلسل تذکرہ ان کا بھی چند صفحوں سے زائد نہ ہوگا۔ مگر ان کی خوشبو پوری کتاب میں بسی ہوئی ہے۔

شخصیات کی فہرست سے ان کی ذہنی ترجیحات کی نشان دہی یقیناً ہوتی ہے۔ دو چار کے سوا باقی سب اصحاب برصغیر میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے ستون تھے۔ حق گوئی اور بے باکی ان کا شیوہ تھا، خدا اور خدا کے رسولؐ کے فدائی، حریت خواہی اور حق گوئی کے لیے جس نے جتنی زیادہ ابتلا برداشت کی، وہ اتنے ہی زیادہ نمبروں پر پاس ہو رہا ہے۔ درویشوں اور قلندروں اور شاعروں کی لین ڈوری لگی ہوئی ہے۔

ان بوریا نشینوں میں نواب حمید اللہ خاں والیٔ بھوپال کو دیکھ کر قدرے تعجب

ہوتا ہے۔ مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال جیسے مردِ قلندر نے "ضربِ کلیم" میں اپنا تمام تر سرمایہ بہارا سی حمید اللہ خان کے نام منسوب کر رکھا ہے تو یہ تعجب دور ہو جاتا ہے۔ اصل حقیقت غالباً وہی ہے جس کی طرف مختار مسعود نے اس طرح اشارہ کیا ہے۔ کہ بڑے آدمی ——— "الحکم کی طرح بادشاہ بھی ہوتے ہیں اور اقبال کی طرح درویش بھی"۔ ضرورت دراصل ایسے آئینوں کی ہے کہ ؏

دیکھ سکتے ہوں جو باطن کو بھی ظاہر کی طرح

پھر سو باتوں کی ایک بات یہ کہ حمید اللہ خان اپنی والدہ سلطان جہاں بیگم کے قدموں میں دفن ہیں۔ والدین کے لیے تقدیس و تکریم، ارادت و محبت کا جذبہ مختار مسعود کے نظامِ زندگی میں جو اہم مقام رکھتا ہے، اس کی ایک جھلک ہم "انتساب" میں دیکھ چکے ہیں۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری مسٹر او تھانٹ لاہور ایئرپورٹ پر ان کے پہلو میں بیٹھے رہے مگر ان کے دل میں ان کے آٹوگراف لینے کی خواہش پیدا نہ ہوئی۔ البتہ کئی برس بعد جب ایک جاپانی رسالہ میں انہوں نے او تھانٹ کی ایک تصویر دیکھی کہ وہ برما میں اپنے آبائی گاؤں میں ہیں، ان کی سادہ بوڑھی ماں اپنے سادہ سے دیہاتی کرتے لاچے میں ملبوس ایک اونچی کرسی پر ننگے پاؤں بیٹھی ہے اور او تھانٹ ماں کے قدموں میں سجدہ ریز پڑا ہے۔ تو وہ دن اور آج کا دن مختار مسعود اس موقع کا انتظار کر رہے ہیں کہ او تھانٹ کہیں انہیں مل جائیں اور یہ البم کھول کر ان کے سامنے رکھ دیں۔

خطابت سے چونکہ آپ خود گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔ لہٰذا خطابت کا غیر معمولی جوہر ان کے اکثر ممدوحین میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ سروجنی نائیڈو کی تربیت میں اگرچہ انہیں "گنگا جل سے زیادہ زم زم کی تاثیر" نظر آتی ہے لیکن وہ "بلبلِ ہند" ہونے کی وجہ سے بھی "داخلِ حسنات" ہو گئی ہیں۔ مغربی مشاہیر میں سے (PASSAGE TO INDIA) کے مصنف مسٹر فاسٹر (FASTER) اور پروفیسر آرنلڈ ٹائن بی ہیں۔ فاسٹر کے اندازِ تحریر میں چابکدستی

اور ایجاز کا اعجاز ـــــ انہیں مرغوب ہے، پھر یہ بھی کہ فاسٹر صاحب کو مسلمانوں کی مسجدیں پسند تھیں اور علی گڑھ بھی پسند تھا۔ اور علی گڑھ کی محبت ان کے ہاں کوئی ضمنی چیز نہیں ہے علی گڑھ کی ٹوپی اور شیروانی کو وہ تحریک پاکستان اور مساواتِ اسلامی کا سمبل سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ـــــ قائداعظم کا ظہور درس گاہِ سرسید اور شعرِ اقبال کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔" آوازِ دوست" میں وہ اپنی جن محبتوں کو آوازیں دیتے ہیں، ان میں ایک محبت کا نام علی گڑھ بھی ہے ۱۹۴۸ء میں وہ پاکستان میں علی گڑھ سمیت واپس آئے ہیں۔

پروفیسر ٹائن بی سے ان کی ملاقات ملتان میں ہوئی۔ گویا کنواں، خود چل کر پیاسے کے پاس آگیا۔ کتاب میں قوموں اور تہذیبوں کے عروج و زوال کی جو بحث اٹھائی گئی ہے اس ٹائن بی کا تذکرہ بول ناگزیر تھا۔ کہ موصوف کے حوالے کے بغیر عروج و زوال کا کوئی "گراف" سمجھ میں ہی نہیں آتا۔

شخصیتوں کے انتخاب میں وہ شروع سے ہی ایک خاص "پیمانۂ امروز و فردا" سے لیس نظر آتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر کے آپ معترف ہیں، ادبی لحاظ سے "آوازِ دوست" کی قریب ترین مماثلت اگر کسی کتاب میں ملتی ہے تو میرے خیال میں وہ "غبارِ خاطر" ہے یہ آوازِ دوست" ہے وہ دوست کے نام خطوط ہیں ان کا اپنا اسلوبِ نگارش بھی بالخصوص لسانی تشکیلات کے شکوہ اور تمکنت میں مولانا آزاد کے اسلوبِ نگارش کا "دستار بدل بھائی" معلوم ہوتا ہے لیکن ۱۹۴۸ء میں جب مولانا آزاد وزیرِ تعلیم کی حیثیت سے علیگڑھ آئے تو مختار مسعود نے ان کے ہاتھ سے ایم اے کی ڈگری مع تمغۂ امتیاز تو وصول کر لی لیکن اپنے البم میں مولانا کے آٹوگراف کے لیے کوئی تحریک ان کے دل میں نہ پیدا ہوئی۔

ان کے شخصی تذکروں کو معروف انداز میں لکھے ہوئے سوانحی خاکے کہنا شائد درست نہ ہو یہ تاثراتی جائزے بلکہ زاویے ہیں۔ ان کے کسی ممدوح کے بارے میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ موصوف ناشتے میں انڈا کھاتے تھے یا نہیں۔ ان کے ہاں مولانا ظفر علی خان ایک جذبے کا نام ہے۔ مولانا حسرت موہانی ایک طرزِ زندگی اور بہادر یار جنگ ایک تحریک ہیں قائداعظم کے پیچھے شہاب الدین غوری تک ہماری پوری تاریخ اور "مینارِ پاکستان" کے پیچھے مسجد بنی امیہ کے مینار تک نہ جانے کتنے مینار جھانکتے دکھائی دیتے ہیں انہوں نے شخصیتوں کے ناموں پر علیحدہ علیحدہ باب باندھ کر تذکرہ نہیں لکھا کیونکہ ان کے نزدیک "اگر ایک بے بہا جذبے کا نام دے دیا جائے تو اس کی قیمت گر جاتی ہے۔"

"آوازِ دوست" ایک علمی اور فکری کاوش ہے جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اس کی بنیادی اکائی مختصر "ایہ" ہے کہ ایک قوم کی حیثیت سے ہم کون ہیں؟ ہم کیوں ہیں۔ اور اس ضمن میں وہ اس نظریے پر ایمان رکھتے ہیں کہ ـــــ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کلمۂ توحید ہے، وطن نہیں اور نہ ہی نسل ہے" مزید برآں یہ بھی کہ ـــــ "نظریے کی جگہ دل میں ہے اور مملکت کی نقشے پر، سرحدیں مختلف ادوار میں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں۔ نظریہ تو بنیاد ہے جو ہمیشہ کے لیے بھری جا چکی۔"

مختار مسعود کی باتوں میں قطعیت کی دھوپ تیز رہتی ہے وہ دھند میں "ٹینس کھیلنے" کے قائل نہیں ہیں پوری کتاب میں کوئی ایک جملہ بھی ایسا نظر نہیں آتا جس کی داڑھی چوٹی میں الجھی ہوئی ہو۔ وضاحت اور ذمہ داری ان کی تحریر کا خاصہ ہے مگر یہ کتاب تو انہوں نے جیسے تاریخ کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر لکھی ہے۔ الفاظ جیسے ناقص وسیلۂ ابلاغ و اظہار کو کامل طریق پر استعمال کرنا بڑی ریاضت اور جاں کاہی کا آرٹ ہے۔ مختار مسعود کو اس آرٹ پر غیر معمولی دسترس حاصل ہے۔ ایک ادا ان کی یہ بھی ہے کہ شاہراہ پہ چلتے چلتے اچانک بغل کی کسی گلی میں نکل جاتے ہیں۔ دو ایک لمحوں کے لیے ایسا بھی لگتا ہے کہ مینار کے کواڑ مقفل کر کے مسجد قرطبہ کی طرف چلے گئے ہیں، لیکن درحقیقت وہ اپنے نصب العین کو ایک لمحے کے لیے اوجھل نہیں ہونے دیتے اور ہر نفسِ مضمون پر ان کی گرفت اتنی مضبوط اور مسلسل ہوتی ہے کہ جیسے شیر شاہ سوری ـــــ ہمایوں کا تعاقب کر رہا ہو۔

مینار کی رُوداد ہو یا افراد کی حکایت، وہ ان کا تذکرہ تاریخ میں کرتے ہیں۔ علم تجربات کو یاد رکھنے کا نام ہے ان کا حاضر باش حافظہ، فکر انگیز اور دلچسپ معلومات و حکایات، تجربات و مشاہدات کا ایک وسیع مگر منظم "آرڈیننس ڈپو" ہے وہ اپنے بیان میں اس ذخیرۂ علم و خبر کی چاشنی اور چمک کچھ ایسی چابک دستی سے گھولتے چلے جاتے ہیں کہ اگر ایک اینٹ مینار پر رکھتے ہیں تو دو پھول قاری کے ذہن میں کھل اٹھتے ہیں۔ ہر چوتھی پانچویں سیڑھی کے بعد ایک دریچہ تاریخ و تہذیب کے نخلستانوں کی طرف کھول دیتے ہیں، مینار کے علاوہ پوری دیوار گھما لاتے ہیں۔ مگر جب ہم مینار کی "سربرجی" میں پہنچتے ہیں۔ تو یوں لگتا ہے جیسے تین سو سیڑھیاں، قدم بہ قدم، چڑھ کر نہیں آئے بلکہ "لفٹ" میں بیٹھ کر آ گئے ہیں۔

شخصیتوں کے باب میں بھی اگرچہ براہِ راست روئے سخن تو چند اکابر ہی سے رکھا ہے مگر وقفہ بہ وقفہ "غیر حاضر مشاہیر" بھی تشریف لاتے رہتے ہیں۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ مشہور و معروف لوگ، اہلِ کمال اور اہلِ جمال یونہی چھڑی گھماتے ہوئے ٹہلتے ٹہلتے اتفاقاً ادھر آ نکلے ہیں جو کوئی آتا ہے اس کے ہاتھ میں دانش و حکمت کی لالٹین ہوتی ہے۔ یا حسن و خوبی کا گلدستہ اور وہ جلد جلد کچھ روشنی دکھا کر یا چند پھول دے کر تاریخ کے صفحات میں لوٹ جاتا ہے۔ مثلاً ابوالفتح ہمدانی کی آمد سے پتہ چلتا ہے کہ صاحبِ موصوف جن دنوں "جامع التواریخ" لکھ رہے تھے وہ کوئی فری لانس (FREE LANCE) منشی نہ تھے بلکہ اپنے ملک کے وزیرِ اعظم تھے، ایک غیر معروف شخص کی ایک بات سن کر تو ہم دنگ ہی رہ گئے۔ بلکہ کچھ آزردہ بھی ہوئے اس شخص نے سر ونسٹن چرچل کی جوانی کے زمانے میں ان کے بارے میں کہا تھا ـــــ "کچھ عجب نہیں کہ چرچل کسی روز انگلستان کی شکست اور اگلستان کے درمیان حائل ہو جائے"۔ اس پر ہمارے دل سے بے اختیار آواز آئی ـــــ "اے کاش!

ہمیں بھی کوئی ایسا شخص میسر آتا۔ جو پاکستان کی شکست کے درمیان حائل ہو جاتا"۔ یہ تو خیر سر راہے ایک بات آ گئی۔ کہنا یہ تھا کہ وہ اپنے ہوا کی طرح کے سبک سیر انداز بیان میں بھاری بھرکم مضامین کو ایسے لطیف و دل کشا پیرائے میں ادا کر جاتے ہیں۔ کہ آگہی تو ہوتی ہے۔ بوجھ نہیں ہوتا۔ ایک آدھ مقام پر ذائقے میں ذرا سی گرانی اور سلاست میں قدرے سٹوٹ محسوس ہوتی ہے مگر ؎

ناصحو! پند گرو! راہ گزر تو دیکھو!

یہ مقام فلسفہ و فکر کی سنگلاخ گھاٹیوں سے اٹھا ہوا وہ مقام ہے جہاں پروفیسر ٹائن بی کے ساتھ قوموں کے عروج و زوال کی "تیغ بردست و کفن در آستیں" بحث چل نکلی ہے پھر یوں بھی یہ کتاب مجھ جیسے طنز و مزاح کے گھس بیٹھوں" کی تفریحِ طبع کے لیے تو لکھی نہیں گئی یہ تو ایک قوم کے غور و فکر کے لیے لکھی گئی ہے۔ جس کا جسم شکست کے زخموں سے لہولہان ہے "آوازِ دوست" دراصل اس نغمۂ بے تاب کا ایک آہنگ ہے جس کے اندوہ کی نشان دہی اقبال کے ہاں اس طرح ملتی ہے ؎

نغمہ ام خوں گشت و از رگ ہائے ساز آید بروں

یہ کوئی ضروری نہیں کہ ان کے بھی افکار آرا سے اتفاق کیا جائے۔ علمی و فکری مباحث میں اختلاف و تاویل کی گنجائش ہمیشہ موجود ہوتی ہے۔ انہوں نے خود دوسروں کے افکار و آرا سے اختلاف کیا ہے پروٹوکال کی (PROTOCOL) کی باریکیوں کا اگرچہ وہ اس قدر خیال رکھتے ہیں کہ مثلاً انہوں نے اپنے البم میں چو این لائی کے دستخط محض اس لیے نہیں لیے کہ پہلے ماؤزے تنگ کے دستخط ہو لیں تو چو این لائی کے دستخط ہوں۔ دوسروں کے نقطۂ نظر پر بھی وہ ہمدردانہ نگاہ رکھتے ہیں۔ لیکن تحریک و تصورِ پاکستان کے اساسی اصولوں پر کوئی مفاہمت وہ ہرگز نہیں کرتے۔ ان کی اس "ذہنی محاذ آرائی" کا کچھ اندازہ مولانا ابوالکلام آزاد کے تذکرے سے ہوتا ہے۔ بہر حال جہاں تک ہمارے

ملی تشخص کے خدوخال تصورِ قومیت کے بنیادی عوامل، اور نظریہ و مملکت کے بنیادی رشتے کا تعلق ہے۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ نے اس موضوع پر نہایت مؤثر اور مدلل انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ آج ہم اپنی تاریخ کے بہت ہی نازک دَور سے گزر رہے ہیں یہ ایسا مرحلہ ہے جس میں کسی قوم کے اجتماعی ذہن کے کہر آلود ہو جانے اور قومی محور سے ٹوٹ جانے کا اندیشہ لاحق ہو سکتا ہے۔ مستقبل کے لیے ایک نیا اعتماد پیدا کیا جائے میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب اس اہم ملی فریضے کو بڑے محرمانہ انداز سے پورا کرتی ہے۔

موضوع کی نسبت سے کتابوں کی بزرگی اور افادیت سر آنکھوں پر، لیکن میں ذاتی طور پر قارئین کے جس قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں۔ اس کے نزدیک کتابیں صرف دو ہی قسم کی ہوتی ہیں ——— اچھی لکھی ہوئی یا بُری لکھی ہوئی، تحریر میں علم کے وزن کے ساتھ ساتھ اگر ادب کی چاشنی بھی موجود ہو تو وہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کی طرف پنجابی زبان کے غیر فانی شاعر حضرت میاں محمد بخش صاحبؒ نے اس طرح اشارہ فرمایا ہے ؏

دودھ اندر جاں کھنڈ ملائیے مٹھا ہوندا دونا

لیکن جس طرح ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں، اسی طرح کسی تحریر میں علمی ثقاہت اور ادبی لطافت کم ہی شیر و شکر نظر آئیں گی، عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ جو تصنیف فکر میں اونچی نکل گئی وہ فن میں نیچی رہ گئی مگر "آوازِ دوست" بیک وقت ایک خیال انگیز علمی کاوش بھی ہے اور ایک نہایت دلکش ادبی کارنامہ بھی۔ اور یہ اعجاز ہے ان کے اسلوبِ نگارش میں شگوفہ اور شگفتگی کے فنکارانہ امتزاج کا۔ ان کا شگوفہ بھی اگرچہ ایک طرح کی ریشمی ملائمت کا بنا ہے جو خوب صورت چیزوں کو خوب صورت پیرہن عطا کرتا چلا جاتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک ان کے اندازِ تحریر کی سب سے نمایاں خوبی شگفتگی کی وہ رواں دواں لہر ہے جس کی بدولت وہ حکیمانہ نکتوں کو ادیبانہ زبان میں اور

مرنے کی روداد کو زندگی کے لہجے میں بیان کر گئے ہیں۔ یہ ان کی نثر کی اس متبسم بانکپن کا کرشمہ ہے کہ مینارِ پاکستان" کے مقالے میں اقلیدسی شکلوں، رنگین لوحوں، غالب کاری، خاتم کاری کی باریک باریک تفصیلات کے باوجود مینار سے لپٹنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ درست ہے کہ مزاح کو وہ اپنی سنجیدہ نثر کے "اردلی" کے طور پر استعمال کرتے ہیں کہ جہاں ضرورت پڑے وہ آگے بڑھ کر وردی استری کر دے پٹی کس دے یا پیٹی چمکا دے۔ لیکن میرا ذاتی احساس یہ ہے کہ ان کی قدرتی آواز مزاح میں سنائی دیتی ہے۔ میرا پکا یقین ہے کہ وہ اگر اس صنف کو کھلے دل سے" گلاوہ مار کر" اپنی طرف کھینچ لیتے تو اردو ادب کو رشید احمد صدیقی اور مشتاق احمد یوسفی کے محاذ پر ایک اور اپنے علیحدہ جھنڈے والا جرنیل میسر آ جاتا۔ مگر مختار مسعود اپنی جگہ اس بات پر پکا یقین رکھتے ہیں کہ ——— "ہر شخص وہی ہوتا ہے جو وہ بنتا ہے اور ہر انسان صرف وہی بن سکتا ہے جو وہ ہوتا ہے"۔

"آوازِ دوست" کی اشاعت سے اردو نثر کو ایک نئی توانائی اور نیا اعتماد ملا ہے انہوں نے اردو نثر کے خوب صورت ترین پھولوں سے بوند بوند رنگ اور رس اور خوشبو جمع کر کے بات کہنے کا ایک نیا سلیقہ پیدا کیا ہے وہ اپنے جملوں کو ہیروں کی طرح تراشتے ہیں ان کی کوشش ہوتی ہے کہ بڑی سے بڑی بات ایک جملے بلکہ ایک لفظ میں ادا ہو جائے۔ ان کا بس چلے تو اول سے آخر تک ضرب الامثال لکھتے چلے جائیں۔ ان کے فقرے ان کے مافی الضمیر کے منجھے ہوئے سفیر ہوتے ہیں وہ ایسے ایسے معرکۃ الآرا جملے لکھتے ہیں کہ اس عہدِ تن آسانی میں اس طرح کے جملے لکھنے کا رواج ہی اٹھتا جا رہا ہے پیر و مرشد مولانا صلاح الدین احمد کے بعد ایک بار پھر ان کے اسٹائل کی چھب اور طرحداری نے اردو نثر کو اردو شاعری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے قابل بنا دیا ہے۔" آوازِ دوست" پر تبصرے کی بہترین اور آسان صورت یہ تھی کہ آدمی اس میں سے اقتباسات نقل کرتا چلا جائے لیکن اس کان جواہر میں سے چند جملے چھانٹ کر" اقربا پروری" کا

الزام کون مول لے ؟ اور پوری کتاب کی حق تلفی کیوں کی جائے ؟ میرا پختہ یقین ہے کہ جس زبان میں اس پایہ کی کتابیں لکھی جاسکتی ہوں اس کا مستقبل محفوظ اور اس کا ادب سربلند ہو جاتا ہے۔

اپنے تنوع اور توانائی کے لحاظ سے "آوازِ دوست" کو "علم کا پنج ند کہنا بے جا نہ ہوگا۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ لائبریرین اس کتاب کو کون سے خانے میں رکھے گا۔ لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یہ کتاب پاکستان کے ادب و تہذیب سے محبت رکھنے والے لوگوں کے "خانۂ دل" میں ملا کرے گی۔

میرے بچپن کے دنوں میں ہمارے گاؤں میں بابا فاضلو شاہ کے کھیت میں بیری کا ایک قد آور درخت ہوا کرتا تھا۔ پھل کی رُت آتی تو اس کی شاخیں بیروں سے اس طرح پروئی جاتیں کہ پتوں کی جگہ بھی بیر ہی بیر دکھائی دیتے۔ درخت کی جڑیں اپنی اپنی سوندھی زمین میں بہت گہری بہت دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور اس کے بیر بھی بہت ہوتے تھے اور بہت میٹھے اور رسیلے۔ اب بھی مجھے "آوازِ دوست" کے ہر صفحے پر بیری کا وہی بوٹا دکھائی دیتا ہے۔

(یہ مضمون ۲۷ جنوری ۱۹۷۳ء کو راولپنڈی میں "آوازِ دوست" کی افتتاحی تقریب میں پڑھا گیا)

اُردو ادب کا جنرل رومیل

کرنل محمد خان کی کتاب "بجنگ آمد" کی آمد آمد کا "بگل بجانے کے لیے جناب الطاف حسن قریشی (مدیر اردو ڈائجسٹ) نے آج جس تقریب کا اہتمام کیا ہے، اس میں کتاب کے مندرجات کے علاوہ، کرنل صاحب کی "وردی" یعنی ان کی شخصیت کا بھی جائزہ لیا جائے گا اور یہ فریضہ میرے اور کیپٹن (اب میجر) صدیق سالک کے سپرد ہوا ہے۔ تاکید یہ کی گئی ہے کہ ہم دونوں سپاہی، اپنی اپنی "روند" سے ادھر ادھر نہیں ہوں گے۔ اس مقصد کے لیے کرنل صاحب کو دو الگ الگ حصوں یا ابواب میں تقسیم کر کے ایک ایک باب ایک ایک آدمی کے سپرد کر دیا گیا ہے۔" بجنگ آمد" سے پہلے کا محمد خاں مجھ کو، اور بقیہ محمد خان صدیق سالک کو "الاٹ" ہوا ہے

غم مجھ کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

غم کا لفظ مصرعے میں بندھا ہوا بندھ گیا۔ ورنہ محمد خان کی شخصیت کے ساتھ ساتھ سفر کرنا شگفتگی سے قدم بقدم نخلستان میں سفر کرنا ہے۔ لیکن اس "باوردی موضوع" سے عہدہ برآ ہونا میرے لیے کوئی آسان کام نہیں۔ شخصیت کا رقبہ تو دیکھئے کہ کہاں سے کہاں تک پھیلا ہوا ہے؟ میدانی لائن آف کمیونیکیشن (LINE OF COMMUUNICATION) اتنی طویل اور کہیں کہیں اس قدر باریک اور

دشوار گزار ہے کہ بعض علاقوں میں سے گزر بھی نہیں سکتا۔ سو یہ جائزہ گویا ہوائی جہاز سے ایک چھچلتی ہوئی سی نظر کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہر شخص کی طرح، کرنل محمد خان کی شخصیت بھی، اپنے ماحول کی روایتوں، روشنی، مٹی اور ہوا اور پانی ہی سے صورت پذیر ہوئی ہے۔ میرے خیال میں، ان کی زندگی کو تین واضح ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ کاشت کاری کا دور، "دریا باری" کا دور اور خوش نگاری کا دور۔

کاشت کاری کے دور کا شباب یوں تو ان کے عنفوانِ شباب کے بعد ختم ہو جانا چاہیے تھا مگر اس کی چاشت اور خوشبو چونکہ ان کے خمیر میں رچی ہوئی ہے اس لیے یہ دوران پر ہمیشہ طاری رہے گا۔ یہی دھارا آگے چل کر سپہ داری کے دریا میں شامل ہو گیا۔ کرنل محمد خان کا آبائی گاؤں "بل کسر" علاقہ دھن کی مشہور وادی میں چکوال سے کوئی دس بارہ میل دور، کوہستان نمک کے پڑوس میں واقع ہے۔ یہ وادی جفاکش کاشت کار، سنہری گندم اور جیالے سپاہی پیدا کرنے کے لیے ہمیشہ سے ممتاز چلی آ رہی ہے۔ یہ ریکارڈ تو میرے پاس موجود نہیں کہ اس خطے میں ان کی سو پشتیں پوری ہو چکی ہیں یا نہیں مگر جتنی پشتیں بھی گزر چکی ہیں ان کا پیشہ سپہ گری رہا ہے زراعت سے ملی ہوئی سپہ گری۔ نظیری کا یہ غیر فانی مصرعہ

کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

ان لوگوں پر اتنا فٹ ہو کر صادق آتا ہے کہ اگر خود ان کے قبیلے میں نظیری سے پہلے فارسی کا کوئی جید شاعر پیدا ہو جاتا تو وہ یقیناً یہ مصرعہ کہہ کر وفات پاتا۔ زندگی کی فضا، سادہ اور کھلی، خوب صورت اور دل کش مگر سخت و سنگین بھی۔ تیس پینتیس برس پیشتر وہاں کم لوگ ہوں گے جو تعلیم کے میدان میں، محمد خان کی طرح ایم اے تک یلغار کرتے گئے ہوں لیکن یہاں کا محمد خان اندر سے خواہ کتنا ہی تبدیل ہو جائے

باہر سے وہی محمد خان رہتا ہے۔ کھیت میں ہل جوتنے والا محمد خان، کبڈی کے پڑ میں دھوم مچانے والا محمد خان، جنگ کے میدان میں بجلی کی طرح کوند جانے والا محمد خان! جہاں تک مجھے معلوم ہے کرنل محمد خان، اپنے علاقے میں، اپنی قسم کے پہلے محمد خان ہیں۔ سوچیے تو سب سے الگ، سب سے مختلف۔ دیکھیے تو دوسرے محمد خانوں کی طرح عام محمد خان ہے

تم جس جگہ پہ چھوڑ گئے تھے وہیں ہوں میں

"دریا باری" کا دور، دوسری جنگِ عظیم میں دجلہ، فرات اور نیل کے کناروں پر گزرا۔ مدت کے اعتبار سے یہ دور گو بہت مختصر ہے۔ مگر شیر شاہ سوری کے عہد کی طرح بڑا شاداب و زرخیز آپ فوج میں کمیشن لے کر اس وقت مشرقِ وسطیٰ کے محاذ کے سپرد ہوئے جب نامور جرمن سپہ سالار جنرل رومیل نے انگریزوں کو سنگینوں پر اٹھا رکھا تھا۔ مگر پھر اس وسیع جنگ نے، جو بیک وقت تقریباً آدھی دنیا میں لڑی جا رہی تھی ہمارے نوجوان افسروں پر ایک اجنبی دنیا کی رنگا رنگ زندگی کے دروازے بھی کھول دیئے تھے۔ مختلف تہذیبوں کے ملاپ اور تصادم سے باہمی روابط کے نئے نئے زاویے ابھر رہے تھے۔ عسکری زندگی کی اس روایت کے طفیل، کہ موت برستی رہے۔ مگر زندگی ہنستی رہے عقب کی شکم گاہوں میں، خوش دلی اور شگفتگی کے آبشار رواں رہتے۔ بعض مستقل محاذوں پر تو دیسی افسروں کے مستقل جھرمٹ اور نخلستان قائم ہو گئے تھے۔ جن کے لطائف و ظرائف، اور نکتہ طرازیوں کی داستان بجائے خود لکھنے کے لائق ہے۔ ملایا میں میجر چراغ حسن حسرت میرِ مجلس تھے۔ مشرقِ وسطیٰ میں بریگیڈیر گلزار احمد اس انجمن کے صدر نشین تھے، کرنل محمد خان چونکہ بولنے سے زیادہ سننے اور دیکھنے کے قائل تھے، اس لیے وہ جب وطن کو لوٹے تو اس زندگی کے بہت سے پھول اور ستارے بھی اپنے دامن

میں سمیٹ لائے۔

قیامِ پاکستان کے بعد جب مجھے راولپنڈی میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ آپ لیفٹیننٹ کرنل تھے۔ پھر جلد ہی فُل کرنیل ہو گئے۔ میں کپتان تھا اور سُرخ فیتے والے کا سامنا کرنے سے خاصا گھبراتا تھا۔ مگر وہ بڑے تپاک سے ملے۔ ایسا تپاک جو قدردانی کے راستے سے نکل کر آیا ہو۔ سامنے کی کُرسی پر "اٹن شن" بٹھانے کی بجائے ایک گوشۂ عافیت میں رکھے ہوئے صوفے پر لے گئے اور پھر چائے میں گھول گھول کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے کم گو مگر متبسم، سنجیدگی میں گندھا ہوا، حجاب آلود سا تبسم۔ طبیعت تعجب انگیز حد تک ملائم۔ اوپر کی آئی تلوار والے سپاہیوں کی طرح سخت، ان کی ظرافت، جس نے آگے چل کر اردو ادب کو چمکا دیا اس وقت کہیں "کوارٹر گارڈ" میں بند تھی۔ بعد میں رفتہ رفتہ کھلا کر ان کی طبیعت احباب کی محفلِ خاص ہی میں کھُلتی ہے۔ عام گفتگو میں ان کی ظرافت، موسلا دھار ہو کر نہیں برستی۔ لیکن ان کے ایک جملے سے بھی پہروں گلشن کا کاروبار چل سکتا ہے۔ ایک مدت تک ان کے بارے میں یہی تاثر رہا کہ وہ اچھے دوست ہیں، ادیب نہیں ہیں۔ حالانکہ سرکاری فائلوں پر بڑی چابلی انگریزی لکھتے تھے۔ یہ بہت آگے جا کر معلوم ہوا کہ وہ تو بہت پیچھے یعنی اسکول اور کالج کے زمانے سے ادیب بلکہ شاعر چلے آ رہے تھے۔ راستے میں نہ معلوم کیوں غوطے میں چلے گئے اور بس نک سک سے درست، قاعدے اور ڈھنگ کا ایک فوجی افسر ان کی جگہ رہ گیا۔ افسر اور انسان محمد خان کو بھی قریب سے میں نے دیکھا ہے۔ ان کو ہر حالت میں پُرسکوں۔ کشادہ ظرف اور خوددار پایا۔ ان کی نظر ہمیشہ دوسروں کے نکتہ نظر پہ رہی۔ البتہ جہاں عزتِ نفس پر آنچ آنے کا اندیشہ ہوا۔ وہاں مے و انگبین کی کوئی لاگ باقی نہ رہنے دی۔

وہ کم گو ہیں، مگر کم آمیز نہیں ہیں۔ البتہ دوستی کے بارے میں وہ قدرے محتاط ہیں کہ ارتکابِ گناہ سہل مگر انتخابِ گناہ مشکل ہوتا ہے۔ دوست سے بجز محبت کسی چیز کی توقع نہیں رکھتے، لیکن آپ خود دوستوں کی عزت و آسودگی کا اتنا خیال رکھتے ہیں کہ ایک مدت سے دوستوں کے حق میں، اپنے آپ سے بھی دستبردار ہو چکے ہیں:

دستِ بخیہ و پائے بہ داماں فرو ختم

زندگی کو وہ ایک بیش قرار نعمت، ایک بیکراں مسرت سمجھتے ہیں۔ غموں اور محرومیوں سے ان کا دل خالی نہ ہو گا ؎

مجھ کو خبر نہیں پسِ دیوار کیا ہوا

غموں سے شکستہ دل کبھی دکھائی نہ دیئے۔ جب دیکھا اپنے ایک ایک لمحے سے پُرشوق ملاقاتیوں کی طرح لپٹتے دیکھا۔ لمحات کے اندر خود اپنی کوئی چھینک ہو یا نہ ہو، زندگی اور انسانوں سے ان کا اپنا پیار، لمحات کے پاؤں میں جھانجر باندھ دیتا ہے۔ جو شخص، راولپنڈی میں اپنی کوٹھی کے صحن میں، مرغی کے چھوٹے چھوٹے چوزوں کے ساتھ معصوم بچوں کی طرح پہروں کھیل سکتا ہو۔ بل کسر میں، شام کے وقت اپنے چوبارے کے چھجے میں بیٹھ کر، چراگاہوں سے واپس آتے ہوئے مویشیوں کی بجتی ہوئی گھنٹیوں کی آواز پر سر دھن سکتا ہو اس شخص کے ظرفِ مسرت کا بھلا کوئی اندازہ ہے ؎

ہم وحشیوں نے صحنِ گلستاں سے اے خزاں
تنکے بھی چن لیے کہ شریکِ بہار تھے

روزمرہ کی زندگی میں نفاست اور ترتیب کے اس حد تک عادی ہیں کہ مثلاً اگر کتابوں کے شیلف سے کسی کتاب کی صراحی دار گردن، دوسری کتابوں سے آگے نکل آئے تو آپ اس کتاب کے مصنف سے بھی بیزار ہو جاتے ہیں۔ جوتوں

کی قطار ایک دم سیدھی ہی نہیں، جوتوں کے رولی نمبر کے مطابق بھی کھڑی ہوتی ہے جب تک یہ تبادلے کے احکام جاری نہ فرمائیں۔ کیا مجال ٹوپی کے ہیڈ کوارٹر میں رومال، یا رومال کے مقام پہ ٹوپی آکر بیٹھ جائے خواب گاہ کے ایک، کونے میں اگر آپ اندھیرے میں ہاتھ بڑھائیں تو چھڑی خود بخود آپ کے ہاتھ میں آجائے گی۔ حد یہ ہے کہ چائے پہ ان کے ہاں جو پکوڑے براہ راست کڑاہی سے نکل کر ساتھ ساتھ سپلائی کیے جاتے ہیں وہ بھی گورکھا سپاہیوں کی طرح قد و قامت کے ایک ہی سانچے میں ڈھل کر آتے ہیں۔ تمدنی لحاظ سے، ان کے گھر کو زرق برق راولپنڈی اور سادہ و توانا بل کسر کا سنگم کہنا چاہیے۔ پورچ میں موٹر کھڑی ہے۔ عقب میں بھینس بندھی ہے۔ انگریزی شوربے (SOUP) پر جان چھڑکتے ہیں۔ مگر روٹی سیدھی تنور سے اچھل کر دسترخوان پہ آنی چاہیے۔ ہر چیز میں ایسا سلیقہ توازن اور نفاست، کہ معلوم نہیں آدمی ان کی خوش ذوقی کی داد دے یا انتظامی صلاحیت کی بہرحال ع

یہ غنیمت ہے کہ زنجیریں انہیں راس آگئیں

اب چائے کی سنیے! چائے سے ان کی رغبت عشق کی کیفیت رکھتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ انسانوں کے بعد ان کے نزدیک، سب سے زیادہ فضیلت اسی چیز کو حاصل ہے لذت اور راحت کے علاوہ چائے کے ساتھ آپ نے ایک قسم کی تقدیس کا جذبہ بھی وابستہ کر رکھا ہے، جس چاؤ اور چاہت کے ساتھ چائے بناتے ہیں، اور پھر خود سپردگی سے پیتے پلاتے ہیں اس کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ چائے کوئی مشروب نہیں کوئی "انسٹی ٹیوشن" ہے۔ جس کی اپنی روایت ہے اپنے آداب ہیں، اس معاملے میں، وہ ان کلاسیکی انگریزوں کا مزاج رکھتے ہیں جو چائے کی پیالی پہ بیٹھ کر مالٹا اور جبرالٹر کی قسمتوں کا فیصلہ کیا کرتے تھے، ان کی سب سے چہیتی خوشی یہ ہے کہ دوست بیٹھے ہوں، خوش گپیاں ہو رہی ہوں۔ اتنے میں گھڑی شام کے سات بجائے اور آپ ایک

نعرہ مستانہ بلند کر کے سیف علی کو آواز دیں ——— "سین چائے لے آؤ"۔

اس آواز کے ساتھ سین مالاکوت کی ٹرالی چھوڑ کر خود "سین" (SCENE) سے غائب ہو جاتا ہے۔ اور چائے بنانے کا سارا اہتمام آپ بہ نفس نفیس خود سرانجام دیتے ہیں۔ پہلے چائے کا شجرہ نسب بیان ہوگا پھر ایک دو مرتبہ پانی کا درجہ حرارت ٹٹولیں گے۔ اور پھر نفیس ترین چائے کو، صورت و معنی کی لطیف ترین معراج پہ لاکر، خوب صورت چائنا کے نجیب الطرفین پیمانوں میں ڈھالتے چلے جائیں گے اور اس کی ارغوانی رنگت کو کچھ اس آرزومندی کی نظر سے دیکھیں گے جیسے بلبل گلاب کو دیکھ رہی ہو۔ دوستوں کو چائے پیش کرتے وقت ان کے چہرے پہ آسودگی اور فتح مندی کی جو چمک نظر آتی ہے، اس سے ایسا لگتا ہے کہ آپ چائے نہیں مسرتیں اور نیکیاں بانٹ رہے ہیں۔ اور پھر جب چائے کا دور چل پڑتا ہے تو اس کم سخن شخص کے چہچہانے کا انداز دیدنی و شنیدنی ہوتا ہے چائے کے ایک ایک جرعے کے ساتھ ؎

خسرو از دہلی، ظہیر از فاریاب آید بروں

سوسائٹی میں ابھی تک ان کی وہ مقبولیت تو نہ تھی جو "بجنگ آمد" کی اشاعت کے بعد ان کو حاصل ہوئی۔ تاہم اپنے عہدہ و منصب، اپنی خوئے مہمان نوازی اور ادائے دل نوازی کے باعث ادبی و تہذیبی، سماجی اور مجلسی تقریبات میں ان کی مانگ اکثر رہتی تھی۔ تقریب سے تو یہ لطف اندوز ہوتے تھے۔ لیکن تقریب میں قدم رنجہ فرمانے کی ساعت ان پر سخت بھاری گزرتی۔ کوشش یہ کرتے تھے کہ کہیں میزبان ان کو دیکھ نہ لیں۔ کوئی خیر مقدم کرنے والا ان کو پکڑ کر آگے نہ بٹھا دے، عموماً دبے پاؤں کسی پچھلی صف میں جا کر بیٹھ جاتے اور پھر لوگ لاکھ اصرار کرتے رہیں حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے۔

کرنل محمد خان کی ادبی شخصیت کی طرف سرسری سا اشارہ پہلے آچکا ہے کہ ایک طویل مدت تک انہوں نے اپنے اس جوہر کو ظاہر ہی نہ ہونے دیا۔ لیکن جب یہ حکایت عام ہوئی تو پتہ چلا کہ ان کو یہ عارضہ بچپن سے لاحق تھا۔ ثانوی جماعتوں میں چٹک مٹک مضامین لکھنے کے لیے اساتذہ اور طلبہ کے منظورِ نظر تھے۔ کالج میں پہنچ کر شعر بھی موزوں کرنے لگے۔ کالج کے میگزین کے ایڈیٹر ہوئے، سنٹرل ٹریننگ کالج میں ان کی مزاحیہ شاعری کی دھوم دھام تھی۔ ابتدا میں جلدی جلدی دو تین تخلص آزما کر چھوڑ دیئے۔ دو ایک برس محمد خان نسیم بنے رہے آخر کار محض محمد خان رہنا پسند کیا۔ مگر یہ بات ان کے چند یارانِ مکتب ہی کو معلوم ہے۔

راولپنڈی میں ان سے ملاقاتوں میں بھی، ان کا رویہ کچھ ایسا تھا کہ آدمی ان پر شعر و ادب کے ادا شناس ہونے کا گمان تو کر سکے۔ لیکن شاعر و ادیب ہونے کا گمان نہ کر سکے۔ مطالعہ وسیع تھا ادب پاروں سے متعلق ان کے تبصرے، ان کے ارفع مذاقِ ادب کی نشان دہی کرتے تھے۔ خود ان کی شخصیت کے بعض تیور، ادب و شعر سے ان کے عملی لگاؤ کی شہادت دیتے تھے، مگر وہ اپنی زبان سے اس کی حامی کبھی نہ بھرتے۔ اور ہیں قوی شبہ کے باوجود ایک ذمہ دار آدمی کی بات پہ یقین کرنا پڑتا سب سے بڑی بات یہ تھی کہ انہوں اپنا کوئی شعر یا مضمون سنانے کی خفیف سی خواہش بھی کبھی ظاہر نہ ہونے دی۔ فن کاروں کی دنیا میں ضبطِ نفس کی ایسی کامیاب مثال، ان سے پہلے ہماری نظر سے نہیں گزری تھی۔ ہم اندازہ ہی نہ کر سکتے تھے کہ کوئی شخص کسرِ نفسی کے معاملے میں اتنا عظیم مبالغہ بھی کر سکتا ہے! چنانچہ، اپنی طرف سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہوئے تھے کہ آپ اہلِ علم اور اہلِ نظر لوگوں میں سے تو ہیں، طباعی کا جوہر بھی وافر رکھتے ہیں۔ مگر کچھ بات ہے کہ طبیعت ادھر نہیں آتی۔

اردو ادب کو ہمارے دوست کرنل مسعود احمد کا احسان مند ہونا چاہیے کہ انہوں

نے عساکرِ پاکستان کے جریدہ "ہلال" کے لیے ان سے ایک مضمون لکھوا لیا۔ مضمون کا عنوان تھا "کوہستانِ جنگ" یہی مضمون بعد میں "بجنگ آمد" کے دوسرے مضامین کا والدِ ماجد ثابت ہوا۔

"بجنگ آمد" کو جو ہمہ گیر شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی ہے، وہ اردو کی بہت کم تصانیف کے مقدر میں ہے۔ کرنل محمد خان نے ادب کو ایک چونکا دینے والے اسلوبِ نگارش اور احساسِ ظرافت سے آشنا کیا ہے ان کے بارے میں اگر مجھے صرف ایک ہی جملہ کہنے کی اجازت ہوتی تو میں وہی مشہور و معروف جملہ کہتا ؎

"وہ آیا، اس نے دیکھا، اس نے فتح کر لیا"

"بجنگ آمد" کی فضا، دوسری عالمگیر جنگ کی زندگی سے ماخوذ ہے اور یہ کتنا دلچسپ اتفاق ہے کہ شہرت و امتیاز کی نسبت سے، اس کے سپاہی مصنف کے لیے، اگر کسی مثال کی ضرورت ہو تو، یہ مثال اسی جنگ کے ایک نامور سپہ سالار جنرل رومیل میں نظر آتی ہے۔ رومیل افریقہ کے صحرائی محاذ پر اچانک نمودار ہوا اور اس کی پیش قدمی کی رفتار نے دنیا کو حیران کر دیا۔ "رومیل کو" جرمن ہائی کمان" سے کمک نہ ملنے کی ہمیشہ شکایت رہی، کچھ یہی کیفیت، ادب کے میدان میں، کرنل محمد خان کی نظر آتی ہے۔ وہ ادب کے افق پر اچانک نمودار ہوئے۔ اور ایک ہی جست میں شہرت و محبوبیت کے بلند ترین مقام پر جا پہنچے اور ہاں ان کو بھی اپنے "آبائی ہیڈ کوارٹر" بل کسر سے کبھی خاطر خواہ ذہنی کمک نہ مل سکی۔ اس لحاظ سے کرنل محمد خان کو اگر اردو ادب کا رومیل کہا جائے تو میرے خیال میں یہ کوئی بے محل مثال نہ ہوگی۔

ادب کے اس رومیل کے بارے میں ابھی، بہت کچھ لکھنے کو جی چاہتا تھا

لیکن یہ احساس دامن گیر ہے کہ میں اب کپتان صدیق سالک کی سرحد میں گھس آیا ہوں اور پھر یہ احساس بھی کہ اپنے پیارے دوست محمد خان کی شخصیت کے رنگ اور رس کی بقدرِ آرزو ترجمانی میرے ذہن کی توفیق اور میرے قلم کے بس کی بات نہیں ہے۔ ؎

شعر حسرت ہم نے مانا کہ نازک ہے بہت
اس سے بھی کچھ بڑھ کے نازک ہے مگر خوشبوئے دوست

(۲۳ مئی ۱۹۶۸ء میں بحیثیت آمد کی تعارفی تقریب کے لیے لکھا گیا)

اُردو شاعری کی خاتونِ اوّل

مثل مشہور ہے کہ اونٹ جب بھاگتا ہے، مکّے کی طرف بھاگتا ہے۔ محترمہ ادا جعفری نے جس دور میں اپنے اکہرے نام سے شعر کہنا شروع کیا تھا۔ اگر کوئی لڑکی شاعری کرنے کا جگرا نکال ہی لیتی۔ تو وہ عموماً اخلاقی قومی یا نیچرل شاعری کا برقعہ اوڑھ کر اس کوچے میں نکلتی اور ڈری ہوئی ہرنی کی طرح کچھ اس طرح جھجھونک پھونک کر قدم رکھتی کہ سماج کے برقع میں سے اس کی شاعری کی صرف آنکھیں ہی دکھائی دے سکتیں۔ بہت ہوا تو بے احتیاطی کے کسی لمحۂ نادر میں شاعری کی تھوڑی سی پیشانی جھلک اٹھتی یا پلکوں کی چلمنیں اٹھتی گرتی نظر آجاتیں جو عموماً اٹھنے سے پہلے گر جاتیں۔ جس لڑکی کا شعر، ایک آنچ کے بقدر بھی زیادہ گرم ہو جاتا اس بیچاری کی شادی کے لالے پڑ جاتے تھے کہ باذوق بَر، برسرِ روزگار بَر سے بھی زیادہ کمیاب جنس ہے۔ لوگ اپنے شاعر بیٹے کو مشکل سے برداشت کرتے ہیں۔ چہ جائیکہ شاعر بہو گھر میں لے آئیں۔ میں اخلاقی، قومی یا نظریاتی شاعری کے روح اور جسم پر اثرات کا منکر نہیں۔ ادب میں بچوں کو سلانے والی لوریاں نہ ہوتیں تو اولاد جیسی نعمت بھی کسی قدر تکلیف دہ ہو جاتی! مقصود صرف اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ سماجی ماحول نے ادب کو ریل گاڑی کی طرح، مردانہ اور زنانہ ڈبوں میں تقسیم رکھا تھا۔ یہ

ٹھیک ہے کہ شاعری میں خواتین کے برسرِ بازار سرخی پوڈر جمانے یا ساڑھی تبدیل کرنے کے عمل کو (جس پر فی زمانہ بعض شاعرات نے عمل شروع کر دیا ہے) شاید مناسب نہ سمجھا جائے کہ اس فن کی اجائیت اور اشاریت کا خون ہوتا ہے لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ عورت کو شاعری کے کسی "تہ خانے" میں بند کر دیا جائے اور یہ قدغن لگا دی جائے کہ آمد و رفت بڑی ڈیوڑھی سے ہوگی۔

مگر ادا کے یہاں، ان کی ابتدائی نظموں ہی میں جو ہم پنجاب کے لوگ ۱۹۴۰ء کے آس پاس اختر شیرانی کے رسالہ "رومان" مرزا ادیب کے "ادبِ لطیف" مولانا تاجور کے "شاہکار" اور بعض دوسرے رسائل میں پڑھتے تھے، عام ڈگر کی "نسائی شاعری" سے ایک واضح انحراف کی "چیک پوسٹ" (CHECK POST) نظر آتی تھی۔ ان کے بیشتر شعر ایسے ہوتے کہ جیسے بیساکھ کی دھوپ میں گیہوں کے سنہرے بالوں سے بھرے ہوئے، خوشے لہلہا رہے ہوں۔ ان پر بکھری ہوئی دھوپ کا سنہرا پن بھی چمکتا اور وہ گرد بھی جمی ہوتی جو ارد گرد کی توانا، مگر دردمند زمین سے اٹھ کر ٹانڈوں اور خوشوں سے لپٹ جاتی ہے۔ ادا کے فکر و فن کا رُخ ابتدا ہی سے زندگی کی وسیع تجربہ گاہ کی طرف تھا۔ جیالے سیاحوں کی مانند، ناآزمودہ سمتوں کے سفر کا رجحان ان کے ہاں بڑا نمایاں تھا۔ یہ بات ہمیں بہت بعد میں معلوم ہوئی کہ وہ ایک کھاتے پیتے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کی تربیت قدیم طرز کی دینی اور تہذیبی روایات میں، سروشانہ تک گھٹے ہوئے ماحول میں ہوئی تھی۔ بُرقع انہوں نے شادی کے بعد اتارا۔ مجھ کو ادا کی شعری شخصیت کا پیکر ایک ایسی لڑکی کا لگتا تھا جو بدایوں کے کسی بھی ٹم ٹم والے گھرانے میں نہیں، بلکہ جہلم کے ایک گاؤں میں میری پھوپھی زاد بہن زبیدہ کی طرح مٹی گارے سے لت پت کسی محنت کش خاندان میں پیدا ہوئی ہو، جو پنگھٹ سے بیک وقت پانی کے دو، دو گھڑے سر پر اٹھا کر لاتی ہو اور جس کے ہاتھوں پر

درانتی سے فصل کی سنھریاں کاٹتے کاٹتے، نیلی نیلی جھلیاں جم گئی ہوں، مگر بدایوں کی یہ زبیدہ، نجانے کس طور لکھ پڑھ کر شاعری کرنے لگ گئی ہے۔ (مجھے آج تک معلوم نہیں کہ ادا بہن کا اصل نام کیا ہے) "میں ساز ڈھونڈتی رہی" میں ادا کی روح کے درد اور ان کے لہجے کی "للک" کی لہر کچھ اس انداز سے چلتی تھی۔

زندگی میرے لیے خواب نہیں، گیت نہیں
سوچتی ہوں کہ کوئی جملۂ تاریک ہے کیا۔
یہ گراں بار تسلسل۔
یہ حیاتِ جامد۔
جس کی دیواروں کی سنگینی سے لرزاں ہے خیال۔
کوئی روزن بھی نہیں، کوئی دریچہ بھی نہیں۔
نذر پہ آندھی کے دیا کانپ رہا ہو جیسے۔
تھک کے افسردہ و ویران گزرگاہوں میں۔
آخری عہدِ وفا کانپ رہا ہو جیسے۔
اور یہ آنسو ہے کہ آنکھوں سے ڈھلکتا ہی نہیں۔
ہائے یہ ساغرِ لبریز چھلکتا ہی نہیں۔

زندگانی تھی کا کُل برہم — آپ سلجھائی، آپ الجھائی
منزلیں بڑھ کے خود قدم لیتیں — میں ہی آغازِ رم نہ کر پائی

رُوح میں انتشار سا کیا ہے — دل کو یہ انتظار سا کیا ہے

ادا کا یہ لہجہ ابتداءً سوئی کا نکہ تھا جسے انہوں نے رفتہ رفتہ نیزے کی

انی میں تبدیل کرلیا۔ ادا نے شاعری کے اس تہہ خانے کی، جس میں عورت محصور تھی، کئی صدیوں کی چنی ہوئی سنگلاخ دیواریں توڑ کر، ہوا اور روشنی کے بہت سے نئے دریچے مہیا کئے ہیں ـــــ اور میں ادا کو انہی معنوں میں، اردو شاعری کی خاتونِ اوّل کہتا ہوں۔

اردو شاعری کی خاتونِ اوّل سے ہماری اولین ملاقات، راولپنڈی میں ہوئی۔ پاکستان ابھی نیا نیا بنا تھا۔ محترم نورالحسن جعفری صاحب نے سرکاری ملازمت اور بیاہتا زندگی میں نیا نیا قدم رکھا تھا اور وہ ان دنوں نمبر ۵ مال روڈ راولپنڈی پر، جہاں اب پی۔ آئی۔ اے کی عمارت واقع ہے، اپنے پھوپھا، آرمی میڈیکل کور کے محترم کرنل عون محمد جعفری صاحب کے کشادہ بنگلے کے ایک حصّے میں مقیم تھے۔ ہم ان کے پڑوسی، مال روڈ نمبر ۵۔ اے سے اپنا اخبار "بادِ شمال" نکالتے تھے جو اگرچہ تھا تو روزانہ اخبار، مگر نکلتا ہفتے میں ایک بار تھا ڈاک خانے والوں نے دونوں طرف کے جعفریوں کو ایک رسّی میں باندھ رکھا تھا، ان کی ڈاک ہمارے ہاں اور ہماری ڈاک ان کے گھر۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ میں ان کا رسالہ "ہمایوں" لے کر گیا تو بدلے میں انہوں نے میرا رسالہ "ادبی دنیا" تھما دیا۔ مجھے نمبر ۵ مال روڈ کی ڈاک ہی سے معلوم ہوا کہ جس ادا جعفری کے نام پر ادبی رسالے چلے آرہے ہیں، یہ اردو کی وہی ممتاز شاعرہ ہیں جو ادا بدایونی کے نام سے لکھتی تھیں۔ مگر جب ان سے ملاقات ہوئی تو ان کی "ترقی پسندی" پر حیرت ہوئی۔ بجائے خود "ترقی پسندی" حیرت کی بات نہیں خوشی کی بات تھی، مگر وہ اپنے سماجی پس منظر اور بظاہر اپنی طبیعت کے لحاظ سے بھی، کچھ ایسے ملائم سے۔ بلکہ کچھ کچھ خواب آور ماحول سے تعلق رکھتی تھیں کہ وہ اگر شاعری میں بہت دور بھی نکل جاتیں، تو بس یہی کہ ساحلِ سمندر پر رنگین چھتری تان کر بیٹھ جاتیں، اور اپنے شعروں کے لیے "زمرد کے گلوبند" اور اپنے بچوں کے لیے

ریشمی فراک بنتی رہتیں۔ مجھے سب سے پہلے انہی کا گھر دیکھ کر شعوری طور پر یہ احساس ہوا کہ کسی ادیب کے ڈرائنگ روم سے اس کے فکری رجحانات کا اندازہ نہیں لگانا چاہیے۔ بعض اوقات فرش پر قالین اور دل میں بوریا بچھا ہوتا ہے ـــــ یا جیسا کہ پیر ہجویری حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا:

"صوفی اندر کی تجلّی سے سنتا ہے، جسم کے اوپر پڑے ہوئے کمبل سے نہیں"۔

راولپنڈی ان دنوں رقبے کے اعتبار سے چھوٹا، مگر "دل گردے" کے لحاظ سے "بڑا شہر" تھا۔ شہر بھر میں آٹھ دس موٹریں تھیں اور اتنے ہی شاعر تھے۔ موٹروں میں ایک کمانڈر انچیف کی تھی اور ادبی حلقوں میں "پوٹھوہار کے بابائے اردو" حضرت عبدالعزیز فطرت شعرا کے "کمانڈر انچیف تھے"۔ کہ ان کا گھر (سدا بہار) "کعبۂ سخنوراں" تھا ایسا لگتا ہے کہ ان دنوں کے پیدل لوگ آج کل کے موٹر سوار لوگوں کی نسبت کہیں زیادہ ایک دوسرے سے میل جول رکھتے تھے، قیامِ پاکستان کے بعد جب شہر کی ادبی اور تہذیبی زندگی نئے سرے سے اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے لگی، تو ادب کے "پرائیویٹ سیکٹر" میں (سرکاری سیکٹر ان دنوں ہوتا ہی نہ تھا) ادب اور ادیبوں کے جو چھوٹے بڑے ہیڈ کوارٹر اپنے اپنے آرٹ اور "آرکیٹیکچر" کے مطابق نمودار ہوئے ان میں سول لائن پر جناب فضل احمد کریم فضلی کا کشمیر ہاؤس ٹرنک بازار میں فقیر گوشہ نشیں نواب اشک رام پوری کا آستانہ، کمیٹی چوک میں ڈاکٹر گرن کا مطب، صدر میں عزیز ملک کا ادبی "حجرہ شاہ مقیم" کالج روڈ پر علامہ جدت میرٹھی کا دبستانِ قدیم، گوالمنڈی میں پروفیسر رزمی صدیقی کا غنچہ گدہ اور ۵ مال روڈ پر "ادا و نور" کا گھر، راولپنڈی کے چند قابلِ ذکر ادبی تکیے سمجھے جاتے تھے۔ ان کا ہیڈ کوارٹر ایک وسیع الظرف ہیڈ کوارٹر تھا، بلکہ نسیم الظفر مرحوم کی نسبت سے کہ یہاں کی بیٹھکوں کے رکنِ رکین تھے، اسے "نسیم الظرف" کہنا چاہیے۔ یہ واحد مقام تھا، جہاں ابوالاثر

حفیظ جالندھری، جگر مرادآبادی کی غزلوں اور ن۔م۔ راشد اور یوسف ظفر کی آزاد نظموں کو یکساں فراخ دلی کے ساتھ سناجاتا اور ادب کے کتنے ہی مختلف نیستانوں کے ڈھاری دار شیر اور چیتے بارہا ایک گھاٹ پر چائے پیتے پائے جاتے۔ سب سے بڑی خصوصیت اس گھر کی رچی ہوئی صادقانہ تہذیبی فضا تھی۔ جیسے وہاں لوگ سب نماز روزے کے علاوہ علم و ادب اور دیگر فنون لطیفہ سے بھی گہری، صدیوں پرانی شیفتگی رکھتے ہوں۔ یہ نہیں کہ مثلاً جیسے ہمارے ڈاکٹر گزن کے ہیڈکوارٹر میں بعض اوقات ہوتا تھا کہ شعرائے کرام مطلعے، مقطعے عرض کر رہے ہوں کہ اچانک اوپر سے ڈاکٹر گزن کے غم بزگوار، بغل میں شطرنج دبائے، جنگِ عالم گیر اوّل کے دو ریٹائرڈ مگر ابھی تک باغ و بہار حوالدار میجروں کو جلو میں لیے، دور سے دُہائی دیتے ہوئے آتے۔

"اوئے! ایہہ کی کھپ پائی ہوئی اے تُساں؟ نسو ایتھوں، مطلعیاں سمیت"۔

(تم لوگوں نے کیا اودھم مچا رکھا ہے؟ بھاگو اپنے مطلعوں سمیت)

اور پھر جس طرح ڈاکٹر صاحب کے مریض عموماً افاقہ ہونے کے بعد اچانک دم توڑ دیتے تھے، اسی طرح ان کے مشاعرے بھی ٹینگ کے سب سے اونچے "ہلارے" میں ٹوٹ جاتے۔

نُور بھائی اور آدا بہن کے ہاں کی نشستوں میں ابتداءً کچھ کچھ یوں لگتا تھا جیسے یہ بساط شاید الٰہ آباد کے مشہور سنگم پر بچھی ہو، مگر رفتہ رفتہ، جوں جوں ان کو "رانجھے، رانجھن اور رانجھیٹے" کا فرق سمجھ میں آتا گیا اور ان کے ڈرائنگ روم میں رانگلے، خوشابی پیڑھے اور "لونکیاں" (نمک دان) جگہ پکڑنے لگیں، اس پر سواں کیمپ کا گمان ہونے لگا۔

شعر کے پرکھنے کا میرا "جنرک" نظریہ یہ ہے کہ شعر پڑھ کر دل میں اتنی تحریک پیدا ہو جتنی بچپن میں کوئی خوش رنگ، تتلی اور جوانی میں کوئی پیاری صورت دیکھ کر

پیدا ہوتی ہے۔ شعر کو سب سے پہلے شعر ہونا چاہیے۔ اس کے بعد جتنی چیزیں ہیں، وہ رئیسی کے ٹھاٹھ ہیں، فراغت کی مینا کاری ہے، اسمبلی کی بحث ہے، آب و ہوا ——— ہے یارگِ گُل سے بُلبل کے پَر باندھنے کا ہنر۔ رجحانات کے بارے میں میرا ذاتی رجحان یہ ہے کہ آرٹ اور رجحان دونوں کی سلامتی اسی میں ہے کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ فن زندگی ہے اور زندگی اپنا محور خود پیدا کر لیتی ہے میں نہیں سمجھتا اس شاہراہ پر مسجد و تالاب اور یوتھ ہوسٹلوں کے سائن بورڈ آویزاں کرنا ضروری ہیں نقد و نظر کی میزان ہم مغربی نقادوں سے بھی مانگ سکتے ہیں، بالخصوص انگریزی تنقید کے مولانا الطاف حسین حالی، یعنی میتھو آرنلڈ صاحب کے تیر بہدف اقوال نقل کر دینا کیا مشکل تھا، لیکن ہم نے سوچا آپ پچھلے کئی برس سے پوٹھوار میں، رس بس رہی ہیں اور اس ناطے سے "پوٹھواری" بن چکی ہیں تو ان کے فکر و فن کا جائزہ پوٹھوار ہی کے ایک بزرگ شاعر، پنجابی زبان کے غیر فانی مثنوی "سیف الملوک" کے خالق، عارف کامل حضرت میاں محمد بخش رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے کیوں نہ لیا جائے حضرت نے شعر کی تعریف اس طرح فرمائی ہے:۔

جس وچ گجھی رمز نہ ہووے، درد منداں دے حالوں
بہتر چپ محمد بخشا سخن اجیہے نالوں

(جس شعر میں دکھی انسانوں کے حوالے سے کوئی گہری رمز نہ ہو، ایسا شعر کہنے سے چپ بھلی)

قصے ہور کسے دے اندر درد اپنے کج ہوون
بن پیڑاں تاثیراں ناہیں، بن پیڑے کد روون

یعنی ؎

خوشتر آں باشد کہ سِرِّ دل براں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

باجھ ادا رسیلی یارو لگ دا شعر اُلونا
دُودھ اندر جاں کھنڈ رلایئے مِٹھا ہوندا دونا

نغمگی کی لَے کے بغیر شعر بے نمک ہوگا۔ دودھ میں شکر ملانے سے لذت دوچند ہوجاتی ہے ـــــ یعنی ـــــ آتشِ گل پہ قند کا ہو قوام!)

توڑے کُتّے بن کے رہیئے، وچ وطن دی گلیاں
دَر دَر جھڑکاں کھایئے بھالوئیں، فر پردیسیوں بھلیاں

اپنے وطن میں خواہ کتّوں کی طرح" دُرکارے" جائیں، تب بھی وطن کی گلیاں پردیس کی جنّت سے ہزار درجہ خوش تر ہیں۔

مصرعے اندر جڑیا ہووے جیوں تھیوا وچ چھاپے
جے کوئی ڈونگھی نظروں ویکھے، بیتوں بیت سہاپے

(الفاظ مصرعوں کے اندر اس طرح جڑے ہوں جیسے انگوٹھی میں نگینے۔ شعر پر جتنا غور کرو اتنے ہی پرت مضمرات کے کھلتے چلے جائیں۔)

میاں صاحب نے دوسروں کے درد کی صراحت کر کے معاشرے کی تمام خوبیوں اور خرابیوں کو موضوعِ شعر قرار دے دیا۔ مقصود یہ کہ شعر کی بنیاد حقیقت پر ہو، یہ نہیں کہ ؎

کوئی سوتا ہو جیسے ڈوبتی کشتی کے تختے پر

ان کے نزدیک فکر کے بغیر شعر کا "اُلارا" فرضی معاملہ بندیوں تک محدود رہتا ہے۔ نغمگی سے ان کی مراد شیرینی و توازن کے اس حُسن سے ہے جو اگر شعر میں موجود نہ ہو تو قاری زیادہ علم کے بجائے، تھوڑے سے ادب کی دعائیں مانگنے لگتا ہے۔

الغرض، میاں صاحب کا مطالبہ شعر سے یہ ہے کہ وہ دل اور دماغ دونوں سے خراج وصول کرے۔

گر یہ نہیں تو بابا ساری کہانیاں ہیں

اب آیئے، ایک دریچہ کھول کر، کچھ نظارہ ان کے شعری گل بوٹوں کا بھی کر لیا جائے۔ شاعر اپنے خوابوں کا باغ ہی تو لگاتا ہے۔

راستے میں کچھ ساتھی — رہ بدل بھی جاتے ہیں
پھر کبھی نہ ملنے کو — کچھ بچھڑ بھی جاتے ہیں
خشک ہو چکے گجرے — کس گلے میں ڈالو گی
بھولی بھٹکی خوشبو — کس کا راہ روکو گی!
کس نے اشک پونچھے ہیں — کس نے ہاتھ تھاما ہے؟

جس کسی لفظ میں پائی ہے صداقت کی مہک
میں نے اس لفظ کے قدموں میں جبیں رکھ دی ہے

ہاتھ کانٹوں سے کر لیے زخمی — پھول بالوں میں اک سجانے کو
میں تمہیں نہ بھولوں گی — میں کہ فطرتاً ماں ہوں

میں تو خود کوزہ گر و خالق و صنّاع بنی — شہر بانو بھی مرا نام رہا، مریم بھی

میری آغوش میں یہ ہمکتا ہوا چاند فردا کی خوابوں کی تعبیر ہے
یہ نئی نسل کے حوصلوں کا اَمیں، آنے والے زمانے کی تقدیر ہے

ان رہوں میں تجھے، دیت نام و کشمیر بھی
ایسے قریے بھی تھے جن کو تاریخ بھی

نام اب تک نہیں دے سکی!

چاک گریباں والے لوگو، تم کیسے گن والے ہو
آنکھیں کرنیں، ماتھے سورج اور کیا اندھیاری
شیشہ سچا اجلا جب تک، اونچا اس کا بھاؤ

نازِ وفا کا بت بھی ہمیں توڑنا پڑا — لوگو، شکستِ دل سے بڑا سانحہ ہوا

یہ برگِ گل سی تمنا، یہ ریگزار سی دھوپ — یہ خوش خرام کھلے سر کہاں چلی آئی

کس نے برتا ہے رنگِ لالہ و گل — یہ قبا کس بدن کو راس آئی

اِک کرن تبسم کی زادِ راہ بن جاتی — اور دل نے کیا مانگا، اور ہم نے کیا چاہا

یہ میرے عہد کی یا خود مری کہانی تھی — جو دسترس سے ہو باہر اُسے خدا کہنا

یہ شوخ لال اوڑھنی
جو ماما کی چھاؤں میں
گلاب سے الجھ گئی

وہم پوجا ہے، گمانوں کی عبادت کی ہے — اپنے مرقد پہ نہیں، گھر پہ دیئے بھی جلتے

دل کو شیشہ کہنے والو — کس دنیا میں رہتے ہو
دل کی زد پہ آنے والی — بپھری موجیں، مڑ جاتی ہیں
یہ وہ بھٹی انگاروں کی — جس میں لوہا گل جاتا ہے

آگے حریمِ غم کے کوئی راستہ نہ تھا — اچھا ہوا کہ ساتھ کسی کو لیا نہ تھا
کچھ اتنی روشنی میں تھے چہروں کے آئینے — دل اس کو ڈھونڈتا تھا جسے جانتا نہ تھا
کیا بوجھ تھا کہ جس کو اٹھائے ہوئے تھے لوگ — مڑ کر کسی کی سمت کوئی دیکھتا نہ تھا

قافلے لٹتے ہی رہتے ہیں گزرگاہوں میں — لوٹنے والوں نے کیا عزمِ سفر بھی لوٹا؟
دجلۂ خوں تو نئی بات نہیں ہے لیکن — وہ جو ڈوبا ہے، سفینہ ہے کہ ساحل ڈوبا!

تو کہ ہے شناورِ تشنہ لب — جو وقارِ حرمتِ دوستاں
وہی حرفِ مہمل و بے زباں — تری تشنگی نہ مٹا سکا
کوئی جامِ جم، کوئی بادیہ!

دیکھو تو ہر جبیں پہ ہے اِک آشنا سی لَو — سوچو تو اس پاس کوئی رازداں نہ تھا

ہر لمحہ اک صدی سا گزرا ہے کرب سے — دل کو ندامتِ نفسِ رائیگاں نہیں

(شہرِ درد اور غزالاں تم تو واقف ہو میں سے)
مجھ کو قالین پارے بچھانے کی تو مقدرت ہی نہ تھی
راستے میں مگر جتنے کانٹے ملے۔

ان کو اپنے دل و جاں میں پیوست کرتی گئی
ہاں مبادا گزند ان سے پہنچے تمہیں

ٹھہروں، تو چٹانوں سی کلیجے پہ کھڑی ہے جاؤں تو مرے ساتھ ہی دیوار چلے ہے

ان کو صدیوں کی چالوں سے کیا واسطہ
وہ جو لمحوں کی انگلی پکڑ کر چلے
وقت نے ٹھہر کر ان کو تعظیم دی
اور وہ دل جلے سر پھرے
آگے بڑھتے گئے
بارہا راہ میں
جو تھکے بھی نہ تھے، ہم سفر ہو گئے۔
اور اُجاگر مگر راستے ہو گئے

زندگی کی رگوں کو لہو بخش کر
اہلِ دل فرض اپنا ادا کر گئے

آج اس سانس سے بارود کی بُو آتی ہے
میں نے جس سانس کو سمجھا تھا دمِ عیسیٰ ہے

یہی آئینِ وفا ہے اب کے دل دھڑکنا بھی سزا ہے اب کے

ہر نفس کتنی تمنائیں ہیں دامن تھامے کتنے حلقے ہیں سرِ حلقۂ زنجیر کہو ؟

صبح زنداں میں بھی ہوتی ہو گی پھول مقتل میں بھی کھلتے ہوں گے

راہوں میں کوئی آبلہ پا اب نہیں ملتا رستے میں مگر قافلہ سالار بہت ہیں

ٹوٹی مالا کوئی سمیٹے بکھرے سپنے جیون بھر کے

آپ نے دیکھا کہ ادا کی شاعری مسلسل ایک محور پر چل رہی ہے۔ یہ انسانوں کی چاہتوں اور محرومیوں کا محور ہے۔ یہ زندگی کے راستے پر گرتے پڑتے، غلطیاں کرتے، ناکامیوں سے دوچار ہوتے، انجانی منزلوں کی طرف بڑھتے چلے جانے کا عمل ہے۔ "جوہی کلیوں" سے لے کر "مسجد اقصیٰ" تک زندگی کے بے شمار رُوپ اور تجربے ادا کا موضوعِ شعر بنے ہیں۔ وہ انسان کو فطرت کا سوتیلا بچہ نہیں سمجھتیں۔ وہ جتنی ذمہ داری خود اپنے گھر کے لیے محسوس کرتی ہیں، اتنی ہی ذمہ داری اسلام آباد کے سیکٹر شالامار نمبر ۶ کے لیے جس میں ان کا مکان واقع ہے، بلکہ پورے شہر، سارے ملک، تمام دنیا کے لیے محسوس کرتی ہیں۔ جس میں سانس لے رہی ہیں۔ وہ اس پورے عہد کے سامنے اپنے آپ کو جواب دہ سمجھتی ہیں جس کی کہانی وہ لکھ رہی ہیں۔ اسلام آباد کا نقشہ اگر "شہرِ درد" کے خمیر سے اٹھایا جاتا تو مجھے یقین ہے کہ اسلام آباد کے بنگلے میں کوئی "سرونٹ کوارٹر" نہ ہوتا۔ سخاوت کی طرح فرض کی ترشول بھی اپنے گھر کی دہلیز ہی سے پھوٹتی ہے۔

ادب کی قدیم حویلی میں ادا کی بے درد دیوار سی بغاوت" بھی اگرچہ گیارہ گولوں کی سلامی کی مستحق ہے، مگر میرے خیال میں ان کی انفرادیت ان کی بغاوت میں نہیں

ان کے لہجے کی حلاوت میں ہے۔ بغاوت کی "دھوپ" ان سے پہلے بھی شاعری کے صحن میں اتر چکی تھی۔ مگر چاندنی کی جن لکیروں میں اداؔ نے حدیثِ دل زدگاں رقم کی ہے، وہ انہی کا حصہ ہے۔ انہوں نے ہماری اونچی اور گہری فکری شاعری کو، پہلی مرتبہ وہ لہجہ دیا ہے جس میں عورت کا دل دھڑکتا دکھائی دیتا ہے۔ اس لہجے نے عورتوں کی بُنت کا لباس پہن رکھا ہے۔ جس کے پیرہن اور روح سے عورت کے جسم و روح کی خوشبو آتی ہے۔ شاعر صرف حسن دیکھتا ہی نہیں حُسن تخلیق بھی کرتا ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اداؔ کا آدرش حسن و مسرت کی تلاش ہے اور ان کو یہ نکتہ معلوم ہے کہ حُسن، صداقت کا اور مسرت، عدل کا دوسرا نام ہے۔ اداؔ کا شعر، کشیدگیوں، تضادوں اور ناہمواریوں سے کٹی پھٹی انسانی زندگی میں سکندرِ اعظم کی شہزادگی کے زمانے کا ارسطو معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ شانتی کا پرچار نہ کرتا تو سکندرِ اعظم کے ہاتھوں اس کا باپ یا باپ کے ہاتھوں سکندرِ اعظم مارا جاتا۔

اب تو خیر ادبستان کے بہت سے طوطوں اور طوطیوں نے یہ طرزِ نو اختیار کر لی ہے مگر جس وقت اداؔ نے لکھنا شروع کیا تھا، تو یہ اسلوب سورج کی طرح افق پر تنہا طلوع ہوا تھا، یہ دھیما دھیما سا، سرگوشیاں کرتا، گیلی لکڑی کی طرح سلگتا ہوا، ایک عجیب چاک گریباں سا لہجہ ہے جس میں کوئی لفظ اونچی ایڑی کی گرگابی پہن کر نہیں چلتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری، اپنے اصل قد سے زیادہ قد آور معلوم نہیں ہوتی۔ میرے نزدیک اس لہجے کی سب سے دلآویز خصوصیت اس کی وہ تہذیبی انفرادیت اور اپنائیت ہے جس کے لمس سے خیال اور جذبے کے ساتھ ہمارے دیس کے دریا، پہاڑ، کھیت، گاؤں اور شہر، پرچم اور پیرہن بھی چمک اٹھتے ہیں۔ یہ اسلوب، شیرِ مادر کی طرح اتنا سچا اور قدرتی ہے کہ ان کی نظم کو نثر میں ڈھالتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ مصرعوں میں کہیں سلوٹیں نہ پڑ جائیں۔ ایک نظم "میراثِ آدم"

سے ایک اقتباس دیکھئے:

اک کلی کے لیے
اک کرن کے لیے
زہر پیتے رہے
جی گنواتے رہے
غم رسیدہ نہ ہو
دل گرفتہ نہ ہو
آج کی موت بس
آج کی موت ہے۔

یہ اس اسلوب کا فیضان ہے کہ آرٹ ان کے شعر کا گہرائی میں بھی ہوتا ہے استعارے میں بھی اور سطح پر بھی جیسے ان کے ہاتھ کے پکے ہوئے سالن کی پور پور میں مسالہ رچا ہوتا ہے ان کا آرٹ جہاں سطح پر ہوتا ہے وہاں کسی بنیک کے "گن مین" کی طرح مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا، دور ہی سے ٹہلتا دکھائی نہیں دیتا نہ گلی محلے کی روایتی "ماسی مہراں" اور "چاچی تاجاں" کی مانند اپنی اپنی "درد ٹینوں" پر آمنے سامنے بیٹھ کر چیختا چنگھاڑتا ہے۔ یہ ندی اپنی دھن کی نغمگی میں مست بہتی ہے۔ یہ اسی اسلوب کا کرشمہ ہے کہ اونچے آسمانوں کی تیز ہواؤں میں اڑتے ہوئے بھی اداؔ کے شعر کے پَر ٹوٹتے نہیں پاتے اور یہ غالباً اداؔ کے خاندانی گھرانے کا اثر ہے کہ وہ اپنے اسلوبِ شعری میں بھی (IMPRESSIVE) تو ہیں، مگر (EXPENSIVE) نہیں ہیں۔ کہ وہ انقلاب کے داعی ہیں، مگر وہ انقلاب کا کیلنڈر نہیں لکھتیں۔ وہ اپنے عہد کی کہانی بے تکلف لکھ رہی ہیں۔ مگر ان کی شاعری میں کوئی گھڑی ٹک ٹک کرتی سنائی نہیں دیتی۔ انقلاب کی آبرو کو سلامت رکھنا انقلاب برپا کرنے سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ مدتوں پہلے

ادا کی ایک پیش رو، فارسی کی عدیم المثال شاعرہ زیب النسا مخفی نے کہا تھا۔

خندہ برلب، دیدۂ خونبار بودن مشکل است

"ادا اپنے مقدور کے مطابق یہی مشکل کام سرانجام دے رہی ہیں۔

ادا کی ایک نظم کا عنوان ہے "دروپ کے رنگ ہزار"۔ اس طرح محبت کے بھی ہزار روپ ہیں۔ ایک شاعر ہی کیا، محبت کا جذبہ، جملہ فنونِ لطیفہ میں، بادِ سحرگاہی کے نم کی حیثیت رکھتا ہے۔ ادا کی شاعری میں یوں تو اس جذبے کے اکثر رنگوں کی گوہر افشانی ملتی ہے، مگر سب سے گمبھیر ہر محبت کے اس برتر جذبے کی صورت میں ابھرتی ہے جس سے آدمی کے دل میں موت کا خوف کم ہو جاتا ہے۔ جیسے ماں کی محبت، وطن کی محبت، انسانوں کے دکھ درد میں اشتراک، ایک نظم میں انہوں نے محبت کے مختلف رنگوں کی نشان دہی کرتے ہوئے کہا ہے:

محبت ایک راز ہے محبت ایک ناز ہے
محبت ایک خواب ہے محبت اک گناہ ہے
محبت اک نگاہ ہے

کسی خاص جگہ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ میرا مذہب محبت اور امید ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ ایک خاص زاویے سے جذبے کا اظہار، فانوس کی روشنی کی طرح جھلملاتا ہے، جنگل کی آگ کی طرح بھڑکا ہوا نہیں ہے اور نہ عورتیں اور مرد ان کی شاعری میں درختوں سے گرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اردو اور فارسی کے مرد شعراء نے محبت کے موضوع سے جس "سکیل" پر ہاکی کے سٹک ورک کا (STICK WORK) مظاہرہ کیا ہے، میرے خیال میں کسی خاتون سے اس کی توقع نہ رکھنی چاہیے۔ کہ آخر وہ ماں ہے، بیوی ہے، بہن ہے، بہو اور بیٹی ہے۔ ادا نے یقیناً ایک فرسودہ نظام کے خلاف بغاوت کی ہے مگر وہ تہذیبِ دین کی روحانی اور اخلاقی قدروں کی تقدیس میں

بھی اعتقاد رکھتی ہیں جن میں امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک قول کے مطابق ایک قدر یہ بھی شامل ہے کہ "انسانیت کی آبرو، تخت و تاج سے نہیں فقر و حیا سے ہے"۔

ادا کے تینوں مجموعے ملا کر پڑھنے پر مجھے ایسا لگا کہ وہ اردو میں "سیف الملوک" لکھ رہی ہیں۔ مٹھاس، دردمندی، ظلم و جبر کے خلاف جہاد، تفکر اور رسیلی ادا کی وہی موج جو وہاں یم بہ یم ہے، یہاں جُو بہ جُو دکھائی دیتی ہے۔ ممتاز فلسفی والٹیئر کے آخری الفاظ کتابوں میں محفوظ ہیں۔ یہ اس نے اپنے دوست نجمن فرینکلن کے بیٹے سے کہے تھے۔ یہ دو لفظ تھے۔ میرے نزدیک یہ دو لفظ "سیف الملوک" کے ابیات کا محور بھی ہیں اور ادا کی شاعری کا محور بھی اور یہ دو لفظ ہیں:

"خدا اور آزادی"۔

(یہ مضمون مئی ۱۹۷۵ء میں لکھا گیا)

عدم کا وجود

عدم کے نئے مجموعے "آبِ زر" میں ایک شعر ہے۔

قتل کرنے سے پہلے لوگ عدم
خواہشوں کو جوان کرتے ہیں

لیکن جہاں تک عدم کے اپنے تیوروں کا معاملہ ہے، ان کی خواہشات ہمیشہ جوان بلکہ کمسن رہیں گی۔ ان کی خواہشوں کے بعض غنچے بن کھلے مرجھا سکتے ہیں۔ لیکن پھول بننے کے بعد ان پر خزاں نہیں آسکتی۔ یہ خود بوڑھے ہو سکتے ہیں، مگر ان کے خواہشوں کی عینک ور کبھی مدہم نہ ہوگی۔ زندگی کا جو راستہ عدم نے اختیار کیا ہے اس میں آدمی خود بڑھاپے کی طرف مگر خواہشات جوانی کی طرف رواں رہتی ہیں۔ آرزوؤں کا یہی الھڑپن، زندگی کا یہی کبھی نہ بجھنے والا شعلہ ہے جس نے ان کی شاعری کو، ادب کے وسیع سمندر میں، روشنی کا مینار بنا دیا ہے۔ میں نے یہ تذکرہ اس لیے بھی کیا ہے کہ عدم سے جب میں پہلی مرتبہ ملا تھا تو آپ اپنی خواہشات کی "پنیری" کو جوان کر رہے تھے، بلکہ اپنی طبعی عجلت پسندی کے باعث بعض خواہشات کو وقت سے پہلے جوانی بخش رہے تھے۔ خواہشات بھی ایسے خوابوں اور رنگوں سے نکلی اور خوشبوؤں میں لپٹی ہوئیں اور ان کے اوپر طرح طرح کی شرابیں نچڑی ہوئیں کہ ان کی خواہشات

کو دیکھ کر دوسروں کا دم نکل جاتا ہے۔

عدم ان دنوں ابھی ایک پرت کے کھُدبدے سے جوان تھے اور ملٹری اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ کی ملازمت کے سررشتے سے ہمارے شہر جہلم میں متعین تھے۔ آج ان کی ادبی شہرت میں گہرائی اور اونچائی بے شک زیادہ ہوگی۔ لیکن لمبائی اور چوڑائی اس وقت بھی کچھ کم نہ تھی۔ جوش اور عدم کے درمیان اگرچہ ایک پوری نسل کا فاصلہ حائل تھا، لیکن عمروں کی فراواں تفاوت کے باوجود صورتِ حال کچھ ایسی تھی کہ

جوش یوپی میں غزل خواں تھا۔ عدم پنجاب میں

پنجاب میں حفیظ اور اختر شیرانی کے بعد جن شاعروں کی دھوم ہم نے اپنی آنکھوں سے مچتی ہوئی دیکھی ان میں عدم بہت نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ نوجوان عبدالحمید عدم نے ابتدائی ہی کچھ ایسی گلفام و گلبدن نظموں سے کی تھی کہ ہر نظم میں اردو شاعری کی ایک نئی صبح طلوع ہوتی دکھائی دیتی۔ ان کے اولیں مجموعے "نقشِ دوام" کو جو دلوں میں سما جانے والی قبولیت حاصل ہوئی وہ کسی نوجوان شاعر کو شاذ و نادر ہی نصیب ہوئی۔ ان کے طبع شدہ شعری مجموعوں کی "مردم شماری" کا حساب مجھے یاد نہیں لیکن اتنی بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ "نقشِ دوام" کی آب و تاب (ممکن ہے آب و تاب ان کے کسی مجموعے ہی کا نام ہو) آج تک مدہم نہیں ہو سکی۔ اس کی بانکی، ادبی، اجلی، ملائم اور ریشمی نظموں کے باطن میں جرأت مندانہ فکر کی ایک گمبھیر جوالا "بستانِ چراغاں، دیوالی فروزاں" نظر آتی تھی، اس کی چمک اور چھن رنگ اور آہنگ پر پوری شاعری چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگ گئی تھی کہ یہ کون:

یہاں بھی منہ اندھیرے آگیا ہے

عدم کے بزرگوں نے غالباً بربنائے دوراندیشی ان کی شادی نوعمری ہی میں ایک نیک بخت، صابرہ اور سگھڑ قسم کی بہت حوالے کر دی تھی۔ کچھ ٹھیک سے اب یاد نہیں

رہا لیکن جہلم میں آپ تین چار بچوں کے باپ بن کر وارد ہوئے تھے۔ جن کو آپ لاڈ سے گھوڑا، شیر، چیتا وغیرہ کے ناموں سے پکارتے تھے۔ گھوڑا، ان سب میں بڑا تھا، بازار سگریٹ پان لانے کے لیے دوڑنے بھاگنے کا کام گھوڑے ہی کے سپرد تھا۔ (یہ گھوڑے، شیر اور چیتے خدا کے فضل سے اب نہایت اونچے اور اہم منصبوں پر فائز ہیں)۔

معروف افسانہ نگار اور فلم ساز حفیظ رومانی ان دنوں وہیں نہر کے محکمے میں ملازم تھے۔ نہر عموماً بند رہتی تھی۔ البتہ رومانی چلتے رہتے تھے۔ عدم تک میں انہی کے واسطے سے پہنچا۔ ان دنوں، عدم کے بیوی، بچے راولپنڈی میں تھے، اور وہ خود نئے محلے کے ایک پرانے دو منزلہ مکان میں تین چار ہم عمر اور ہم مذاق احباب کے ساتھ گویا ایک چھوٹے سے ہوسٹل میں بود و باش رکھتے تھے۔ یہ سب نوجوان اس دور کے اکثر تعلیم یافتہ مسلمانوں کی طرح، مختلف سرکاری دفتروں میں چھوٹی چھوٹی اسامیوں میں بندھے ہوئے تھے۔ اپنی آدھی سے زیادہ تنخواہ اگرچہ پیچھے بیوی بچوں کو بھیج دیتے تھے، تاہم زندہ دلی اور بے فکری کے اعتبار سے ان کے کنوارپن کا کانچ ابھی ٹوٹنے نہ پایا تھا۔ پاکستان میں یہ سب اصحاب خاصے اونچے اونچے عہدوں تک پہنچے۔ اس وقت ان لوگوں کے اشغال و اعمال سے اتنی امید ضرور بندھی تھی کہ اگر خدانخواستہ ملازمت کبھی جاتی رہی تو گا بجا کر روزی کما لیں گے۔ عدم نامور شاعر تھے، ملک صاحب پکی گائیکی میں ایسی زبردست دستگاہ (دست گاہ اس لیے کہ گاتے وقت وہ ہونٹوں سے زیادہ ہاتھ ہلاتے تھے) رکھتے تھے کہ ان کو بڑودہ یا پٹیالے میں واقع ہونا چاہیے تھا۔ چودھری صاحب طبلے کے رستم اور شیخ صاحب سارنگی دستار کے پروردگار تھے۔ اپنے مکینوں کی طبیعت و سرشت کے لحاظ سے یہ ہوسٹل "بی، ایچ، کیو (BACHELOR HEAD QUA RTER) کہلاتا تھا۔ عدم ان کے "شاہ بادشاہ" تھے۔

"شاہ بادشاہ" دن کو دفتر کی چکی پیستے۔ البتہ شام کو ان کی سلطانی کا دور دورہ شروع ہوتا جس کو "فرخندہ بشیٰ" کے شاعرانہ نام سے یاد کیا جاتا۔ یہ دور بسا اوقات اگلی صبح تک جاری رہتا" بی، ایچ، کیو میں دو وقت کی روٹی کی طرح، عدم کم از کم دو غزلیں (یا نظمیں) عموماً ہر روز کہہ لیا کرتے تھے۔ رات کو سوچی ہوئی غزل ناشتے پر اور دفتر میں اتری ہوئی چیز، سہ پہر کی چائے پر، احباب کو سنائی جاتی "بی، ایچ، کیو" کے باسی نہ باسی طعام کھاتے نہ باسی کلام سنتے۔

چائے کے بعد ساز و آواز کی سبھا جم جاتی۔ اب عدم کی غزلیں ہارمونیم، ستار، سارنگی اور طبلے کی سنگت میں باقاعدہ گائیکی میں ڈھال کر گائی جاتیں۔

روح پرور نام اور القاب یاد آنے لگے
چاند یاد آنے لگے، مہتاب یاد آنے لگے

اور

وہ رکھ رہے ہیں پاؤں حدود شباب میں
محشر کی لو بھٹی ہے، خدا کے حساب میں

اور

چاہا ہے جب کہ تیری وفا کا ثبوت دوں
اپنے خلوص کو بھی ریا کہہ گیا ہوں میں

اور

جو نادان تھے وہ پھول اب تک ہیں تازہ
جو دردِ اندیش تھے مرجھا گئے ہیں

اور پھر جب حمید ملک لمبی بحر کی کسی غزل کو پکڑ کر قوالی کی دھن میں دھننے لگتا۔ مثلاً

وہ سامنے جب آجاتے ہیں یک لخت یہ کیا ہو جاتا ہے
میں دل سے جُدا ہو جاتا ہوں دل مجھ سے جدا ہو جاتا ہے
تو پھر رقص بلند آہنگ کی وہ خاص دھما چوکڑی بپا ہو جاتی ع

جسے اربابِ دانش لغزشِ مستانہ کہتے ہیں

مندرجہ بالا اشعار "آبِ زر" میں سے نقل کیے گئے ہیں۔ لیکن عدم کا شعر ابتدا سے ہی تقریباً اسی سطح و مزاج کا "حرفِ طبیعت زاد" رہا ہے ان کو پیدائشی قادر الکلام شاعر کہنا چاہیے۔ شراب و شباب کے امتزاج سے جو نظامِ فکر وہ اپنے شعر میں کشید کرتا ہے، جس "سلیس آنکھ" سے زندگی کے افکار و حوادث کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اور جس دلیرانہ بلکہ جارحانہ پیش دستی سے حقائق کے چہرے سے گھونگھٹ الٹتا ہے۔ یہ تمام عوامل، ایک واضح جذبے، ایک مخصوص تجربے، ایک لازوال آرزو اور ایک مسلسل ذہنی پس منظر کی صورت میں، عدم کی ابتدائی شاعری میں نفاست و صداقت کے ساتھ، کارفرما دکھائی دیتے ہیں ——— بہر حال ابھی طبلے کی گونج تھمنے نہ پائی تھی کہ اہلِ محفل میں سے کوئی صاحب گھن گرج کے تحت اللفظ میں عدم کا یہ شعر پڑھ کر "فرخندہ شبی" کا گجر بجا دیتے کہ ؎

لرزتے آنچلوں کے گنگنو کرنے کی رُت جاگی
دھڑکتی چھاتیوں کے شعر خواں ہونے کا وقت آیا

اور قافلۂ احباب، سازگیوں کو طے کر، شہر کے بازاروں میں گھومتا ہوا دریا کے کنارے جا نکلتا جہاں دریا کے اندر چپل، دلودار کی موٹی موٹی "گیلیوں" کے بندھے اور تیرتے ہوئے تختوں پر بیٹھ کر نئے سرے سے محفلِ شعر و سخن جم جاتی جس میں دل کی واردات اردو اور فارسی سے گزر کر پنجابی ابیات، ٹپوں اور بولیوں میں ادا ہونے لگ جاتی۔ گویا ؎

جسے جو کچھ بھی آتا جا رہا ہے یاد کہنے دو
بقدرِ ظرف سب کو عشق کی روداد کہنے دو

عدم کو باقاعدہ فکرِ سخن کرتے ہوئے میں نے کبھی نہیں دیکھا لیکن اس کیفیت میں بھی کبھی نہیں دیکھا کہ وہ فکرِ سخن میں مصروف نہ ہوں۔ شعر کہنے کے لیے ان کو کسی خاص ماحول یا فضا کی ضرورت نہ تھی ایسا لگتا تھا شعر ان کے اندر انگوروں، آموں، ناشپاتیوں کی طرح پکتے رہتے ہیں اور وہ توڑ توڑ کر، مضامینِ تازہ کے انبار باہر لگاتے چلے جاتے وہ ان شعرا میں نہیں، جو مناظرِ قدرت پہ کہنے کے لیے پہروں اور دنوں جھیل و لب میں پاؤں لٹکائے بیٹھے رہیں یا ——— سامنے تاج محل ہو تو غزل ہوتی ہے۔!

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ عدم "بی، ایچ، کیو" کے بے تاج بادشاہ تھے احباب، جس ذوق و شوق سے ان کی ناز برداری کرتے اس کو دیکھ کر گمان ہوتا کہ ان لوگوں کو ہوسٹل کا باورچی خانہ چلانے یا عدم کا کلام سننے اور گانے کے سوا دنیا کے کسی کام میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ سچ یہ ہے کہ ان کے خلوص و محبت کی ادا دیکھ کر انسان کا شرفِ سعادت پر ایمان تازہ ہو جاتا تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ مکتبۃ التحریر کے نوجوان مالک جناب خالد سیف اللہ ۱۹۴۰ء میں کس عالم میں تھے لیکن جس ذوق و شوق، لگن، چاؤ اور لگاؤ سے چرکا لِشکا کر انہوں نے "آبِ زر" شائع کی ہے اس کو دیکھ کر خیال کرتا ہوں کہ اگر خالد صاحب اس وقت جہلم میں ملازم ہوتے تو یقیناً بی ایچ کیو کے "گروہ وفاستاں" میں شامل ہوتے۔

اپنی ذات اور اپنے گرد و پیش سے عدم کا سلوک یک گونہ بے خودی کا سلوک تھا۔ تہی کیسہ و خورسند، گرفتار مگر آزاد۔ سفینۂ غزل اور صراحیٔ مئے ناب کے علاوہ کسی شغل و شوق کو عدم نے کم ہی کبھی شرفِ بازیابی عطا کیا ہے۔ البتہ سگریٹوں میں نصف سے زیادہ تنخواہ پھونک دیتے تھے۔ خوش خوری کی خواہش ضرور تھی۔ لیکن اگر کوئی دوسرا پکا پروس کر سامنے رکھ دے، سنا ہے، ایک زمانے میں "پنڈی اسپورٹس کلب" میں کرکٹ کے اسٹار کھلاڑی مانے جاتے تھے۔ ان کا یہ شعر اسی شوق کی عکاسی کرتا ہے ؎

ہمارا بیٹ گزارہ تو کر ہی لیتا ہے بقا، حبیب، امر ناتھ یا نثار آئے

"بی، ایچ، کیو" میں ان کا یہ شوق گو ابھی مرنے تو نہیں پایا تھا۔ مگر زندہ بھی نہیں تھا۔ رغبت کی چنگاری جاگتی تو ان کا جی چاہتا کہ پہلے تو کوئی شخص آ کر ان کو کرکٹ کی کٹ (KIT) میں داخل کر جائے پھر کرکٹ کی تعریف میں ایک آدھ غزل ترنم کے ساتھ سنائے اور پھر آگے میدانِ عمل میں بھی رننگ کومنٹری (RUNNING COMMENTARY) کے ذریعے ہوشیار خبردار کرتا رہے کہ حضور ادھر دیکھیے! حضور اُدھر دیکھیے۔

حضور آہستہ آہستہ، جناب آہستہ آہستہ

البتہ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں شاعری کے ساتھ چوبیس گھنٹے کی لَو لگی رہتی تھی۔ ہم نے پورے عدم کو کسی بیرونی کام کی طرف، صدقِ دل سے، کاملاً متوجہ نہیں دیکھا آدھا عدم آپ سے باتیں کر رہا ہے اور آدھا کسی غزل کے لیے نئی زمین کی تلاش میں خدا معلوم کہاں غائب ہے۔ شیو بناتے ہوئے ایک ہاتھ سے چہرے پر صابن بچھ رہا ہے، لیکن دوسرے ہاتھ سے اپنے اندر کسی تازہ شعر پر استرا پھیر رہے ہیں ؎

ہماری بہتری کی بات اکثر
ہمارے فہم سے باہر رہی ہے

بعض باتوں میں ان کی مستعدی پر حیرت ہوتی تھی۔ ان میں دفتری کی حاضری تھی۔ دفتر کے وقت گھر سے یوں نکل جاتے، جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔ پھر رسائل و جرائد کے ایڈیٹروں سے خط و کتابت کا شعبہ تھا جو "ایڈیٹر نگار" علامہ نیاز فتح پوری سے لے کر منشی خادم حسین حیدری ایڈیٹر "نئی زندگی" تک سینکڑوں ایڈیٹروں تک پھیلا ہوا تھا۔ خطوط کے جواب لکھنے میں اگر آپ ہمہ تن مستعد نہ ہوتے تو اپنی ڈاک میں دب کر رہ جاتے "بی، ایچ، کیو" کے "امیر البحر" جو مقامی واٹر ورکس میں چھوٹے انجینیر تھے عدم کی خط و کتابت کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ اتنی ڈاک اگر کسی یونانی دواخانے کو نصیب ہو جائے تو طبِ یونانی کا نصیبہ جاگ اُٹھے۔ دوستوں سے اخلاص و مروت

کے باب میں ان سے تساہل تو ہو سکتا ہے۔ لیکن تغافل کو عمداً وہ روا نہیں رکھتے۔ وہ چیز جس کو ان کی زندگی کی روشِ خاص کہنا چاہیے دوستی اور دوست داری کے جذبوں سے ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اگر اس وقت آپ ساٹھ برس کے ہو چکے ہیں تو میرا قیاس ہے کہ ان میں سے کم از کم پچاس برس دوستوں کے جھرمٹوں میں گزرے ہیں برس بھی ایسے کہ ؏

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

کچھ عرصے کے بعد، بھابی راولپنڈی سے گھوڑے اور شیر وغیرہ کو لے کر جہلم پہنچ گئیں تو عدم صاحب علیحدہ مکان میں اُٹھ گئے۔ خیال ہوا کہ اب شاید ان کی روانی میں کچھ لکنت پیدا ہو جائے لیکن ان کے شاعرانہ انہماک اور گم شدگی کی بالکل وہی صورت رہی جو پہلے تھی ان کا ایک شعر ہے ؎

ہم کو رغبت ہی نہیں خلقِ فریبی سے عدم
ورنہ ہم صاحبِ اسرار بھی ہو سکتے ہیں،

"خلقِ فریبی" کے علاوہ بھی سینکڑوں باتیں ہیں جن سے آپ کو کوئی رغبت نہیں رکھتے ان میں ایک چیز گھر داری ہے اہل و عیال سے ان کی محبت کی شدت و رقت کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ حجام سے اپنے سامنے گھوڑے کی "نعل بندی" یعنی اس کے ناخن نہیں ترشوا سکتے تھے لیکن گھر کا ——— کارخانہ چلانے کے واسطے لون تیل لکڑی کے کھڑاگ سے ان کو سخت وحشت تھی۔ وہ اپنے گھر کو مسرور، پر اطمینان اور فراغت سے پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے تھے۔ مگر بس ایسے ہی جیسے ان کے شعر آپ ہی آپ پھلتے پھولتے رہتے ہیں۔ غالب کو دشت دیکھ کر گھر اور عدم کو گھر دیکھ کر دشت یاد آتا تھا ؎

بعض راتوں کو عدم ہوتا ہے محسوس مجھے
اتنا مشکل بھی نہیں گھر کا بیاباں ہونا

بہرکیف، امورِ خانہ داری میں خوش دلی سے ان کی شرکت کا سوال پیدا نہ ہوتا تھا۔ بعض اوقات تو یہ گمان ہوتا کہ عدمؔ صاحب کسی دوسرے کے گھر میں رہ رہے ہیں۔ تعاون کے بھرپور مُوڈ (۱۰۰ میں بھی زیادہ سے زیادہ یہ کیفیت ہوتی تھی کہ ؎

نہ الجھا رہے ہیں نہ سلجھا رہے ہیں

ان معاملات میں عدمؔ کی عدمِ دلچسپی یا فراموش کاری کا بھی ایک واقعہ سن لیجیے، بازار میں فرخندہ شبیؒ کی ابتدائی چہل قدمی ہو رہی تھی کہ یکبارگی آپ نے نعرہ لگایا ——— "حضور! کبابوں کی دعوت آج اس فقیر کی طرف سے قبول ہو" لیکن کباب کھانے اور گشت شبینہ بھگتانے کے بعد، رات کے دو ڈھائی بجے ہم لوگ جب ان کو گھر کی ڈیوڑھی پر خُدا حافظ کہنے لگے تو آپ کو ناگاہ یاد آیا کہ گھر سے چلتے وقت بیوی نے یہ کہہ کر کہ ——— "گھر میں آٹا نہیں ہے" ——— پانچ روپے ان کی جیب میں ڈال دیئے تھے اوپر کی منزل میں اس وقت قمقمہ روشن تھا۔ لیکن ——— پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

ان کی مستعدی کے کھاتے سے یاد آیا کہ عدمؔ بظاہر جتنے کھوئے کھوئے، سوئے سوئے رہتے۔ ذہن میں اتنے ہی چوکس ہوتے۔ لوگ گفتگو کر رہے ہوں تو وہ عموماً "ٹیوب" میں چلے جاتے اور پھر ایسا لگتا تھا کہ ان کو طبلے کی تھاپ سے جگانا پڑے گا۔ مگر جہاں کہیں موقع آتا دفعتاً "ٹیوب" سے نکل کر ایسی چمکتی ہوئی بات کہہ جاتے کہ محفل چمک اٹھتی۔ اگر کوئی جملہ نہیں سوجھا تو ہر موضوع، ہر کیفیت، وقت اور موسم کے حسبِ حال کوئی نہ کوئی اپنا شعر یقیناً موجود ہوتا کہ اپنا کلام جس قدر عدمؔ کو یاد تھا کسی دوسرے شاعر کو شاید ہی یاد ہو۔ ان کے بعض حلقہ بگوش نیازمندوں اور ارادت کیش کا تو یہ خیال ہے کہ عدمؔ صاحب کو اپنا سارا کلام زبانی یاد ہے۔ وہ

بھی جو طبع ہو چکا ہے۔ وہ بھی جو ابھی طبع نہیں ہوا بلکہ وہ بھی جو ابھی کہنا ہے۔ سچ تو کہا ہے انہوں نے کہ ؎

عدمؔ تم صرف اپنی ذات کو ورثہ گنوا اپنا
حریفوں کو حدیثِ شوکتِ اجداد کہنے دو

ذہنی مستعدی کے علاوہ، عدمؔ کی ذہنی دیانت داری اور جرات پر بھی حیرت ہوتی تھی صرف گفتگو ہی نہیں۔ سماجی زندگی کے ہر دائرے میں اس کا سارا ریشم کی طرح نرم و ملائم شخص خال ہی خال دیکھنے میں آتا ہے۔ جس طرح میرے پیر و مرشد مولانا چراغ حسن حسرتؔ اپنی نرم گفتاری کے بہاؤ میں اپنے بیٹے کو بھی "مولانا" کہہ جایا کرتے تھے۔ اسی طرح عدمؔ صاحب گلی محلے میں کھیلنے والے ننھے بچوں کو بھی حضور اور جناب کہہ کر بلاتے تھے۔ محبت و مروت، امن و آشتی اور خلق و انکسار کا دوسرا نام عدمؔ ہے۔ وہ دُہرے جثّے کے تنومند شخص ہیں۔ لیکن اس تن و توش میں فروتنی ہی فروتنی بھری ہوئی ہے۔ بعض اوقات تو شبہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی کوئی رائے ہی نہیں رکھتے۔ لیکن جناب کیا مجال جو کوئی بات ایسی جو ان کے نظریۂ حیات سے متصادم ہو یا ان کی رائے میں انسان اور کائنات کی عظمت اور آسودگی کے منافی ہو۔ ان کے شعر کی زد سے بچ کر نکل جائے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ جتنے گفتنی مضامین آج تک "خوفِ فسادِ خلق" کے سبب سے ناگفتہ رہ گئے تھے۔ عدمؔ صاحب ان تمام کو ریکارڈ پر لا کر چھوڑیں گے۔

بعض لوگ اس پر چیں بجبیں ہو کر کہتے ہیں کہ عدمؔ صاحب بعض اوقات "گفتنی اور ناگفتنی" کی حدود میں امتیاز روا نہیں رکھتے جو چنداں مستحسن بات نہیں ہے۔ لیکن دیکھا جائے تو ان کی جارحانہ یلغار کا مقصود ہی یہ ہے کہ حدود ان کا راستہ نہ روک سکیں وہ تو بہرحال وہی بات کہیں گے جو وہ کہنا چاہتے ہیں ؎

قتل گاہوں سے خوف کھا کے عدمؔ
عشق کب راستہ بدلتا ہے ؟

"بی ایچ کیو" سے نکلنے کے کئی برس بعد عدم صاحب سے راولپنڈی میں جی ایچ کیو (G.H.Q) کے قریب ملاقات ہوئی اب وہ حساب کتاب کے محکمے میں افسری کی منزلیں کر رہے تھے۔ جنگ کے دوران میں بغداد اور بصرہ کے قیام سے ذہن بھی اور چہرہ بھی دو آتشہ ہو رہا تھا۔ تنخواہ ہر چند کافی معقول تھی، لیکن ہوش مندی کی طرف کچھ زیادہ ہی رغبت بڑھ چکی تھی۔ کبھی کبھار تو خود ان کے بقول ؎

چاندنی راتوں میں ہم پیتے رہیں گے شب بھر
دورِ مہتاب ہے تھمتے ہی تھمے گا ساقی !

شیشہ و پیمانہ سے عدم کی ہمدمی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں جناب مختار مسعود کے بقول عدمؔ ——— "خرابی اور خرابات کے شاعر ہیں"۔ شراب ان کی گھٹی سے نہیں بلکہ مٹھی سے ملی ہے۔ یعنی جب پیسہ ان کے ہاتھ آیا۔ ان کا ہاتھ سیدھا گردن مینا پر جا پڑا اور عارضی مسرت کو اپنی کمائی کا بہترین معاوضہ خیال کیا۔ درمیان میں کئی مرتبہ "خشکی" کے وقفے بھی آتے رہے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا :۔ "سنا ہے آپ نے شراب چھوڑ دی ہے ؟" فرمایا ——— "میں نے شراب نہیں چھوڑی، شراب مجھے چھوڑ گئی ہے"۔ لیکن اب وہ "دورِ مہتاب" تھمے یا جاری رہے، روحانی طور پر ان کے روزانہ کردار کے استحکام کا عالم یہ ہے کہ ان کی مستانہ وشی اور جانانہ روی کی وہی کیفیت نظر آتی ہے۔

ظاہر ہے کہ گھر کے مسائل و معاملات اب پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ چکے تھے مگر عدم سے ان کا "ذوقِ شکر خند" کون چھین سکتا ہے ؟ چنانچہ ہر وقت نیازمندوں کے ہجوم میں گھرے رہتے۔ معمولات کی ترتیب بلکہ افراتفری میں سرمو فرق نہیں آیا تھا۔ ملاقات

کا وقت باقی صدیقی سے طے ہے اور چلے جا رہے ہیں پروفیسر شوکت واسطی کے ساتھ، مشاعرے کا سیکرٹری موٹر لیے کھڑا ہے۔ مگر آپ نکل گئے ہیں میونسپل کمیٹی کے سیکرٹری کے ساتھ، کہاں گئے ہیں ؟ کیوں گئے ہیں ؟ کب واپس آئیں گے ؟ کسی کو کچھ معلوم نہیں ! عدمؔ ان معاملات میں "مقدم، مقدم" کے اصول پر کاربند ہیں۔ دوستوں کے لیے وہ ہر وقت محبت کی رہگزر پر چشم براہ بیٹھے رہتے ہیں جو پہلے آ گیا، اپنے ساتھ لگا کر لے گیا۔ جو بندھ گیا سو موتی۔ استاد داغ کے اس مشہور مصرعے کو کہ ؎

حضرتِ داغ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے

آپ عموماً اس طرح پڑھا کرتے ہیں !

حضرتِ داغ جہاں بیٹھ گئے لیٹ گئے

عدم صاحب جب تک کلرک رہے۔ ان کے سپرنٹنڈنٹ، یونٹ اکاؤنٹنٹ اور افسرانِ بالا ان سے عموماً خوش رہتے تھے کہ عدم اتنی اچھی انگریزی لکھتے تھے۔ مگر بعض افسرانِ اعلیٰ اس بات پر خفا بھی رہتے تھے کہ عدم اتنی اچھی انگریزی کیوں لکھتے ہیں ! ملازمت میں عدم صاحب کے اپنے طرزِ عمل کی اوسط نکال کر دیکھی جائے تو وہ اپنے افسروں کو عموماً آزردہ اور ماتحتوں کو نہال رکھتے تھے۔ راولپنڈی میں کلرکی کے زمانے میں ایک مرتبہ آپ اپنے بڑے دفتر کی چوبی سیڑھیاں چڑھتے اوپر جا رہے تھے کہ ان کا ہندو سپرنٹنڈنٹ سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔ سیڑھیوں کے وسط میں آمنا سامنا ہو گیا۔ تو لالہ جی نے پوچھا :۔ "مسٹر آپ ایک بجے سے ساڑھے تین بجے تک کہاں براجمان تھے" ؟ ——— عدمؔ نے فوراً جواب دیا ——— "میں جمعہ پڑھنے گیا ہوا تھا" ——— اوپر سے دو مسلمان کلرک اتر رہے تھے۔ لالہ جی نے ان سے پوچھا۔ تم جمعہ پڑھنے کیوں نہیں گئے ؟ انہوں نے جواب دیا ——— "آج تو منگل ہے"۔ اس پر عدم نے برجستہ کہا۔ "منگل ہو یا جمعہ میں تو جمعہ پڑھ آیا ہوں"۔ ظاہر ہے کہ پڑھا ہوا جمعہ مشکل ہی سے واپس

لایا جا سکتا تھا۔

اب افسری کے زمانے میں ان کی بے نیازی اور فراموش کاری کا بھی ایک واقعہ سن لیجیے۔ ملٹری اکاؤنٹنٹ جنرل الحاج شجاعت علی صدیقی مشاعروں سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ایک محکمانہ مشاعرے میں راولپنڈی کے سرکردہ شعرا کو مشاعرہ گاہ یعنی کمانڈ کنٹرولر کے دفتر کے بڑے ہال میں لانے کی ڈیوٹی عدمؔ صاحب کے سپرد کی گئی تھی، اور آپ نے واقعی شہر کے نامی گرامی شعرا کو لا کر اسٹیج پر بٹھا دیا۔ لیکن موٹر کے آخری پھیرے میں جانے کیا پیچ پڑا کہ مشاعرہ مقطع تک پہنچ گیا، مگر عدمؔ کا کوئی سراغ نہ ملا۔ بلکہ ان کے ساتھ دو ایک دوسرے نامور شعرا بھی لاپتہ تھے۔ اگلے روز دفتر میں پیشی ہوئی تو آپ نے اپنے مخصوص بھولپن کے ساتھ الحاج کو خطاب کرتے ہوئے کہا ——— "حضور خدا کی قسم میں آ رہا تھا بلکہ شادؔ عارفی سری کو بھی ساتھ لا رہا تھا۔ اس کم بخت نے مجھے راستے میں ذرا ایک جگہ بٹھا لیا اور پھر ہم وہاں سے چلے تو بخدا پہلے تو ہال نہ ملا اور جب ہال ملا تو مشاعرہ نہ ملا"

میں نے ان کو افسری کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ ڈسپلن کے بغیر کام کے معیار و رفتار کو برقرار رکھنے کا سلیقہ ان پر ختم تھا۔ دفتر کے کلرک تلامذہ غزل کی طرح ہنسی خوشی صبح سے شام تک کام میں جتے رہتے تھے۔ شروع شروع میں تو ہم یہی سمجھتے تھے کہ آپ فائلوں پر ڈرافٹ لکھنے کی بجائے کوئی غزل لکھ کر افسر کی میز پر رکھ آتے ہوں گے مگر قریب سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ عدمؔ نے اپنی ذات سے یکسر منہ موڑ کر اگر کسی چیز سے مفاہمت کی تھی تو وہ ملازمت تھی۔ یوں بھی دفتر میں ان کا عام اسلوب یہی رہا کہ ؎

حشر میں لے کے چلو مطربِ معشوق و سبو غیر کے گھر میں کبھی رات بھی ہو جاتی ہے

عدمؔ صاحب گھر میں ہوں، احباب میں ہوں، کسی "تجلی خانے" یا دفتر کے ظلمت کدے میں، وہ ابھی تک "بی ایچ کیو" سے نہیں نکلے اور یہ وہ منزل ہے:

جہاں تک مسافر بہت کم گئے ہیں !!

اُردو شاعری کا عقابِ اعظم

اگلے روز جب لاہور سے جناب ڈاکٹر صفدر محمود نے یہ اطلاع دی کہ پاکستان نیشنل سنٹر "پرواز عقاب" کی اشاعت پر ایک تکریمی تقریب کا اہتمام کر رہا ہے اور ہماری خواہش ہے کہ تم اس تقریب میں عبدالعزیز خالدؔ کی شاعری پر مقالہ پڑھو، تو میں دل ہی دل میں سر سے پاؤں تک کانپ گیا ——— میں نے سوچا میں تو ان کی بعض کتابوں کے نام پڑھتے ہوئے املا کی چولیں بھی درست نہیں رکھ سکتا، ان کی شاعری پر مقالہ کیا لکھ سکوں گا؟ سو میں نے عرض کیا! خالد صاحب میرے نہایت محترم اور عزیز دوست ہیں۔ میرا اپنا بہت جی چاہتا ہے کہ اس تقریب میں حاضر ہو کر اپنی باہنیں ان کے گلے میں ڈال دوں، مگر آپ جانتے ہیں کہ شعروں کو تنقید کی چھانی میں چھاننے پھٹکنے کا ہنر مجھے نہیں آتا۔ ہاں، اگر کچھ لکھا جا سکا، تو "پرواز" اور "عقاب" دونوں کے بارے میں کچھ رَلی ملی باتیں لکھ لاؤں گا۔ "پرواز" کم ہو گی "عقاب" زیادہ ہو گا۔

سیاست کی دنیا میں تکریم و ارادت کی بنا پر لیڈروں کو القاب دینے کا رواج ایک مدت سے رائج ہے، ایک دو "شیر" ہر عہد میں موجود رہے ہیں "شاہین" بھی دیکھنے میں آیا ہے۔ کچھ دوسرے چرند پرند بھی ہوں گے۔ اس تلازمے پر اگر سرکردہ شعرا کو بھی کو القاب دیئے جائیں، تو میرے خیال میں عبدالعزیز خالدؔ کو اردو شاعری کا "عقاب"

دالے ان کو اپنا عقاب بنالیں گے، کیونکہ اپنی تخلیقی جولانگاہ میں وہ زیادہ تر عربی، فارسی ہی پر جھپٹتے ہیں، اردو کی طرف تو یوں ہی جھپٹے کے وقت لبسیرے کے واسطے پلٹتے ہیں، مگر ہم اردو والوں کو ان کا احسان مند ہونا چاہیے کہ یہ عقاب جب بھی اردو کی طرف آتا ہے عربی اور فارسی کے بہت سے کارآمد الفاظ بھی دور دور سے مار لاتا ہے۔

عبدالعزیز خالد، محاسن و مقاصد سے لدا پھدا شعر کہتے ہیں۔ پاکستان کے سینئر شعرا میں وہ اپنا الگ مسلک، بلکہ مصلّے رکھتے ہیں، اور جس جگہ وہ بیٹھتے ہیں، ان کے آگے کوئی دوسرا بیٹھا ہوا نظر نہیں آتا۔ اور جس سنگلاخ راستے پر وہ چل رہے ہیں، ان کے پیچھے چلنے والا کوئی دکھائی نہیں دیتا، یوں بھی "عقاب" ہمیشہ تنہا اڑتا ہے۔ تلیروں یا مرغابیوں کے مانند غول باندھ کر نہیں اڑتا۔ آپ دو عقابوں کو ایک ہاتھ سے چھوڑ کر دیکھ لیجیے۔ ایک دائیں کو نکل جائے گا اور دوسرا بائیں کو، اپنے معاصر اور ہم چشم پرندوں میں عقاب اونچی، لمبی اور تند و تیز پروازوں کے لیے ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ یہی امتیاز عبدالعزیز خالد کو اپنے معاصر شعرا میں حاصل ہے۔ ان کی شاعری بلند آہنگ بھی ہے، بلند پرواز بھی ——— اور تیز رو بھی، عقاب جہاں گشت پرندہ ہے۔ اس کو پرندوں کا "ابنِ انشا" کہنا چاہیے۔ جو عقاب صبح کے وقت چولستان کے صحرا میں کسی کبکِ دری پر جھپٹا ہے، کچھ عجب نہیں کہ عراق سے آیا ہو۔

خالد کی پروازِ فکر کی رینج (RANGE) نیل سے تا کاشغر پھیلی ہوئی ہے، بلکہ اب تو یہ عقاب دیت نام کی طرف بھی جا نکلا ہے۔ تہذیب و فن، فلسفہ و فکر، بصیرت و حکمت، تاریخ و تمدن، الغرض کائنات اور انسان کا کون سا عنوان ہے جو اس کے بال و پر کے نیچے نہ آیا ہو۔ کہیں کہیں تو بصیرت ہی میں عبادت کا سرور بھی میسّر آجاتا ہے اور کبھی کبھی تاریخ سے گزر کر جغرافیے میں بھی چلے جاتے ہیں۔ مگر یہ نہ سمجھیے کہ وہ پرواز کی تیزی یا تندی میں تاریخ کے جوکھٹے سے نکل جاتے ہیں جیسا کہ بعض اوقات جیٹ ہوائی جہاز اترتے وقت رَن وے

سکتی۔ کیونکہ اپنے فن پر ان کو ایک قسم کی مکمل "جرنیلی کمانڈ" کا عمل دخل حاصل ہے۔ ان کا شعر بیک وقت دل پر بھی دستک دیتا ہے اور دماغ پر بھی۔ ان کا شعر دراصل وہیں جاتا ہے۔ جہاں وہ اس کو بھیجتے ہیں۔ یہ نہیں کہ کئی دوسرے شعرا کی طرح، شعر دل کی طرف روانہ کریں اور وہ جگر میں ترازو ہو جائے۔ یا زیادہ سے زیادہ کوچہ یار میں جا کر بیٹھ رہے کہ

مرنا تری گلی میں، جینا تری گلی میں

ان کے فن و فکر کے مختلف شاداب اور وسیع افقوں کا کماحقہ، تجزیہ کرنا فضلائے تنقید کا منصب ہے۔ میرے ذاتی احساسات میں جو تاثر سب سے زیادہ گہرا ہے، وہ ان کے شعر میں "سچوئیشن" کا عنصر ہے، وہ اپنے قاری کو، شروع سے آخر تک، "پیاں بھار" یعنی (ONTHE TOE) رکھتے ہیں۔ مجھے ان کی کوئی ایسی نظم یاد نہیں آرہی جو پڑھنے کے بعد اچھا خاصا "ہوم ورک" (HOME WORK) نہ دے گئی ہو۔

میں جن دنوں خالد صاحب کو ان کی نظموں کے ذریعے ہی سے جانتا تھا مجھے ان سے ملتے ہوئے کچھ ڈر سا لگتا تھا۔ ان کی نظمیں دیکھ کر گمان ہوتا کوئی عرب شاعر ہے جو ایران میں سے ہوتا ہوا ہمارے ہاں آنکلا ہے۔ بعض اوقات الفاظ کی سطح مرتفع اس قدر دشوار ہوتی کہ آدمی پہلے مصرعے پر ہانپ کر بیٹھ جائے۔ ان کے جاں نثار قارئین کے متعلق ہم نے یہ روایت سنی تھی کہ وہ بے چارے ان کی تصنیفات کو پہلے کئی کئی روز تک اپنے بک شیلف میں مولانا محمد حسین آزاد کے لکھے ہوئے اردو کے قاعدوں کے ساتھ لگائے رکھتے ہیں۔ کہ شاید ان کی صحبت میں رہنے سے یہ قدرے آسان ہو جائیں۔ بہرکیف ہمارے ذہن میں ان کا "امیج" (IMAGE) ایک نہایت ثقہ اور نستعلیق بھرے بھرے اور پھلے پھولے عالم فاضل شخص کا تھا کہ ہم ان کی جوتیاں تو سیدھی کر سکتے ہیں، مگر ان کے گلے سے لپٹ کر قہقہہ لگانے کا حوصلہ نہ رکھتے تھے۔

اور نہ آزرو۔ دراصل ہم طبعاً کم ور اور بے توفیقے لوگوں میں سے ہیں۔ لیکن خالد صاحب اپنی نظموں کی تیزی و تہہ داری، گونج اور فن کاں سے، ان مستعد اور چوکس لوگوں کے زمرے میں دکھائی دیتے ہیں۔ جو اگر اوپر اُٹھ جائیں تو زمینوں اور آسمانوں میں نہیں سماتے اور اگر زمین پر رینگنے لگیں تو چاچا اللہ لوک کے مرغوں کی طرح، دن بھر مارے مارے پھرتے ہیں۔ کچھ یہ وہم سا بھی تھا کہ ان کی گفتگو کا ترجمہ کون کرے گا؟ پہلی مرتبہ جب میں نے کسی رسالے میں ان کی تصویر دیکھی، تو غزالوں جیسا سبک، سڈول، گلیدن سا نوجوان دیکھ کر یقین نہ آتا تھا کہ یہ ہلکا پھلکا متبسم شخص "غزل الغزلات" کا شاعر ہو سکتا ہے۔

یہ تو ابتداء کی بات تھی۔ بعد میں جب ہمیں اپنے دوستوں، مشتاق احمد یوسفی، ابنِ انشا، اور کرنل محمد خان کی وساطت سے ان کے بارے میں یہ اطلاعیں ملنے لگیں کہ خالد صرف شاعر کے طور پر ہی قدرے مشکل ہیں، آدمی کے طور پر نہایت آسان ہیں، تو ہمارا خوف کچھ کم ہوا۔ اور جب دسمبر ۱۹۷۲ء میں ایک روز اسلام آباد میں وہ اچانک میرے دفتر میں تشریف لے آئے تو ان سے مل کر جی نہال ہو گیا۔ ان کے چہرے پر عربی فارسی کی ایک سلوٹ بھی نہ تھی، شاعری جتنی سنجیدہ تھی، باتیں اتنی شگفتہ، شعر پُر تکلف، پُر شکوہ اور مرصع، خود سادہ، درویش منش اور کھلے کھلے۔ شاعری میں فولاد، زندگی میں ریشم بلکہ ان کے الفاظ میں حریر و پرنیاں۔ خالد اس وقت اٹھارہ کتابوں کے مصنف (پروازِ عقاب ان کی انیسویں کتاب ہے) اور اٹھارہ ہی محکموں کے سربراہ تھے۔ اکثر ادیبوں کو ہم نے دیکھا ہے کہ آدھ سیر ہوں تو اپنے کو ڈیڑھ سیر بتلاتے ہیں۔ خالد کے انکسار کا یہ حال ہے کہ حالانکہ ان کی ایک ایک کتاب ڈیڑھ ڈیڑھ سیر کی ہو گی، لیکن وہ اپنے آپ کو ڈیڑھ سیر بھی نہیں کہتے۔

کتابوں کی بات پر یاد آیا کہ آپ نے مجھے اپنی کتابوں کا ایک سیٹ (SET) عطا کرنے کا وعدہ کر رکھا ہے مگر جب کبھی راولپنڈی آتے ہیں، معذرت کر دیتے ہیں ــــ اوہو

یار، میں اس مرتبہ ہوائی جہاز سے آیا ہوں۔ یوں بھی وہ کتابیں درآمد کرتے ہیں۔ برآمد نہیں کرتے۔ ان کے پاس کتابوں کا نہایت وسیع اور وقیع ذخیرہ ہے۔ علم نے ان کا گھیراؤ کر رکھا ہے۔ ان کا بس چلے تو رکابیوں، دیگچیوں وغیرہ کو اٹھوا کر باورچی خانے میں بھی کتابوں کے شیلف رکھوا دیں۔ ان کے گھر کو "دولت خانہ" کے بجائے کتب خانہ کہنا زیادہ موزوں ہو گا۔

عبدالعزیز خالد کی علمی و ادبی پیداوار کی مقدار اور معیار کو دیکھ کر ہمیشہ حیرت ہوتی کہ یہ شخص مضامین نو بہ نو کے انبار لگانے کے لیے اتنا وقت، اتنی یکسوئی کہاں سے نکال لاتا ہے؟ ملاقات ہوئی تو میں نے سب سے پہلے سوال یہی پوچھا کہ حضرت، آپ اپنی اس قدر مصروف زندگی میں اتنا کچھ لکھ لیتے ہیں؟ آپ جیسے مصروف شخص کو ایسی فن کاری شاعری کی اٹھارہ کتابیں لکھنے کے لیے اٹھارہ برس جیل میں رہنا پڑتا ہے۔ اس پر وہ بس مسکرا دیے۔ وہی کاملائل والی سوچ میں ڈوبی ہوئی ہلکی سی مسکراہٹ جو ان کا زیور بھی ہے اور زرہ بھی ؎

نہیں عتابِ زمانہ خطاب کے لائق
ترا جواب یہی ہے کہ مسکرائے جا حفیظؔ

جب ان کو ذرا تفصیل سے دیکھا، تو اندازہ ہوا کہ اگرچہ سرکاری طور پر تو آپ کبھی قید نہیں ہوئے مگر رضاکارانہ طور پر ایک "زنجیرِ رمِ آہو" اپنے پیروں میں ڈال رکھی ہے خالد ان بالغوں میں سے ہیں جن کو قدرت، بصیرت کے ساتھ ساتھ عزم و ہمت کا بھی وافر جوہر عطا کر دیتی ہے۔ یہ لوگ بچپن سے نکلتے ہی شاہراہِ حیات کے تمام موڑ، پُل، پُلیاں اور سنگِ میل گن لیتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ سفر کی سمت ان پر بالکل واضح ہوتی ہے، بلکہ منزل کا نقشہ بھی ہر وقت سامنے رہتا ہے۔

ہوچی منہ کے بقول، ایک سیدھا سادہ سائیس، بے لوث کھرا شخص ــــ چھٹی یا ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے، کہ افلاک سے نالوں کا جواب بھی آنے لگ گیا۔

یعنی اشعار ان پر اثر نے شروع ہو گئے۔ اور یوں لگتا ہے کہ عبدالعزیز خالد نے اسی وقت اس لائن میں "عزیز جہاں" ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ان کی زندگی بہر حال اسی محور پر گھومتی دکھائی دیتی ہے۔ روٹی ایک وقت کھاتے ہیں، شعر دو وقت کہتے ہیں۔ اپنا وزن کبھی بڑھنے نہیں دیتے تاکہ شعر کا وزن بڑھ سکے۔ گھر میں آنے کے بعد، گھر سے باہر کم ہی نکلتے ہیں۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بیگم یا بچے یا ملازم سنتے ہیں، خود دل کی گھنٹی پر کان لگائے رکھتے ہیں۔ ہر وقت کچھ پڑھتے ہیں یا کچھ لکھ رہے ہیں۔ اردو ادبیات کی ذیل میں لکھا گیا شاید ہی کوئی لفظ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوگا۔ مگر جب خود کچھ لکھتے ہیں، تو خالص اپنی فیکٹری کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ نئے نکور، نادر، جڑاؤ، مرصع۔ ان کی تحریریں دیکھ کر بعض اوقات یہ گمان گزرتا ہے کہ وہ دوسروں کی تحریریں پڑھتے ہی نہیں۔ الفاظ ان کے ذہن میں دھان اور گیہوں کی طرح اُگتے ہیں۔ ان کے معمولات اور مشاغل کا بڑا مقصد یہ ہے کہ ان شاعری کی "سپلائی لائن" (SUPLY LINE) میں خلل کوئی نہ آنے پائے مثلاً صبح نہار منہ ورزش میں وہ سر کے بل کھڑے ہوتے ہیں، تو اس لیے کہ ان کا شعر اپنے قدموں پر کھڑا رہ سکے۔ دوسری جنگِ عظیم کا ایک معمر وٹیرن (VETREN) گنز اپینڈ اخان ہمارے یونٹ میں "سویلین آفس بوائے" کے طور پر کام کرتا تھا۔ اس کے تجربات کا نچوڑ تھا کہ توپ کے نیچے زمین جتنی سخت ہوگی، گولہ اتنا ہی اونچا جائے گا۔ خالد صاحب بارہ مہینے زمین پر سوتے ہیں تاکہ ان کا شعر آسمان کی خبر لا سکے۔ وہ زندگی میں لذت سے زیادہ افادیت کے قائل ہیں۔ مونگ پھلی چھلکے سمیت تناول فرماتے ہیں۔ ادب ان کا اوڑھنا بچھونا ہے رات کو دو چار کتابیں تکیے کے نیچے ہوتی ہیں۔ ملازمت غالباً اس لیے کرتے ہیں کہ بال بچوں کے علاوہ اپنے کتب خانہ کا پیٹ بھر سکیں۔ خالد ان اصحابِ خیر میں سے ہیں جو خود تشنہ رہتے ہیں مگر زندگی کو سیراب کر جاتے ہیں۔

ترجمے کے فن میں خالد خاص میلان و ملکہ رکھتے ہیں سیفو ہو یا ٹیگور وہ اصل مصنف کی انگلی پکڑ کر نہیں چلتے، بلکہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کی روح پر ہاتھ ڈال دیتے ہیں۔ ان کا ترجمہ رسمی یا آئینی نہیں ہوتا، ذوقی اور تخلیقی ہوتا ہے غیر زبان کی کافر سے کافر نظم کو مسلمان کر کے وہ اسے کچھ اس چاؤ چونچلے سے اپنے ادبی معاشرے میں جذب کر لیتے ہیں کہ نظم نو وارد تو ہوتی ہے اجنبی نہیں ہوتی۔ بعض اوقات تو وہ دوسری زبان کی نظموں کو گویا بیاہ کر اپنے روپ میں مستقلاً بھی لے آتے ہیں۔

گزشتہ برس جب اسلام آباد میں ان سے ملاقاتوں کا سبب ہوا، تو ترجمے کی طرف ان کا میلان بہت بڑھا ہوا تھا۔ "پروازِ عقاب" کی پروازیں تازہ تازہ اڑ رہی تھیں راولپنڈی کی ادبی محفلوں میں جب کبھی کلام پیش کرتے، انہیں تراجم میں سے ایک آدھ "پرواز" سنا یا دکھا دیا کرتے۔ ایک لمبی پرواز تو ان کی زبان سے ہم نے عین ایک ایسے مقام پر سنی کہ عقاب اگر نشیمن بناتے ہیں، تو اسی جگہ بنانا چاہیے۔ یہ یشتو کے غیر فانی شاعر خوشحال خان خٹک کا مزار تھا۔ ان دنوں ترجمے میں ان کی لگن سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہو چی منہ کے بعد وہ بعض دوسرے مصنفین کا رُخ بھی کریں گے اور ان کی آؤٹ پُٹ (OUT PUT) کی رفتار سے اندازہ ہوتا ہے کہ انشاء اللہ بہت جلد، انگریزی کی کوئی قابلِ توجہ کتابِ شعر، ترجمے کی محتاج نہ رہے گی۔ میری طرح کے ذہنی طور پر پس ماندہ قارئین کو تو یہ توقع بھی ہو چلی تھی کہ خالد صاحب لگے ہاتھوں بعض اپنی کتابوں کا بھی ترجمہ کر ڈالیں گے۔

قدرت نے خالد صاحب کو غیر معمولی طور پر زرخیز ذہن بخشا ہے مگر اس کو جلا، ان کی لگن اور تپسیا سے ملی ہے ان کی زندگی، شعر و ادب کی بہبودی کے لیے ایک مجاہدے کا سا انداز رکھتی ہے وہ جس ریاضت سے اپنے باغِ سخن کی آب یاری کرتے ہیں، اس کا ثمر یہ ہے کہ ان کے باغ میں کچھ ثمر لگتا ہی نہیں اپنی تیز بینی اور تیز رفتاری کی بے پناہ صلاحیت کے صدقے میں، مہینوں کا کام دنوں میں نمٹا دیتے ہیں۔

اس کا تجربہ مجھے ان کے ہمراہ ایک سفر میں ہوا۔

اتوار کی ایک ٹھٹھری ہوئی صبح تھی کہ اچانک خالد صاحب تشریف لے آئے۔ ارشاد فرمایا "چلو خوش حال خان خٹک کے مرقد پہ حاضری دے آئیں۔ یہ میری بھی ایک دیرینہ آرزو تھی پشاور آتے ہوئے اکوڑہ خٹک سے گزرتے وقت دل ہمیشہ مزار کی سمت جھک جاتا۔ مگر مزار سڑک سے چند میل ہٹ کر دامن کوہ کی طرف واقع ہے۔ ادھر ہمارے پاس کبھی وقت نہ ہوتا اور کبھی حوصلہ نہ ہوتا۔ اب تو یہی سوچ رہے تھے کہ شاید مزار خود ہی کسی وقت سڑک پر آجائے۔ ایسے میں خالد صاحب جب یہ تجویز لے کر آئے تو کنوال پیاسے کے پاس چل کر آگیا۔ ہم جیسے بیٹھے تھے، اٹھ کر ان کے ساتھ ہو لیے۔

گھر سے نکلتے ہی ارشاد فرمایا "کہو تو سلطان رشک کو بھی ساتھ لیتے چلیں۔ دوستوں کے بغیر سفر بے مزہ ہوتا ہے۔" میں نے عرض کیا "بے شک سلطان رشک بڑی خوبیوں کا نوجوان ہے۔"

اب سلطان رشک شہر کے ایک ایسے گنجان تجارتی علاقے میں رہتے ہیں کہ ادھر جائیں تو ایسا لگتا ہے کہ سارا شہر اسی علاقے میں رہتا ہے۔ باربرداری کے تمام ریڑھوں، ٹھیلوں، ٹرکوں، اونٹوں اور گدھوں کا ہیڈ کوارٹر اسی علاقے میں واقع ہے بوریوں، کنستروں میں جو سامان باہر سے راولپنڈی آتا ہے پہلے یہیں آتا ہے۔ نکلتا ہے تو یہیں سے نکلتا ہے عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ جو لوگ موٹر کی سواری کے خوگر ہیں وہ انبوہِ عوام میں چلنے پھرنے کے آداب بھول جاتے ہیں۔ اسلام آباد کے میرے ایک دوست نرنکاری بازار میں گھی کا کنستر لینے گئے تو ماتھے پر کنستر کھا کر آئے۔ مجھے ڈر تھا خالد صاحب وہاں کسی ریڑھے سے نہ ٹکرا جائیں مگر خالد صاحب تھے کہ ریڑھوں اور ٹھیلوں وغیرہ کے ہجوم میں اکبر الٰہ آبادی کے مشہور و معروف "آب لو ڈور" کی طرح گزرتے چلے جا رہے تھے ——— سرکتے ہوئے اور سمٹتے ہوئے لچکتے ہوئے اور لپکتے ہوئے۔ ایمرجنسی

ہو تو خالد صاحب سوئی کے ناکے میں سے بھی گزر سکتے ہیں۔ وہ اگر بڑے شاعر نہ ہوتے تو بہت بڑے اتھلیٹ ہوتے۔

ع بحر گر بحر نہ ہوتا، تو بیاباں ہوتا

ٹیکسلا سے کچھ پہلے، جنرل نکلسن کی لاٹ کے پاس، مغلوں کے زمانے کی سڑک کا ایک ٹکڑا اب تک بچا ہوا ہے۔ اس پر نظر جا پڑی تو موٹر روک کر، اس سڑک کی پیمائش کو چل پڑے۔ سڑک تو خیر ڈیڑھ دو فرلانگ جا کر تاریخ میں غائب ہو جاتی ہے لیکن آپ تاریخ کی جس لہر پہ سوار ہو گئے تھے۔ اگر میں اور سلطان رشک، ہاتھ جوڑ کر ان کا راستہ نہ روک لیتے تو شاید رواں کے قلعے میں جا نکلتے۔ خدا کا شکر کہ ٹیکسلا کے کھنڈرات آپ کے چھانے پھٹکے ہوئے تھے۔ مگر ہماری بدقسمتی کہ حسن ابدال میں آپ پہلی مرتبہ قدم رنجہ فرما رہے تھے اور یہ وہ خطہ ہے کہ اس کے چشموں اور شادابی کے باعث اس کو ممتاز انگریز شاعر ورڈزورتھ (WORDS WORTH) کا "دیوانِ مصور" سمجھنا چاہیے۔ کئی آثارِ قدیمہ بھی ان مرغزاروں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ان میں لالہ رُخ کا مقبرہ بالخصوص اس وجہ سے قابلِ ذکر ہے اس میں لالہ رُخ کی قبر سرے سے موجود ہی نہیں۔ خالد صاحب نے ایک ایک چشمے کا گیت سُنا، ہر پرانی عمارت کو گلے لگا کر ملے اور راستے میں جتنی بھی نئی اور پرانی مسجدیں آئیں، ان کے اندر جا کر نمازیوں کی ویلفیئر (WELFARE) کے انتظامات کا جائزہ لیا۔ مگر اس کے معنی تھے سات آٹھ میل کی پیدل گردش اور جب وہ آثارِ قدیمہ کی طرف جاتے ہیں تو چل کر نہیں جاتے، دوڑ کر جاتے ہیں۔ انہیں شاید اس بات کا دھڑکا رہتا ہے کہ ان کے پہنچنے تک آثارِ قدیمہ کہیں بالکل ہی نہ مر جھا جائیں۔

ہمارا اگلا پڑاؤ اٹک کے قلعے پر تھا۔ ہم خیال کر رہے تھے کہ مغلوں کی سڑک اور لالہ رُخ وغیرہ نے مل ملا کر ان کو خستہ کر دیا ہوگا۔ مگر اس بوڑھے قلعے کو دیکھ کر آپ دوبارہ

جوان ہو گئے۔ چنانچہ جوانوں کی طرح کلکاریاں بھرتے۔ فصیلِ قلعہ پر جہاں تک ہاتھ پہنچتا تھا، ایک ایک اینٹ پر دستِ شفقت پھیرتے تاریخ کے ساتھ سرگوشیاں کرتے، دریائے سندھ میں اتر جانا چاہتے تھے۔ مگر اس مہم میں ہم ان کا ساتھ نہ دے سکے۔ اٹک کے مقام پر دریائے سندھ ان کی شاعری سے بھی تین چار مشخص نسبتیں رکھتا ہے۔ مثلاً دونوں بہت گہرے ہیں۔ دونوں کے کنارے بلند ہیں، دونوں بلند آہنگ، آگے جا کر دریا کا پاٹ بھی ان کی شاعری کی طرح چوڑا ہو جاتا ہے۔

خوشحال خان کے مزار پر حاضر ہوئے، تو آپ قلبی کیفیت کے ایک ایسے گہرے اور طویل غوطے میں غائب ہو گئے کہ ہم تو ان کی بازیابی کی طرف سے نا امید ہو چلے تھے۔ ہم نے تو صرف فاتحہ پڑھی۔ آپ خوش حال بابا سے گویا ملاقات بھی کر آئے۔ سچ ہے ؎

کر گس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

مزار پر حاضری کے بعد واپسی کا پروگرام تھا، مگر خالد صاحب بیحد وضع دار انسان ہیں۔ کہنے لگے "کرنل فصیح الدین احمد اور بیگم رضیہ فصیح الدین احمد (اردو کی ممتاز ناول نگار) آج کل رسالپور میں ہوتے ہیں، جی نہیں مانتا کہ اتنے قریب آ کر ان سے ملے بغیر لوٹ جائیں۔"

سو اکوڑہ خٹک سے رسالپور پہنچے۔ مگر اتنے میں پشاور بقدرِ تیس میل ہمارے قریب آ گیا۔ اب وہ احمد فراز، محسن احسان، تاج سعید، فارغ بخاری اور خاطر غزنوی کا تذکرہ کچھ اس پیرائے میں کرنے لگے کہ اگر ہم رسالپور سے راولپنڈی واپس چلے گئے تو یہ لوگ کیا کہیں گے۔ لیکن میں نے اور سلطان رشک نے ان کی ایک نہ چلنے دی، لہٰذا ناچار ان کو راولپنڈی کی طرف چلنا پڑا۔ اور جب ہم راولپنڈی پہنچے، تو رات خاصی بھیگ چکی تھی۔ اور خود راولپنڈی بارش میں بھیگ رہا تھا۔ میں تو اس رات ایسا ٹوٹ کر سویا کہ اگلے روز

دفتر میں بھی دیدہ دل ہی کھول کر بیٹھا رہا۔ البتہ جب سہ پہر کو ان سے ملاقات ہوئی، تو ایک معرکہ آرا تازہ نظم ان سے سننے کو مل گئی اور جب وہ نظم سُنا رہے تھے، تو ملائی زبان کی یہ کہاوت میرے ذہن میں کسمسا رہی تھی۔

"لومڑ مرنے کے بعد اپنی کھال، اور عقاب شہرت چھوڑ جاتا ہے۔"

اور عقاب میرے سامنے بیٹھا رومال سے اپنی چونچ، یعنی ناک رگڑ رہا تھا۔

اُردو ادب کی دخترِ صحرا

میں ایک کم مطالعہ شخص ہوں۔ ناول سے خاص طور پر "الرجک" ہوں۔ محرومی سراسر میری ہے۔ مگر طبیعت ادھر نہیں آتی۔ سارا قصور طبیعت کا بھی نہیں۔ ہم خود بھی تو اپنے حق میں قاتل رہے ہیں۔ بچپن میں جن ناولوں تک ہمارا ہاتھ پہنچا۔ وہ سب کے سب خطِ مستقیم میں فلاح دارین سمیٹنے یا دوسروں کے علاقے فتح کرنے کی غرض سے لکھے گئے تھے

؎ نہ ادائے کافرانہ، نہ ترا شِ آذرانہ

ان میں واقعات و مکالمات کی اتنی فالتو چربی جمع تھی کہ کتاب رحل میں رکھ کر پڑھنی پڑتی۔ کرداروں کی فوجِ ظفر موج۔ ایک لڑکی ورجنوں عشاق کے نرغے میں۔ ایک انارصد بیمار ان کی حاضری کے لیے باقاعدہ رجسٹر رکھنا پڑتا۔ بلکہ دو رجسٹر۔ کیونکہ بیشتر کردار "بستر" میں رکھنے کے لائق تھے۔

دوسری جنگ عالم گیر میں جب جرمنی کی سانس اکھڑنے لگی تو ہٹلر کو مشورہ دیا گیا کہ پہلی جنگ عالم گیر کے "تمغہ درگلو" فیلڈ مارشل وان رن اسٹیڈ کو ریٹائرمنٹ کی چارپائی سے اٹھوا کر، محاذ جنگ پر "اٹن شن" کر لو۔ اس پر فیوہرر نے جواب دیا۔ رفیقو! اس جھٹ پٹے کے سمے کسی چنک مٹک پھرتیلے جرنیل کا نام بتاؤ جو مٹھی بھر سپاہیوں کو لے کر دشمن کی صفوں میں گھس جائے۔ رن اسٹیڈ جیسا کلاسیکی فیلڈ مارشل تو پچاس ڈویژن فوج کے بغیر لڑائی

کا پنیترہ باندھنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ ایسے ہی کنیڈے کے ایک سپہ سالار سے ہمارا سابقہ ایک تاریخی ناول میں پڑ گیا تھا۔ موصوف گھڑ سواروں کے میر لشکر تھے۔ ناول کے پہلے تین ابواب جسے غالباً کمانڈر انچیف کے "ڈائریکٹری مونٹ" (REMOUNT) نے قلم بند کیے تھے۔ گھوڑوں کے حسب نسب، چال چلن، خوراک مع ناشتہ اور گھوڑوں کو لاحق ہونے والی بیماریوں کی تفصیل سے لبریز تھے۔ راگ سے جیسے باجا۔ اگلے باب میں لشکر یلغار بولنے پر آیا تو یکایک کوارٹر ماسٹر جنرل نے انکشاف کیا کہ گھوڑوں کی کاٹھیاں تو تمام "اشوغ" (ASS) ہو چکی ہیں۔ جنوبی محاذ کا سامان شمالی محاذ پر پہنچ گیا تھا پانی کی چھاگل کا خانہ تو موجود تھا مگر نیزہ اڑسنے کا خانہ، کارخانے ہی میں رہ گیا تھا کسی سابقہ معرکے میں شاید گھوڑوں کی "کیجولٹی" (CASUALTY) بھاری ہو گئی تھی۔ یا شاید ان کی وفاداری ڈگ مگا گئی تھی کہ اس مرتبہ سپہ سالار نے ایک ایک گھوڑے پہ دو، دو سوار بٹھا رکھے تھے۔ ہاتھی کے دانتوں کی طرح، ان میں سے ایک سوار کھانے یعنی لڑنے کے لیے تھا اور دوسرا دکھانے یعنی بڑ بڑانے کے لیے تھا۔ نمبر ا کا فرض ہلّہ بولنا تھا جس کی نوبت ناول کے خاتمے تک نہ آ سکی۔ البتہ نمبر ۲ جو پیچھے سے نعرے لگاتا، یا کوئی نغمہ الاپتا یا تحت اللفظ میں خطبہ شجاعت پڑھتا۔ واقعی بے حد مصروف تھا۔ نیزہ بھی اسی کی تحویل میں لٹک رہا تھا۔ گھوڑے بدک کر اگلے سُم اٹھاتے تو بیس بیس صفحات دوڑتے چلے جاتے۔ وہ تھمتے تو اگلے بیس صفحات میں خطبۂ شجاعت گونجتا رہتا ؎

من و گزر و میدان و افراسیاب

ان ناولوں کے پڑھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جیسے سانپ کی دہشت نہیں ہوتی، کچھ ایسی ہی دہشت ناول کی طرف سے ہمارے دل میں بیٹھ گئی۔ آج تک یہ عالم ہے کہ چوڑے ہاڈ کا ٹھ کا ناول دیکھ لوں تو دل بیٹھ جاتا ہے بقول شاد عظیم آبادی ؎

کہاں سے لاؤں صبر حضرتِ ایوبؑ اے ساقی خُم آئے گا، صراحی آئے گی، تب جام آئے گا

محترمہ جمیلہ ہاشمی کے لکھے ہوئے کی میں نے جتنی شہرت سنی ہے، اتنا ان کا لکھا ہوا پڑھا نہیں۔ میں نے رسائل میں شدہ شدہ ان کی کہانیاں پڑھی ہیں، یا اب اس تقریب کے لیے اپنے آپ کو لیس کرنے کی خاطر ان کی اوّلین تصنیف ناول "تلاش بہاراں" اور تازہ ترین کتاب "اپنا اپنا جہنم" پڑھا ہے۔ تلاش بہاراں "پوری" جہنم "تین چوتھائی" تلاشِ بہاراں" جس پر انہیں آدم جی انعام ملا۔ ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی اور تقریباً ساڑھے سات سو صفحات پر محیط ہے۔ درمیان میں "آتش رفتہ" اور آپ بیتی جگ بیتی" ان کی دو اور کتابیں چھپ چکی ہیں۔

بہت سی مشکلات آدمی اپنے لیے خود پیدا کرتا ہے۔ مثلاً میری بہت سی مشکلات میری اس عادت کی پیداوار ہیں کہ میں فیصلے تو شاید صحیح کرتا ہوں۔ مگر کرتا عموماً غلط وقت پر ہوں۔ یہی دیکھیے کہ مجھے اس تقریب میں لکھنا تو "اپنا اپنا جہنم" پر تھا۔ مگر لکھ لایا ہوں "تلاشِ بہاراں" پر۔ حالانکہ یہ نئی کتاب انسانوں کی نئی نسل کی طرح "تلاشِ بہاراں" کی بہ نسبت کہیں چھریری اور سمارٹ تھی "لہو کا رنگ" "زہر کا رنگ" اور "شبِ تار کا رنگ" کل تین جہنم۔ یعنی تین طویل مختصر افسانے یا مختصر طویل ناول۔ آدمی اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے۔ شناسی سے فارغ مگر ہم نے سوچا کہ ان کے ادبی سفر کا "کھرا" نقطۂ آغاز سے کیوں چلائیں۔

کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

اصولی طور پر تو یہ فیصلہ کچھ غلط نہ تھا کہ آگے کی بات سمجھنے کے لیے پیچھے کی بات کا سمجھنا ضروری ہوتا ہے، البتہ ایک غلطی جو کتاب سے زیادہ حساب کی غلطی تھی، یقیناً سرزد ہوئی وہ یہ کہ اس فیصلے کے بعد دونوں کتابوں کا مطالعہ کرنے کے لیے وقت، مجھ ایسے نوکری پیشہ شخص کے پاس نہیں رہ گیا تھا۔ مطالعہ بھی کوئی "رَن تھرو" (RUN THROUGH) مطالعہ نہ تھا کہ آدمی فرائے بھرتا، اسٹیشن چھوڑتا، اڑا چلا جائے۔ ذمہ داری کا تقاضا تھا کہ عبارت چبا چبا کر پڑھی جائے۔ صرف و نحو کے ابروؤں کو ٹھہر ٹھہر کر دیکھا جائے اور مغز

استخواں کو خوب ٹھونک بجا کر پرکھا جائے کہ ——— ابھر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟ اِدھر تقریب اتنے میں سر پر آپہنچی۔ بغیر "تلاشِ بہاراں" تو ہم نے پڑھ لی۔ البتہ "اپنا اپنا جہنم" کے "لہو رنگ" میں داخل ہو کر "زہر رنگ" سے نکل ہی رہے تھے کہ ہماری کتاب، ہمارے محترم جناب غلام عباس صاحب اٹھا کر لے گئے کہ اس تقریب کی صدارت کے لیے کچھ "ساز و یراق" صاحبِ صدر کو بھی درکار تھا۔ قصہ مختصر۔ اب یہ بسیط ناول ہے اور ہم ہیں دوستو!

دیر سے اُٹھ کے کیے آیا میر
جس کو چاہے خدا خراب کرے

یوں "اپنا اپنا جہنم" بھی جتنا کچھ ہم نے دیکھا "تلاشِ بہاراں" ہی کا نورِ چشم معلوم ہوا۔ اس کا پیرہن البتہ زیادہ جھلملا ہے۔ کٹ (KUT) منی ہے، کسا ہوا بھی زیادہ ہے اور رفتار بھی تیز ہے۔ پیرہن سے خیال آیا کہ بے شک کتاب کے اندر بھی انسانی اندوہ کی آگ لگ گئی ہے۔ لفظ "جہنم" کی املا کی چڑھی ہوئی تیوریاں اور کھنچی ہوئی بھنویں دیکھ کر ہی آدمی سہم جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے، جیسے شردھا اور شانتی کے مندر کے سامنے کوئی خشمگیں جہنت آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے۔ میرا آبائی وطن جہلم ہے۔ میں نے تو پہلی خواندگی میں "جہنم" کو جہلم ہی پڑھا۔

رسمِ زمانہ کے مطابق، چاندی کے ورقوں والے چند تقریظی جملے بھی، سرورق کی بغلی جھالر پر آراستہ کیے گئے ہیں کہ جا ایں جا است۔ ہر جملہ، اتنا سجل، من موہن اور میٹھا پڑھنے سے ذہن میں مصری گھلنے لگے۔ بہاول پور کا خطۂ جمیلہ کا مسکن ہے، پیروں، فقیروں کی سرزمین ہے۔ غالباً اسی رعایت سے یہ چند جملے تعویذ کے طور پر، کسی نقاب پوش فقیر سے لکھوائے گئے ہیں۔ اور نہایت برمحل عنوان کے تحت یعنی "فقیر کا مشورہ"۔ ویسے اگر یہ رسم چل نکلی تو سپاہی ادیب میجر صدیق سالک کی کتاب پر کسی

جرنیل کے رشحاتِ قلم درج ہوں گے اور عنوان ہوگا "کارِ امروز" (ORDER OF THE DAY)

جمیلہ ہاشمی ہمارے ادب کی بڑی دھوم دھامی شخصیت ہیں۔ انہوں نے ادب کو چمکایا بھی ہے اور چونکایا بھی۔ پنجاب کی سرزمین کے ٹھیٹھ دودھ دہی میں نہائے ہوئے پس منظر میں کڑے بجاتے اور چمٹے کھڑکاتے ہوئے، گیتلے ہرنام سنگھوں اور "سکھنے دی لاٹ ورگی" ہرنام کوروں کی اندرونی و بیرونی زندگی کی جیسی بھرپور، توانا اور "سوادلی" عکاسی جمیلہ نے کی ہے کسی دوسری خاتون افسانہ نگار نے نہیں کی ——— یا نہیں کر سکی۔ یا مجھے اس کا علم نہیں۔

میں قیاس کر رہا تھا کہ تلاشِ بہاراں کا تار بھی سکھوں ہی کے گریبان سے کھینچا گیا ہوگا۔ مگر دیکھا تو اس ناول نے زنانہ پہن رکھا ہے۔ یعنی ہندوانہ معاشرت میں رنگا ہوا ہے اور لطف یہ کہ وہ اس فضا میں اسی طرح "ایٹ ہوم" (AT HOME) نظر آتی ہیں جیسے مچھلی پانی میں۔ یہ کوئی اوپر اوپر سے چھلکے چوکے کی لیپا پوتی نہیں۔ وہ تو صدیوں کے پاتال میں اتر کر دیو مالائی رسموں، ریتوں کی روح کو کھرچ لاتی ہیں۔ اور جب ان کے سایوں، رنگوں اور جذبوں کو قلم بند کرتی ہیں تو برج بھاشا کے ہلکے پھلکے، بانسری بجاتے ہوئے بانکے بہاری لفظوں میں سے سچ مچ کا سوم رس چھلکنے لگتا ہے۔ چنانچہ "تلاشِ بہاراں" کے مطالعہ سے جتنی آگہی آتی ہے، اتنی ہی ہندی اور سنسکرت بھی آ جاتی ہے، یہ ناول تو خیر انہوں نے تمام کا تمام ہندوستان کے جغرافیے میں لکھا ہے۔ لیکن فضا کہیں کی بھی کیوں نہ ہو۔ "تلاشِ بہاراں" اور "اپنا اپنا جہنم" میں ایک بات طے معلوم ہوتی ہے۔ کہ اپنے ہاں کے جانے پہچانے، عزیز و اقارب مسلمان کرداروں اور آس پاس، اوپر تلے کی زندگی کو وہ اپنا موضوع نہیں بنائیں گی ——— یہ ایک عجیب نازک سا سوال بلکہ سوالیہ ہے۔ جس کے لیے کسی مصنف سے جواب طلب بھی نہیں کیا جا سکتا مگر یہ سوال پوچھنا بھی پڑتا ہے؟

یہ ناول آزادی کے ہنگامہ پر برپا ہونے والے خوں آشام فرقہ وارانہ فسادات کی ہولناک پرچھائیوں میں لکھا گیا ہے۔ جب برصغیر کے باسیوں نے انسان کا چولہ نوچ کر، وحشی درندوں کے دانت اور پنجے اور کھالیں اوڑھ لی تھیں۔ گویا جمیلہ نے پت جھڑ کی زبردست آندھی میں، موسم بہار کی تلاش شروع کی ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں۔ اس ناول کی بنیادی "تھیم" (THEME) عورت ہے ———

عورت کی مظلومیت، آزادی، انفرادیت، اس کے خواب، آرزوئیں، سو، سو بار مرنے جینے کی ادا، عربدہ جوئی۔ کج کلاہی قلم کو کروشیے کی طرح استعمال کرتے ہوئے جمیلہ نے ایک کہانی میں کئی کہانیاں بن ڈالی ہیں اور یہ سب کہانیاں، زندگی کی باہوں میں باہیں ڈال کر چلتی ہیں۔

خیالات کی اکائیاں، ان کے فن میں، سوالات کی صورت میں ابھرتی ہیں

کیا عورت ایک چٹان ہے؟ کیا اس کو پتھر کا روپ بھلا لگتا ہے؟ کیا وہ انارکلی بننا پسند کرتی ہے؟ کیا وہ ایک الگ ہستی ہے؟ کیا عورت اپنے سے بہتر عورت کو برداشت نہیں کر سکتی؟ کیا انسان کئی راہوں کا مسافر ہے؟ محبت دکھ ہے؟ سکھ ہے، سکون ہے، راستہ ہے، منزل ہے، کیا ہے؟ ——— کیا انسان کے چاروں طرف اندھیرا ہے، تنہائی ہے؟ یہ اور ایسے کتنے ہی دوسرے سوالات سینۂ آدم میں کھٹکتے، خون میں لتھڑے قدم قدم پر قاری کے ذہن کو چونکاتے چلے جاتے ہیں۔ جمیلہ کا مقصود، ادراکِ صداقت اور انکشافِ حقیقت ہے، ناول ان اندھیروں، اور تنہائیوں سے گزرتا ہوا سچائی کی تلاش کا ایک راستہ ہے کہ ؎

فسانے میں حقیقت سے زیادہ لطف ہوتا ہے
حقیقت کو برائے مصلحت افسانہ کہتے ہیں

"تلاشِ بہاراں" میں کرداروں کا اچھا خاصا میلہ جمع ہے۔ ساہوکار، کاشت کار،

مہاراج، مانجھی، برہمن، ویش، دانش ور، صحافی، طبلچی پھران کے آگے فن کار، ہوس کار، نیکوکار، الغرض بھانت بھانت کی مخلوق۔ حتیٰ کہ ایک انگریز خاتون اور ایک انگریز مرد بھی، لنگوٹی باندھ کر ہندوانہ سوسائٹی کے اندرونی سنگھٹن میں کود پڑے ہیں۔ اس ہجوم کو دیکھ کر ماتھا بھی کچھ ٹھنکا کہ کہیں فیلڈ مارشل رَن اسٹیڈ کی طرح "مڈی دَل" تو اکٹھا نہیں کیا جا رہا! لیکن اس سارے ہجوم کو مصنفہ نے جس خوش اسلوبی سے نظم و ضبط کے سانچے میں ڈھال کر، ہر کردار کو اپنے اپنے کام دھندے پر لگا دیا ہے اس کو دیکھ کر ان کی، انتظامی صلاحیتوں پر بھی ایمان لانا پڑتا ہے۔ واقعات ایک قدرتی بہاؤ میں تیرتے ہوئے آتے ہیں اور کردار؟ کیا مجال جو کوئی ایک منشی بھی کہیں بیکار بیٹھا ہوا، خواہ مخواہ کھانستا، مٹھلتا یا اونگھتا ہوا ملے۔ حد یہ ہے کہ ساڑھے سات سو صفحات میں، کنول کماری ٹھاکر جیسی، آکسفورڈ پاس سوشل کاموں میں شرابور، کالج کی پرنسپل، انتہا درجے کی خلیق اور مہمان نواز خاتون کے گھر میں اس کی ملازمہ نیرا یہی کوئی دو چار مرتبہ چائے لے کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوتی ہے۔ کنول کماری کوئی ذیلی کردار نہیں کہ جگنو کی طرح ٹمٹما کر بجھ جائے۔ وہ ناول کی سرکاری "ہیروئن" ہے۔ جو کہانی کے ساتھ ساتھ بلکہ ساری کہانی کو اپنی مٹھی میں لے کر اس طرح چلتی ہے کہ اگر خدانخواستہ وہ کہیں جائے تو بظاہر کہانی کے آگے چلنے کا کوئی انتظام نظر نہیں آتا۔ تو جناب اسی کیفیت میں، شروع سے آخر تک۔ اگر دو تین دیگ چائے مہمانوں اور ملاقاتیوں میں تقسیم ہو جاتی تو یہ کوئی "اسرافِ بے جا" نہ ہوتا۔ مگر جمیلہ کی جبرس نگاہوں نے کہیں بھی چائے کا لنگر نہیں کھلنے دیا۔ اور یہ فن اس کی کڑی گرفت کا ثمرہ ہے کہ پھیلاؤ کے باوجود یہ ناول پایاب نہیں۔ نہ ہی قاری کو کہیں الجھن یا تکان کا احساس ہوتا ہے۔ جمیلہ کا فن، توازن کے حسن کا فن ہے دو ایک جگہوں پر مثلاً مشرق و مغرب کے مابین گویا "مواڑ نہ انیس و دبیر" شروع ہو گیا ہے یا پھر جہاں شوبھا بیز جی، لمبے لمبے خط لکھنے بیٹھ جاتی ہے۔ اس بے مثال توازن میں قدرے جھول کا احساس ہوتا ہے۔ مگر یونہی بس ذرا سا جھونٹا، ورنہ پھر وہی ان کا رسیلہ انداز نگارش حواس پر گلاب اور چنبیلی کی پنکھڑیاں برسانے لگتا ہے۔

کہانی میں اگرچہ زیادہ تر ——— عورتیں آپس میں لڑتی ہیں۔ مگر فلسفیانہ سطح پر، عورت اور مرد کے درمیان ایک مناظرے کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ کہیں کہیں تو یہ ناول عورت کی طرف سے مرد کے خلاف باقاعدہ "چارج شیٹ" (CHARGE SHEET) کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ لیکن جمیلہ کے سلیقے، رکھ رکھاؤ اور عالی ظرفی کو آفرین کہیے کہ کوئی ہلکی سی تلخی بھی کہیں پیدا نہیں ہونے پائی۔ اس کا اہتمام انہوں نے یوں کیا ہے کہ اگر کہیں کوئی کرخت بات ناگزیر ہو گئی ہے تو وہ عورت ہی سے کہلوائی ہے۔

"تلاشِ بہاراں" میں یوں تو کئی اونچے اونچے اور گہرے گہرے مسئلے اٹھائے گئے ہیں، مگر سب مسئلوں کی پیڑی انسان اور عورت کی طرف بچھی ہوئی ہے۔ وہ عورت کی انفرادیت کی پُرجوش حامی ہیں۔ مگر آزادی کی اتنی آنچ کھائی ہوئی صورت بھی انہیں پسند نہیں جس سے عورت میں کرختگی آ جائے۔ اس کے پیکر میں بھی اور روح میں بھی عورت کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی غرض سے، جمیلہ نے اپنے ناول میں عورتوں کو بڑی بڑی کٹھن آزمائشوں سے دوچار کیا ہے اور علم و دانش کے موتیوں سے کاڑھی ہوئی قیمتی چادر ان کے سر پر ڈالی ہے۔ لیکن ڈھاک کے وہی تین پات کہ عورت باہر سے کچھ بھی ہو، اندر سے محبت کی جویا رہتی ہے۔ یہ بات نہ ہوتی تو کنول کماری ٹھاکر جیسی چٹان کے روپ میں، آکسفورڈ پاس عورت علم و دانش کی پوتھی اتنی خالی خالی، پھٹی پھٹی اور ویران ویران کیوں نظر آتی کہ جیسے ——— ویراں ہو بھرا شہر بیاباں سے زیادہ ——— محبت کی آسودگی کے بغیر کنول ٹھاکر بھی کچھ ان چڑیلوں کی طرح لگتی ہے جن کے بارے میں جمیلہ نے لکھا ہے کہ:

"شروع سے آخر تک، زندگی کی ایک تنہائی سے دوسری تک پیڑوں پر بیٹھی رہتی ہیں۔"

ادب میں جمیلہ کا غلغلہ محض مسائلِ حیات کی گتھیاں سلجھانے کی وجہ سے نہیں ہے اس میں خوبیٔ تحریر کا بھی نمایاں شائبہ شامل ہے۔ جمیلہ کے اسلوبِ نگارش کی دلیومالائی ملاحت ملائمت، کا کچھ ذکر پہلے آچکا ہے۔ مگر اس سلسلے میں اس دوسری بنیادی چیز کو ہم نے الگ باندھ کر رکھ لیا ہے۔ وہ چیز ہے ان کے اسلوبِ تحریر پر مناظرِ فطرت کی دھوپ چھاؤں۔ یہ دھوپ چھاؤں ان کے اپنے زرعی ماحول کی طمانیت، شادابی اور کھلے پن سے عبارت ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ریت کے ٹیلے، بادل اور ستارے درخت، پھول، پتے، کپاس اور سرسوں کے کھیت ان سے باتیں کرتے ہیں۔ فطرت سے اس گہرے اور شیر و شکر رابطے نے ان تحریروں کو ہرا بھرا بنا دیا ہے۔ وہ فطرت کے کسی منظر کو دیکھتی ہیں تو اس کا سارا رنگ تمام روشنی، اپنی روح میں جذب کر لیتی ہیں اور پھر دیوداسیوں کی سی لگن کے ساتھ یہ سارا رنگ، یہ تمام سونا، اپنی تحریر میں گھول دیتی ہیں۔ جمیلہ اردو کی دخترِ صحرا ہے۔ "تلاشِ بہاراں" جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا، اس دور کی عکاسی کرتی ہے۔ جب ہندوستان اور پاکستان آزادی کی دہلیز تک آ پہنچے تھے۔ یہ زمانہ برصغیر میں شدید سیاسی خلفشار اور انسانی کرب کا زمانہ تھا۔ تاریخ ایک فیصلہ کن دوراہے کی طرف مڑ رہی تھی۔ "تلاشِ بہاراں" کا مطالعہ کرتے وقت، یہ احساس خاصی دور تک، ذہن میں سرسراتا رہتا ہے کہ خیالات کا دھارا قیامِ پاکستان کے خلاف جا رہا ہے۔ کبھی بینا کہتی ہے ——— "بٹ کر ملک کی شکتی کم ہو جائے گی" ——— کبھی کوئی دوسرا کردار ڈونڈی پیٹتا ہے ——— ہم مر کر بھی ہندو مسلم نہیں ہو سکتے۔ ہم صرف انسان ہیں" ——— لیکن میری بڑی میری بھول تھی۔ میں یہ بھول رہا تھا کہ ناول کے کرداروں کی زبان میں تو اس وقت کی اجتماعی ہندو ذہنیت بول رہی تھی۔ وہ لوگ بول رہے تھے۔ جو زبانی کلامی تو انسانیت کا دعویٰ کرتے تھے۔ مگر جب فسادات کی آگ بھڑکی تو انہوں نے بھیڑیوں کا روپ دھار لیا۔ ان سے تو وہ طوائف اچھی رہی

جس نے مظلوم مسلمان لڑکیوں کو اپنے گھر میں پناہ دی۔ میرے نزدیک کہانی جوں جوں آگے بڑھتی ہے واقعات کا دھارا، ایک قدرتی و منطقی انداز میں پاکستان کی حمایت کی طرف رُخ کر لیتا ہے۔ جیسے حقائق بین السطور سے چھلک اٹھے ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جمیلہ عوامل کی نشاندہی باقاعدہ سنگ میل نصب کر کے نہیں کرتی۔ اور یہ بھی کہ اس کے بات کہنے کا ——— خوش دل و گرم اختلاط، سادہ اور روشن حسین انداز ——— نفرت کے شعلوں کو ہوا دینے والا نہیں۔ اس کا آدرش محبت ہے۔ وہ امن اور شانتی کی دیوی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ نفرت کے شعلے بھڑکتے ہیں تو سب سے پہلے ان میں عورت بھسم ہوتی ہے، اس کا جسم بھی، اس کی رُوح بھی ——— جمیلہ نے کسی مقام پر ایک جملہ لکھا ہے ——— "وہ جب ہمیں اپنے بازوؤں میں لٹکا کر چک پھیریاں دیتا تو یوں لگتا، جیسے آنکھوں میں تارے گھوم گئے ہیں" ——— "تلاشِ بہاراں" زندگی کو ایسی ہی "چک پھیریاں" دینے والے آدرشوں کا صحیفہ ہے ہے۔ ہر موڑ پر قدریں ٹوٹتی، اصول پاش پاش ہوتے نظر آتے ہیں۔ زندگی کے لہولہان راستے پر، قدم قدم، دلوں کے ٹوٹنے کی صدا سنائی دیتی ہے۔ آرزوں کا شاید ہی کوئی نگینہ ٹھیس سے محفوظ رہا ہو۔ افق کو کہر کے دبیز کمبل نے اندھا اور بہرا کر رکھا ہے۔ کائنات، لاشوں سے پٹا ہوا میدانِ جنگ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن پھر عجیب بات ہے کہ دل میں امید کی قندیل بجھنے نہیں پاتی۔ بلکہ دھند اور دھوئیں کی اس اوڑھنی میں سے، ہر آن، ایک زندہ و تابندہ پیکر طلوع ہوتا نظر آتا ہے۔ جمیلہ کا اپنا پیکر ——— ایک عورت کا پیکر ——— اس عورت کا پیکر جس کی بازیافت کے واسطے "تلاشِ بہاراں" لکھی گئی ——— وہ عورت، جو حیات کی قوت بھی، نمو بھی اور آبرو بھی ——— جو اس کے بقول ——— ایک ہیرے کی طرح اپنے ہر نئے رُخ سے، کسی اور ہی رنگ میں چمکتی ہے ع

سینوں میں تپش ہے کبھی شورش ہے سروں میں کیا چیز بسا دی گئی مٹی کے گھروں میں

ادب میں لال قلعوں کا معمار

میرے دوست ایوب محسن موٹروں اور لاریوں کے ایک وسیع "فلیٹ" کے مالک ہیں۔ چنانچہ بات بھی سمندِ ناز پر سوار ہو کر کرتے ہیں۔ ایک روز ٹیلی فون پر فرمایا "پنڈی میں طفیل صاحب کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔"

میں نے کہا "نہایت مناسب تجویز ہے۔" پھر میں نے اپنے مافی الضمیر مولانا ابوالکلام کے ایک جملے میں لپیٹ کر اس طرح پیش کیا "محاسن کا حق ہے کہ ان کی شہادت دی جائے۔" ایوب محسن بولے "آپ کو اسی شہادت کے لیے طلب کیا گیا ہے، آپ طفیل کے بارے میں ایک شخصی مضمون لکھیں گے۔" اس پر میں نے معذرت کے لہجے میں اپنی مشکلات کی نشاندہی کی۔ عرض کیا۔ ان کے کارناموں کی تو میرے دل میں بے حد قدر ہے۔ لیکن ان سے ذاتی ملاقاتوں کی پونجی بہت ہی قلیل ہے۔ گنتی کی دو تین ملاقاتیں۔ وہ بھی ایسی بھاگتی دوڑتی ہوئی کہ صورت نظر آ جائے۔ مگر صورتِ حالات نظر نہ آئے۔ ایوب محسن کے جواب کا لبِ لباب یہ تھا کہ رجز میں رَمل یعنی طفیل میں نقوش ملا کر چلیے کہ طفیل اور نقوش کوئی الگ چیزیں نہیں ہیں۔ ایوب محسن نے آخر میں کہا۔

"آپ نے طفیل کو جتنا دیکھا ہے اتنا ہی سہی۔"

میں نے کہا "تو پھر شخص نہیں ہو گا شخص پارا ہو گا۔"

وہ بولے "منظور!"

"نقوش" اردو کے ان جملوں میں سے ہے جو گھٹنوں چل چل کر جوان نہیں ہوئے بلکہ براہِ راست عالمِ شباب میں پیدا ہوئے اور غالباً اپنی عمر کے معاصرین میں تنہا جملہ ہے کہ کچھ مدت ہسپتال میں رہنے کے باوجود اس کی صحت اور جوانی میں کوئی فرق نہیں آنے پایا بلکہ اس کی چھب اور پھبن میں برابر اضافہ ہوتا چلا گیا۔ طفیل اس کے روحِ رواں تھے۔ مگر روح رواں کی طرح اندر ہی اندر کہیں گردش کرتے رہتے تھے۔ ابتدا میں ایک خاصی مدت تک وہ مکتبۂ فروغِ اردو زیادہ اور "نقوش" کم تھے۔ نقوش کا غلغلہ عام تھا۔ مگر طفیل کا نام خواص تک ہی محدود تھا۔

میری ان سے پہلی ملاقات ۱۹۵۰ء میں ہوئی۔ ہم لوگ یعنی کرنل مسعود احمد کیپٹن انعام اللہ قاضی اور میں ان دنوں راولپنڈی سے "بادِ شمال" کے نام سے ایک روزنامہ نکالتے تھے جس کے قدم ہمارے قدم کی طرح جمنے سے پہلے اکھڑ چکے تھے۔ انعام قاضی ہمارے شعبۂ انتظامیہ کے "باس" تھے۔ طفیل ان کے چھوٹے بھائی عطاء اللہ قاضی کے ساتھ دیوارِ دبستاں پر لام، الف لکھتے رہتے تھے۔ سو ایک روز انہیں عطاء اللہ کے طفیل، طفیل صاحب ہمارے دفتر میں آ نکلے مگر بس چھوٹے مشرقی بھائیوں کی طرح بڑے بھائیوں کے سامنے مراقبے میں بیٹھ کر چلے گئے۔ انعام قاضی چونکہ ان سے زیادہ ان کے بزرگوں کو جانتے تھے۔ لہٰذا تعارف پر بزرگانہ شفقت کی دودھ ملائی چھڑکتے ہوئے بولے "طفیل بہت ہی شریف لڑکا ہے....."

طفیل اس وقت واقعی، ایک پتلا دُبلا، نوخیز، شرمیلا سا لڑکا ہی تھا۔ طفیل گئے تو مسعود آ گئے۔ مسعود ہم دونوں کے "باس" تھے، اپنے اندر جھانک کر، اپنی کوتاہیوں کو ڈھونڈ کر اپنے آپ کو لعنت ملامت کرنے کے عمل میں خود اپنی ذات کا ان سے زیادہ سخت گیر دشمن کم ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ اخبار کے معاملات میں ہماری تن آسانی اور

بے تدبیری پر وہ اپنے سمیت ہم تینوں کو لعنت ملامت کرتے رہتے تھے۔ اب اخبار کے "تین بڑوں" کی کانفرنس شروع ہوئی انعام نے انتظامی امور کی تمہید بھی طفیل ہی کے نام سے اٹھائی۔ بقول شخصے ؎

موضوعِ گفتگو تو مری جاں کچھ اور تھا
دورانِ گفتگو میں تری بات آ گئی

کہنے لگے "ابھی ابھی طفیل اٹھ کر گئے ہیں"

"اچھا وہ اپنے آرڈیننس والے طفیل راجہ" ——— مسعود بولے "سنا ہے۔ اب لیفٹیننٹ کرنل ہو گئے ہیں"۔ ارے بھئی وہ تمہارا طفیل نہیں، ہمارا طفیل" انعام نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ مکتبۂ فروغِ اردو والا طفیل، بھئی اس لڑکے نے کمال کر دیا۔ سوچتا ہوں، ہم بھی اخبار بند کر کے مکتبہ کھول لیں"۔

مسعود نے تجویز کو یک قلم رد کر دیا۔ بولے "اخبار تو خود بخود بند ہو جائے گا۔ لیکن ہم سے مکتبہ بھی نہیں چل سکتا۔ کوئی سا بھی کام ہو، اگر اس کے پیچھے بھرپور لگن نہ ہو ——— بے پناہ محنت نہ ہو، مکمل منصوبہ بندی نہ ہو، تو کام آگے نہیں بڑھتا"۔ مسعود نے یہ بات طفیل کے حوالے سے نہیں کہی تھی۔ لیکن طفیل نے زندگی میں عزت و اہمیت کا جو مقام حاصل کیا ہے، میں سمجھتا ہوں یہ بڑی حد تک ان کی اپنے کام میں سچی لگن، بے پناہ مشقت اور جامع منصوبہ بندی کا ثمرہ ہے۔

۱۹۵۰ء کے بعد لگاتار اٹھارہ برس تک ان سے کسی باقاعدہ ملاقات کا کوئی موقع نہ آیا۔ طفیل صاحب اس عرصے میں پیچھے ناشر کی مسند سے اٹھ کر آگے ایڈیٹر کی کرسی پر درآمد آ بیٹھے تھے اور ترتیب کے علاوہ تخلیق کے مراحل میں بھی بڑی تیزی سے نقش آرائی کر رہے تھے۔ آپ نے کچھ اس دھج دھوم، شان اور شکوہ قامت اور جسامت کے خاص نمبر شائع کئے کہ بابائے اردو کے لیے نقوش کا خاص شمارہ "رسالہ کا ہے کو تھا

توپ خانہ تھا"۔ پطرس نمبر دیکھ کر علامہ نیاز فتح پوری نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اگر طفیل میری موت پر اسی ڈیل ڈول کا نمبر شائع کرنے کا وعدہ کریں تو میں ابھی مرنے کو تیار ہوں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ خاص شمارے نکالنے کا سلیقہ رکھتے ہیں جسامت ہی نہیں "نقوش" کی صحت بھی قابلِ رشک ہوتی ہے۔ وہ محنت، ذہانت اور نفاست سے اپنے خاص شماروں کو علم و ادب کی تاریخی دستاویز بنا دیتے ہیں۔ میں تو کہوں گا کہ وہ ادب اور تہذیب کی حفاظت اور سربلندی کے واسطے عظیم الشان قلعے تعمیر کرتے ہیں۔ اور ان شہ نشینوں اور شیش محلوں، درباروں اور دالانوں میں دور دراز کی دشوار گزار کانوں سے ایسے ایسے موتی اور ہیرے کاٹ کر، ڈھونڈ کر، سجا دیتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ نقوش کے ہر خاص نمبر پر حرفِ آخر نہ سہی، حدِ آخر کا گمان ضرور ہوتا ہے۔ لیکن ادبیات کا یہ کولمبس "ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی نیا" براعظم" ڈھونڈ لاتا ہے۔ "نقوش" طفیل کی محبت کا سودا ہے۔ یہ الگ بات ہے اور خوشی کی بات ہے کہ یہ محبت راس بھی آ گئی ہے۔

جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں۔ اس عرصے میں میری ان سے کوئی باقاعدہ ملاقات نہ ہو سکی البتہ ایک بے قاعدہ سی ملاقات مسلسل جاری رہی۔ میں جب کبھی لاہور جاتا ایبک روڈ پر چودھری عبدالحمید کے مکتبۂ کارواں پر عموماً ضرور جاتا۔ طفیل صاحب کا مکتبہ ان کی بغل میں واقع تھا۔ سو اس کوچے میں آتے جاتے ان کو ایک نظر دیکھ لیتا تھا۔ کبھی پروف پڑھ رہے ہیں، کبھی کتابیں بیچ رہے ہیں۔ کبھی ادیبوں کے سامنے چائے رکھ کر خود ان کی صورت تک رہے ہیں، کبھی لکھنے میں مصروف۔ کبھی کاغذوں کے سامنے گتھے ہوئے۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی مجھے دیکھتے ہوں گے اور جیسا کہ بعد میں خود انہی سے معلوم ہوا واقعی دیکھتے تھے۔ لیکن دونوں طرف سے بس وہی نگاہ استعمال ہو رہی تھی۔ جو بظاہر نگہ سے بھی کم ہوتی ہے۔ خدانخواستہ ہم میں کوئی کھچاؤ نہ تھا۔

البتہ ملاقات برائے ملاقات کے لیے بے دست و پا کر دینے والا کوئی ذاتی لگاؤ بھی موجود نہ تھا۔ نہ اس طرف تمنا تھی نہ اس طرف طلب آخر میں جیب بھید کھلا تو بیچ میں سے غالب کا مصرعہ نکلا ؎

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

طفیل اس مغالطے میں تھے کہ میں ان کو پہچان نہیں رہا۔ میں اس غلط فہمی میں تھا کہ وہ مجھے نہیں پہچان رہے۔ واقعہ یہ تھا کہ خواہ کوئی کتنا ہی رانی خان ہو خواہ مخواہ تعلقات پیدا کرنے کے شوق میں راستہ روک کر کسی سے ملاقات کرنے کے نہ وہ قائل تھے نہ میں۔ مجھے طفیل کی یہ ادا پسند آئی۔

مئی ۱۹۶۸ء میں ماہنامہ "اردو ڈائجسٹ" کے نامور مدیر جناب الطاف حسین قریشی نے میرے مکرم دوست اور اردو کے صاحبِ طرز مزاح نگار کرنل محمد خان کی کتاب "بجنگ آمد" کی رونمائی کے لیے لاہور میں ایک تقریبِ خاص کا اہتمام کیا تو وہاں طفیل صاحب سے بھی ملاقات ہو گئی اور نہ معلوم انہوں نے کرنل محمد خان، کیپٹن صدیق سالک اور مجھے اگلی دوپہر کو ایک ہوٹل میں کھانے کی دعوت دے دی۔ اور نہ معلوم کیوں ہم نے یہ دعوت قبول کر لی۔ دعوت میں جا کر محسوس ہوا کہ انہوں نے دعوت کا تردّد غالباً یہ دیکھنے کے لیے کیا تھا کہ ہم لوگ کھانا کتنا کھاتے ہیں اور کس طرح کھاتے ہیں؟ وہ کھانے میں تو شریک ہوئے لیکن گفتگو کا صرف ایک آدھ لقمہ ہی لیا یا دیا۔ ادھر کرنل محمد خان اور میں بھی ٹیبل ٹاک کے دھنی نہیں، نتیجہ یہ کہ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کا لمبا چوڑا کورس تیس چالیس منٹ میں ختم ہو گیا۔ ہوٹل سے آپ ہمیں اپنے ادارے میں لے گئے۔ اور ازراہِ محبت نقوش کے تازہ تین منزلہ خطوط نمبر کے گرانڈیل مگر دلنواز پیکٹوں کا تحفہ عطا فرمایا۔ ان سے رخصت ہوئے تو "خطوط نمبر" ہمارے ہاتھ میں تھا بلکہ ہم اس کے ہاتھ میں تھے۔ "نمبر" کیا تھا نمبروں کا بریگیڈ تھا۔ جس کے ساتھ مسلسل کئی روز

تک پر لطف نبرد آزمائی جاری رہی اب بھی خود ہم محاذ چھوڑ گئے ہیں۔ ورنہ وہ بدستور راستہ روکے کھڑا ہے۔ بعض اوقات خاموشی ہی خاموشی میں جو مسافت طے ہو جاتی ہے وہ گفتگو میں نہیں ہوتی۔ اب جو ملاقاتوں کا دروازہ کھلا تو دو تین ماہ بعد راولپنڈی میں ایک ہی دن میں، ان سے دو ملاقاتیں ہو گئیں۔ جن میں ہم نے ان کے منہ سے چند ایسے چمکتے ہوئے فقرے سنے کہ بس لطف ہی آ گیا ؎

سنگ یوں ترشا کہ رخسارِ بتاں بننے لگا

محاورے کی رُو سے لوگ عموماً دو چار ملاقاتوں میں کھُل جاتے ہیں۔ طفیل صاحب کے بارے میں فی الحال یہ اندازہ تو ہو گیا ہے کہ وہ دو چار ملاقاتوں میں کھلتے نہیں پاتے۔ لیکن یہ اندازہ ابھی نہیں ہو سکا کہ کتنی ملاقاتوں میں کھل سکتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض لوگوں سے وہ پہلی ملاقات میں ہی کھُل جاتے ہوں اور بعض سے کھلتے ہی نہ ہوں یعنی ؎

اُو بود من نہ بودم و من بودم اُو نہ بود

البتہ ان ملاقاتوں یہ احساس ضرور ہوا کہ آپ بولتے کم ہیں دیکھتے، سنتے اور سمیٹتے زیادہ ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، اس میں احتیاط سے زیادہ ان کے انکسار کا اقتضا بھی شامل ہے پھر ان کی مسلسل اور گراں بار مصروفیت؟ ؎

کہ اپنے سائے سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

نقوش کا کوئی خاص نمبر ہی پوری زندگی کی مصروفیت کے لئے کافی ہوتا ہے۔ اس حالت میں ان جیسے مصروف شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ بولنے پر لکھنے کو اور کام کرنے کو ترجیح دیں۔ شاندار اور دیرپا کارنامے سرانجام دینے والے افراد میں یہ خوبی عموماً موجود ہوتی ہے۔ ——— بہرحال یہ سب میرے ذاتی قیافے ہیں جو قبل از وقت بھی ہو سکتے ہیں ؎

نہیں زنجیر بھی محرم کہ دیوانوں پہ کیا گزری

طفیل صاحب کی ذات کو جب میں ان کی تحریروں، ان کے کارناموں اور ان کی زندگی کے آئینے میں دیکھتا ہوں تو ایک ایسے شخص کا امیج (IMAGE) ابھر کر سامنے آتا ہے جو کسی بلند، دشوار گزار پہاڑ کی تلہٹی کی پیدا ہوا ہو۔ بے وسیلہ بے سروسامان لیکن فیضانِ قدرت سے فیض یاب اس نے چوٹی کی طرف دیکھا اور پہاڑ کو سر کرنے کی امنگ اس کے دل میں پیدا ہوگئی۔ لوگ مسکرائے کہ میاں ——— چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے؟ نہ تیشہ، نہ رسّی نہ آکسیجن، بعضوں نے برملا ٹوکا کہ پہلے اس پہاڑ کا جغرافیہ تو پڑھ لو۔ تم اس کے پیچ وخم سے ناواقف ہو۔ چوٹی کی ہوا میں تمہاری سانس رک جائے گی۔ تمہارے لیے بس یہی کافی ہے کہ اوپر جانے والے لوگوں کے لیے نیچے ترائی سے پانی، راشن سپلائی کرتے رہو۔ یہ اندیشے بے بنیاد بھی نہ تھے۔ مگر یہ شخص اپنی دھن کا پکا تھا۔ وہ سفر پہ روانہ ہوگیا اور دنیا دیکھ رہی ہے کہ وہ کس طرح قدم قدم پر اپنے ہاتھوں سے پتھر اور چٹانوں کو تراشتا ہوا چوٹی کی طرف برابر بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ نقوش کے مختلف خاص شمارے، اس طویل کٹھن سفر کے مختلف مرحلوں پر طفیل کے آباد کردہ وسیع اور شاداب کیمپ ہیں۔ وسیع سے وسیع تر، خوب سے خوب تر کیمپ نہیں، قصبے اور شہر وہ انجنیئر ہی نہیں "آرکی ٹیکٹ" یعنی خلاق بھی ہے۔ دنیائے ادب کے ان شہروں میں اس کے اپنے ذہن سے نکلے ہوئے خیابانوں کا حسن بھی دیدنی ہوتا ہے شخصیت نگاری میں اس کا سبک، میٹھا، بے تکلف اور شگفتہ اسلوب اپنی ایک الگ چھل بل اور کشش رکھتا ہے۔ طفیل، میرے نزدیک لگن، خلوص اور دریافت کے اسی فاتح جذبے کا نام ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ طفیل پہاڑ کی چوٹی کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ یہ میں نے اس لیے کہا کہ اس پہاڑ کی کوئی چوٹی نہیں ہوتی۔ اس کی چوٹی افق کے ساتھ ساتھ بلند ہوتی چلی جاتی ہے۔

لگن اور محنت کی بات کرتے ہوئے خود طفیل نے اپنے بارے میں ایک جگہ لکھا

ہے کہ ——— ایک ایک نمبر پر اتنی اتنی محنت کی ہے کہ ان کی جان پر بن آئی ہے جن دنوں کوئی خاص نمبر زیرِ ترتیب ہوتا ہے تو اس کا دس بارہ پونڈ وزن کم ہو جاتا ہے پچھلے دنوں ملاقات ہوئی تو ان کا وزن دس بارہ پونڈ بڑھا ہوا نظر آیا۔ قارئین کو "نقوش" کے ایک اور خاص نمبر کی توقع رکھنی چاہیے۔!

(۱۹۷۰ء)

ادب کا حجرۂ شاہ مقیم

راولپنڈی ریلوے اسٹیشن کے نواح میں علاقہ صدر کی آبادی کا ایک حصہ محلہ فضل حق کے نام سے موسوم ہے۔ اس محلے سے گزرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ پہلے پہل علاقہ صدر کی آبادی اسی محلے کے گلی کوچوں سے نکل کر اِدھر اُدھر پھیلی ہوگی۔ بڑی سڑک سے محلہ کے اندر جائیے تو ایک محراب دار ڈیوڑھی سے گزرتے ہی ایک چھوٹا سا چوک آتا ہے جس میں سے پتلی پتلی گلیوں کی ترشول نکل کر گھروں میں جذب ہو گئی ہے۔ عزیز ملک کے آبائی مکان کی دہلیز اسی چوک سے اٹھتی ہے۔ آج سے نصف صدی پہلے کے دیسی شرفا کی تمدنی ضروریات کے مطابق تعمیر شدہ یہ مکان، دو الگ الگ مردانہ اور زنانہ حصوں میں منقسم ہے۔ زنان خانے کی بڑی حویلی میں ان کا گھر بستا ہے۔ مردانے کی بیٹھک میں یہ خود لیٹے رہتے ہیں۔ اس طرف جتنی ترتیب، اس طرف اتنی بے ترتیبی۔ کمرہ بے شک خاصا بڑا ہے۔ مگر پچھلے تیس برس سے کاغذ کا جو پرزہ ایک مرتبہ اس نیم روشن "عزلت آباد صدف" کے اندر آگیا ہے پھر باہر نہیں جانے پایا۔ کمرے میں ایک پلنگ ایک میز، چند الماریاں اور چند کرسیاں رکھی ہیں۔ جہاں ہی سائز کے میز پر، جو نہ جانے کب سے ان کے پلنگ کی پٹی سے لگا ہوا ہے، کتب و کاغذات جمع اشیا متفرق کا اتنا بڑا انبار جمع ہو گیا ہے کہ کوئی ملاقاتی جب پہلی بار یہاں

آئے تو کچھ دیر تک اس کی سمجھ میں یہی نہیں آتا کہ میز کہاں سے شروع ہوئی اور عزیز ملک کہاں ختم ہوئے بارہا ایسا ہوا کہ میں نے میز سے "بالِ جبریل" اٹھاتے ہوئے عزیز ملک کا گھٹنا بھی اٹھا لیا۔ انہوں نے اپنی ضرورت کی ہر چیز یا یوں کہیے کہ آنسو کی ہر بوند کو گوہر نایاب بنانے کا سارا کارخانہ اسی میز پر جمع کر رکھا ہے نتیجہ یہ کہ ضرورت کے وقت ان کو یہاں مطلوبہ چیز کم ہی مل پاتی ہے۔ ایک روز شیو بنانے کا بُرش ڈھونڈ رہے تھے۔ مل نہ رہا تھا۔ البتہ جدھر دیکھیے میز ہو یا کرسی، بس کتابیں ہی کتابیں نظر آتی تھیں ——— کتابوں سے اگر کوئی جگہ بچ گئی ہے تو وہاں قطار اندر قطار، چھوٹی بڑی بوتلیں کھڑی ہیں۔ جن سے کبھی ان کا آبائی مطب آباد تھا۔ علم کتابوں میں، ہنر بوتلوں میں ان کے بچوں بیچ عزیز ملک آتش دیدہ گیلی لکڑی کے مانند سلگتا ہوا، مزید برآں منہ میں سلگتا ہوا سگریٹ بھی۔ اردو زبان کے صاحبِ طرز مزاح نگار شاعر نذیر احمد شیخ مرحوم اس کمرے کو راولپنڈی کا ادبی "حجرہ شاہ مقیم" اور عزیز ملک کو راولپنڈی کا قطب کہا کرتے تھے کہ کوئی دوسرا دوست گھر پر ملے نہ ملے، عزیز ملک اپنے حجرے میں ضرور مل جاتے۔ راولپنڈی شہر کی گزشتہ تقریباً چالیس برس کی ساری ادبی تاریخ میری نظر سے گزری ہے، اس عرصے میں راولپنڈی کی اپنی مٹی سے جو دو چار ادبی آستانے ابھرے ہیں ان میں عزیز ملک کا حجرہ ایک بلند "پگوڈے" کی حیثیت رکھتا ہے۔

"راول دیس" عزیز ملک کی دسویں کتاب ہے۔ اتنی ہی دیگر تصانیف کے "مسودات" آنکھوں میں کاجل کی ڈوری تک سجے ہوئے، ان کے حجرے میں پڑے ہیں۔ اس موقع پر، مجھے کہنا تو یہ چاہیے تھا کہ "راول دیس" زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آگئی ہے۔ مگر یہ میں نے عمداً نہیں کہا کیونکہ عزیز ملک کی تصانیف زیورِ طبع سے تو آراستہ ہوتی ہیں لیکن منظرِ عام پر آنے کی بجائے ان کے حجرے میں پڑی رہتی ہیں۔ عزیز ملک دورِ حاضر کا ایک باکمال انشا پرداز ہے۔ اس کی تخلیقات عصری ادب کی پہلی قطار میں

جگہ پاتی ہیں۔ اس کی سی، بالغ، پرشکوہ، سروقد، من بھاؤنی نثر آج تک کم اہلِ قلم لکھ سکے ہیں۔ وہ کاتنے اور بھاگنے کا قائل نہیں۔ وہ ایک لفظ چُن کر، تول کر، تراش کر لکھتا ہے۔ اس کے فقرے کو نچوڑ کر دیکھیے، ایک بوتل خون چھلک کر باہر آجائے گا اس کا اپنا خونِ جگر۔ وہ اپنے موضوع کو پہلے پرندوں کی سی ماہتا کے ساتھ "چوگا" کھلاتا ہے۔ پھر قرطاس پر منتقل کرتا ہے۔ اس کا تو انا اور تیکھا اسلوبِ نگارش اس کی اپنی ٹکسال کا ڈھلا ہوا سکّہ ہے جس پر اس کے نام کی مہر کندہ ہوتی ہے تخلیق، ترتیب کے عمل میں، وہ قدم قدم پر، اپنی روح کی آگ اور اپنی نگاہ کے حسن کو کچھ اس فن کاری سے ہم آہنگ کرتا ہے کہ اس کے الفاظ شعلۂ گل کی طرح دمک اٹھتے ہیں۔ اس کی نثر پنجاب کے دیہات کی ان صحت مند سڈول سندریوں کی طرح ہے جو پنگھٹوں سے بھرے ہوئے دو، دو گھڑے سر پر رکھ کر ہنستی، بولتی، اٹھکیلیاں کرتی چلی جاتی ہیں۔ اس کے فن کا موضوع، زندگی ہے، زندگی کی محرومیاں، تلخیاں خوبیاں اور برائیاں سبھی کچھ۔ صناعی اور نقطۂ نگاہ کی آنچ نے اس کی تحریروں کو بیک وقت عظمت و دلبری کا ایک مہابلی بنا دیا ہے۔ وہ اردو ادب میں موتیوں کا سوداگر ہے۔ مگر ادب میں جتنا اس کا مرتبہ ہے، اتنی اس کی شہرت نہیں ہے، شہرت، فی زمانہ آتی نہیں، لائی جاتی ہے۔ یہ ایک الگ ہنر ہے جو عزیز ملک کو نہیں آتا ؎

آنچہ بر شیخ حلال است حرام است اینجا (گرامی)

وہ کتاب سوچنا اور لکھنا جانتا ہے مسودے کی ناک نقشے کو "موتی بند کر کے" اس کی اشاعت کی تمت تک مستعد رہتا ہے۔ مگر جب کتاب کے بندھے ہوئے بنڈل اس کے حجرے میں آکر انبار ہو جاتے ہیں تو پھر ؎

جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

عزیز ملک سے میری دوستی بے خبری میں شروع ہوئی۔ یہ ہوتا بھی پہلی نگاہ

کا سودا ہے یہ ۱۹۳۵ء یا شاید ۱۹۳۶ء کی بات تھی میں گورنمنٹ کالج کیمبل پور میں اور عزیز ملک گارڈن کالج راولپنڈی میں پڑھتا تھا۔ انہی دنوں ہمارے ایک مشترکہ دوست بشیر اثر کی شادی ہوئی تو اس تقریب پر دوستوں کی جو منڈلی چکوال میں جمع ہوئی۔ ہم دونوں پہلی مرتبہ وہیں ایک دوسرے سے ملے۔ عزیز ملک، اس وقت سرخ و سپید، شوخ و شنگ نوجوان تھا۔ پھرتیلا، ہنسوڑ، جگت باز، چست جامہ، رگ رگ میں شرارت کی بجلیاں بھری ہوئیں۔ ایک دوسرے کی لکھی ہوئی اردو تو ہم نے بہت بعد میں جا کر دیکھی اور پرکھی، البتہ اردو بولنے میں عزیز ملک کا لب و لہجہ اس وقت بھی سطح مرتفع پوٹھوار سے بلند معلوم ہوا۔ اب تو خیر ایک مدت سے وہ اپنی نثر کی لطافت اور لہجے کی کھنک سے ادبی مجالس کو مشاعروں کی طرح لوٹ لیتا ہے لیکن اُن دنوں بھی جی چاہا کرتا کہ وہ بولتا جائے، ہم سنتے جائیں۔ الفاظ ایک ناقص ذریعۂ ابلاغ ہیں۔ مگر وہ اس ناقص وسیلے کو بڑے کامل طریق پر استعمال کرتا۔ نالہ سوال کے کنارے پلے بڑھے اس لڑکے کو جہلم اور گنگا میں ڈھلی ہوئی اردو بولتے دیکھ کر واقعی حیرت ہوتی۔ اردو اس کے اندر آگی ہوئی معلوم ہوتی ان دنوں وہ شاعر بھی تھا۔ مگر یہ ڈالی جلدی ٹوٹ گئی۔ شادی کی تقریب تو دو ایک روز رہی، مگر دوستوں کی منڈلی چار دن بشیر اثر کے چبارے پر سے نہ اتری۔ دولہا میاں اب دن میں کسی کسی وقت ہی ہمارے ہاتھ آتے، مگر جب ہاتھ آتے تو عزیز ملک اس کی نوعروسی پر ایسے کشتہ طراز نوکیلے فقرے چست کرتا کہ وہ اپنی طبع کی براقی اور اندازِ تکلم کی جناں بندی سے ہماری محفلوں کی جان بن گیا۔

ہماری دوسری ملاقات راولپنڈی میں اس کے مکان پر ہوئی۔ آج کا "حجرہ شاہ مقیم" ان دنوں ایک باقاعدہ سجے ہوئے "مہمان خانے" کی حیثیت رکھتا تھا۔ کنبے کا کل طول و عرض والد والدہ اور عزیز ملک۔ دولت کی ریل پیل تو نہ تھی۔ مگر عزیز ملک کے چاؤ چونچلوں کے واسطے بہت کچھ تھا۔ بہترین کالج۔ بہترین لباس، کتابیں کم۔ ٹینس کھیلنے کے

ریکٹ اور ولایتی بوٹوں کے جوڑے اور ایڈورڈ روڈ کے ٹیلر ماسٹروں کی سلی ہوئی پتلونیں زیادہ، بچے کم خوشحال گھرانہ۔

عزیز ملک کے والد نامور طبیب اور ممتاز شہری تھے۔ ان کی طبیعت میں شگفتگی کی ایک ایسی لہر ملتی تھی جو طب کے کوچے سے شاذ شاذ گزرتی ہے۔ سخن فہم سخن دوست مطب پر مریضوں کا ہجوم تو بہت رہتا۔ مگر حکیم صاحب کی طبیعت کے انداز سے لگتا تھا، جیسے مطب انہوں نے آمدنی کے لیے نہیں، خرچ کے لیے کھول رکھا تھا نادار مریضوں کو دوا اپنی گرہ سے دیتے۔ اور بیشتر ہجوم انہی مریضوں کا ہوتا۔ ہاں تیسرے چوتھے مہینے بڑودہ یا گوالیار کا کوئی مہاراجہ بیمار ہو جاتا تو ایک ہی نسخے سے دو تین برس کا "مطب" نکال لیتے۔ قیام پاکستان کے بعد جب اکثر والیانِ ریاست ہندوستان میں رہ گئے اور پاکستان کے والیانِ ریاست نے مسند پر بیٹھنا چھوڑ دیا، تو حکیم صاحب کی معیشت مضطرب ہو گئی۔ تاہم دیوارِ گلستاں پر کچھ کچھ دھوپ آخر دم تک چمکتی رہی عربی فارسی کے منتہی عالم تھے۔ گفتگو ہمیشہ ٹھیٹھ پنجابی میں کرتے۔ عزیز ملک کے دادا بھی جید عالم دین تھے۔ قرآن کریم کا پنجابی ترجمہ انہیں کا کارنامہ ہے۔

گارڈن کالج کے سٹوڈنٹ عزیز ملک کے ماحول اور مشاغل سے بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ تحصیل داری کی طرف جا رہا تھا۔ مگر جب اگلی دفعہ ملاقات ہوئی تو دیکھا کہ انگریزی وضع کے کپڑے تہہ کر کے، شیروانی اور پاجامے میں ڈھلے، سر سے پا تک حکیم ملک عبدالعزیز بنے ہوئے بوہڑ بازار میں اپنا علیحدہ مطب کھولے بیٹھے ہیں۔ اس دور میں ہم جب بھی ان کے مطب پر گئے، وہ بازار سے پھل منگوا کر، اور اپنے مرتبانوں سے لذیذ یاقوتیاں نکال نکال کر ہماری خوب خوب تواضع فرماتے۔ عزیز ملک کو اپنے صدری نسخوں پر بڑا اعتماد اور فخر تھا۔ اسی برتے پر انہوں نے اتنا بڑا دواخانہ کھول لیا تھا کہ جب اس کو بند کرنا پڑا تو تین مہینے اس کو بند کرنے میں لگے۔ اور اگلے تین مہینے تک

سارا بوہڑ بازار معجون، مشروبات کی خوشبویات سے معطر رہا۔ ان کی دوائیں تو دوسروں کے لیے سازگار تھیں مگر دواخانہ ان کے اپنے لیے "ناساز" رہا۔

حکیم ملک عبدالعزیز کے مطب کے ناسرسبز رہنے کی بنیادی وجہ تو یہ تھی کہ حکیم صاحب طب سے زیادہ ادب کی پریکٹس کرتے تھے۔ یعنی دوا ساز ازل کو منظور ہی نہ تھا کہ ان کا دواخانہ چلنے پائے ایک الجھن یہ بھی تھی کہ حکیم ملک عبدالعزیز آسان زبان نہیں بولتے تھے اور طب یونانی کے خوگر مقامی مریض مشکل گو طبیب کے پاس جاتے ہوئے کتراتے تھے کہ نہ معلوم حکیم صاحب کیا سمجھائیں اور ہم کیا سمجھیں۔ پھر ان کا مطب، کیا بہ لحاظ وسعت و ترتیب، اور کیا بہ اعتبار ادویہ کی پیرہن گستری اور بوتلوں کی گردن آرائی ——— مغربی شیشہ بندی کے نمونے پر اس ٹھاٹھ باٹھ سے آراستہ تھا، کہ عام مریض اس کے اندر قدم رکھتے گھبراتا کہ نہ جانے کتنا قیمتی نسخہ مل جائے، عزیز ملک کو نہ اپنی دوا بیچنی آئی نہ کتاب۔

مطب بند ہوا تو ملازمت کی تلاش ہوئی۔ محاسبِ اعلیٰ دفاع کے محکمہ میں سینگ سمائے دوسری عالم گیر جنگ کے دوران میں، پونا، کرکی شملے وغیرہ میں قیام رہا۔ قیام پاکستان کے بعد سے اپنے "حجرہ شاہ مقیم" میں مقیم ہیں۔ ملازمت میں مطب سے بھی زیادہ کبیدہ خاطر رہے مگر چونکہ پاؤں میں عیال داری کے بیڑیاں پڑتی جا رہی تھیں۔ لہٰذا تیس برس اس جال میں پھڑپھڑاتے رہے۔ سرکاری کارندہ اپنے حلف کی رُو سے چوبیس گھنٹے کا ملازم ہوتا ہے پھر عزیز ملک کا دفتر کچھ خصوصی قماش اس طرز کی رکھتا تھا کہ کرسی کے سامنے ہی نہیں اس کے ذہن کے اندر بھی دفتر ہی لگا رہتا۔ غالب نے اپنے گھر کے احوال میں لکھا تھا کہ مینہ ایک گھنٹہ برستا ہے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ عزیز ملک کے دفتر میں اس کی جسمانی مشقت اگر ایک گھنٹے کی ہوتی تو ذہنی مصروفیت چار گھنٹے ٹپ ٹپاتی رہتی ناکردہ خطاؤں کو ماننے کی اذیت مستزاد، یہ اس کی ادب سے سچی لگن کا معجزہ ہے۔ کہ اس نے قلم اور قرطاس کا ساتھ کسی حال میں نہ چھوڑا۔ میرا اندازہ

ہے کہ عزیز ملک نے اپنی زندگی کا غالب حصّہ اپنے حجرے کے اندر گزارا ہے۔ ادب کی تپسیا میں وہ عمر بھر آتش دیدہ گیلی لکڑی کی طرح جلتا رہا ہے ——— تب نظر آتی ہے اک مصرعِ تر کی صورت۔!

میں پہلے عرض چکا، عزیز ملک سے میری دوستی بے خبری کے عالم میں شروع ہوئی۔ یہ زندگی کے اس دور کی عطا ہے جب کوئی منظر گدلا نہیں ہوتا، اور انسان اپنے اجلے ضمیر اور لڑکپن کے خلوص کی مشعلیں لے کر دوستی کے مشن پر نکل پڑتا ہے میں اس اتفاق کو اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ بے خبری ہی بے خبری میں، ہماری دوستی پکی بھی ہو گئی۔ اور جب ہم ایک دوسرے کی سمجھ میں آئے تو اس مقام پر پہنچ چکے تھے۔ جہاں دوستی کے رشتے کو تر و تازہ رکھنے کے لیے ایک دوسرے سے ملاقات یا گفتگو بھی لازمی نہیں رہتی ہے عزیز ملک اور میں چالیس برس سے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ کئی مرتبہ زندگی ہمیں مختلف سمتوں کو مڑتی ہوئی، لمبی لمبی، تاریک گلیوں میں بھی لے گئی۔ بعض اوقات اس طرح اوجھل ہوئے کہ لگتا تھا اب شاید سوکھے پتوں کی طرح کتابوں ہی میں ملیں گے۔ روٹھے بھی ہوں گے مگر ٹوٹے کبھی نہیں۔ مجھے ہمیشہ ایسا لگا جیسے وہ یہیں کہیں میرے قریب کھڑا ہے اور یہ کہ اگر وہ میرے قریب نہ ہوتا تو میری تنہائی مجھ پر کتنی بھاری ہو جاتی ——— عزیز ملک کو سمجھنے کے بعد یہ بات سمجھ میں آئی کہ اس سے دوستی کوئی آسان کام نہیں۔ اس کا خلوص آدمی کو حیران کیا بدحواس کر دیتا ہے ———

جس کو ہوں جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں!

بے غرضی کا یہ عالم کہ دوست خود ہی سونگھ سونگھ کر ان کے کسی کام آجائے تو آجائے ورنہ وہ حوصلہ و ستائش کی کوئی توقع نہیں رکھتا۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ "جس نے بغیر حاجت کے سوال کیا اس نے آگ کے انگارے کھائے" عزیز ملک اس قول پر بڑی سختی سے عمل کرتا ہے۔ بلکہ اس نے تو اپنی حاجتوں کو

بھی محدود کر لیا ہے۔ وہ زندہ رہنے کا شوق تو رکھتا ہے، مگر اپنی شرائط پر۔ اس کی معیت میں اگرچہ وقت بڑا چونچال گزرتا ہے مگر دوستی کو محض خوش وقتی نہیں سمجھتا وہ دوستی عبادت کی سطح پر کرتا ہے۔ محبت کے ساحل پر قدم رکھتا ہے تو واپسی کی کشتی کو جلا دیتا ہے۔ اپنے گھر بار کی خبر گیری کے لیے اس کے پاس کبھی وقت نہیں ہوا۔ مگر اپنے دوستوں کے گھروں میں، پرسشِ احوال کے پھیروں میں ناغہ نہیں ہونے دیا جس اتوار کو میرے گھر میں صبح چھ گھنٹی بجے، میں سمجھ جاتا ہوں۔ عزیز آگیا اور کون ہو گا جو اتنے تڑکے تڑکے چار میل پیدل چل کر آجائے۔

مگر ہاں۔ توہین کو وہ بے تکلفی یا غلط فہمی کے حوالے سے بھی برداشت نہیں کرتا اور تم ہاں یہ کہ اس کی طبیعت کے اندرونی حاشیے پر جلالی رنگ کی جو ایک چنگاری سی تڑپتی رہتی ہے، کچھ پتہ نہیں کہ وہ کب ذرا سی ہوا لگنے پر شعلہ سا بھڑک اٹھے۔ اس کے بے پایاں افق پر جتنا پیار آتا ہے اس کی بے باک حق گوئی سے اتنا ڈر بھی لگتا ہے۔ اس نے اپنی ضروریات کو اسی لیے تو محدود کر لیا ہے کہ اس کی خودداری پر آنچ نہ آنے پائے۔

عزیز ملک پختہ ذہن، پختہ قلم شخص ہے وضع داری میں بھی پختہ رنگ۔ اس کو اس کی حجری مصروفیات سے الگ کر کے دیکھا جائے تو وہ یا تو اپنے حجرے میں کتابوں کے محاصرے میں ملے گا یا کسی سڑک پر پیدل چلتا۔ کسی دوست کے گھر جاتا ہوا ——— یا چھاؤنی کے باغ میں پلازہ سینما کی چوٹ پر بیٹھ کر نمازِ مغرب ادا کرتا ہوا۔ بارہ چودہ برس تک شام کے وقت دو تین گھنٹے کی مجلس آرائی ہمارا معمول رہا۔ مجلس آرائی کیا تھی۔ بازار میں "چکھوتی" گشت کی ایک صورت تھی۔ تھوڑا کھانا، زیادہ چہچہانا۔ زندگی کو نئی نئی سطحوں سے دیکھنے کا بہانہ۔ تقریب بہر ملاقات۔ مرحوم دوستوں میں سے نذیر احمد شیخ، عبدالعزیز فطرت، ڈاکٹر گدن اور پروفیسر رزمی صدیقی حلقے کے بنیادی رکن تھے۔ استاد

یوسف ظفر اور ابو صالح اصلاحی کبھی کبھی آ ملتے۔ کراچی سے جناب اے ڈی اظہر اور جناب ممتاز حسن احسن تشریف لاتے تو وہ بھی شامل ہو جاتے۔ ہائے ہائے۔

داغ فرقت دے گیا ہے کیسا کیسا آشنا!

اس حلقے کے باقیات میں سے (اللہ ان کو دیر تک سلامت رکھے) عزیز ملک بریگیڈیر گلزار احمد، کرنل جاوید خٹک اور شاعر کوہسار پروفیسر کرم حیدری بفضلہٖ تعالےٰ زندہ ہیں۔ مگر "چکھوتی گشت" کی رسم شیخ و دراں (نذیر شیخ) کے اٹھ جانے پر اٹھ گئی ——— بہر حال ——— جب تک یہ التزام رہا۔ احباب کی صحت کا پورٹ فولیو عزیز ملک کے سپرد رہا۔ کیا چیز کھائی جائے۔ کیا نہ کھائی جائے۔ اس کا فیصلہ موسم اور طبیعت کی مناسبت سے وہی کیا کرتے کم از کم نیک و بد تو سمجھا دیتے۔ خود چائے کے کوپ کے سوا بازار کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگاتے۔ کسی لفظ کی "شین قاف" میں کسی دوست کو شبہ ہوا تو تلفظ کا مخرج انہیں سے درست کرایا جاتا۔ جس مسئلے پر بھی ان سے استصواب کیا گیا، ان کی بے کم و کاست رائے بے جھجک لہجے، دو ٹوک الفاظ میں وہیں کی وہیں سن لو۔ بیشک کوئی خوش ہو یا ناخوش ——— ابہام نہ اس کے ادب میں ہے نہ زندگی میں۔ نازک سے نازک مقامات پر ایسے ایسے خوف ناک سچ بول جاتا ہے کہ باید و شاید حق گوئی کا لپکا بعض اوقات طنزِ تلخ کی صورت میں بھی اختیار کر جاتا ہے ع

مگر حفیظ کو یہ بات گون سمجھائے۔

میں جب کبھی ان کے گھر جاتا ہوں برقی گھنٹی کا بٹن دبانے کی بجائے بآوازِ بلند یہ نعرہ لگاتا ہوں

"اَلْحَقُّ مُرٌّ"

وہ گھر میں ہوں تو اندر سے پکارتے ہیں "اَلْحَقُّ مُرٌّ"

کئی برس کی بات ہے۔ ان کی بیٹی طاہرہ سلمہا تعالیٰ جو اَب ماشاء اللہ ایم اے

پاس کر کے بڑی سگھڑ بی بی بنی ہوئی ہے، ان دنوں دوسری یا تیسری جماعت میں پڑھتی تھی۔ ایک روز میں نے ان کے ہاں، حسبِ معمول "اَلْحَقُّ مُرٌّ" کا نعرہ لگایا تو طاہرہ باہر آئی اور اس نے مجھ سے پوچھا ——— "چاچا جی تسیں ایہہ کی کہندے او؟"

میں نے جب اس کو "اَلْحَقُّ مُرٌّ" کے معنی بتائے تو طاہرہ کھل کھلا کر ہنسی اور "امی امی" کہتی ہوئی اندر بھاگ گئی۔ نہ معلوم اس نے امی کو جا کر کیا بتایا۔

طلسمی مُندری والی کتاب

صدیق سالک میرا دوست ہے۔ دوستی کا ایک ناطہ یہ بھی ہے کہ اس کے گاؤں کا نام منگلیہ ہے اور میرا گاؤں منگلا بند کی سرنگ نمبر ۲ کے سامنے واقع ہے۔

عربی شاعری میں، دوست کو جامِ شراب اور گیتوں کی کتاب سے تشبیہہ دی گئی کہاں دی گئی ہے یہ جناب ممتاز حسن صاحب کو معلوم ہے صدیق سالک کو ہم نے مسکراہٹوں کی کتاب پایا۔

سالک سے اپنی پہلی ملاقات کی ہمیں دو چیزیں ہی یاد رہ گئی ہیں۔ بلند و بالا قامت اور دل نواز مسکراہٹ۔ یا وہ کھردرہ پن جو دساور کی عورتوں میں زیادہ مقبول ہے

یہ مسکراہٹ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں بھی اس کے ہونٹوں پر دیکھی ـــــ سقوطِ ڈھاکہ سے کچھ پہلے منگال کے جلتے بجھتے شب و روز میں بھی دیکھی ـــــ قید سے اس کے خطوط بھی مسکراتے ہوئے ملے۔ اور اب اس کی کتاب کو بھی مسکراتی ہوئی کتاب پایا۔

وہ کوئی ہوائی جہاز کی ساخت کا آدمی نہیں کہ بیرونی ہوا کا دباؤ اندر کی فضا پر اور اندر کا ہیجان باہر کی فضا پر اثر انداز نہ ہو سکے، یہ ظرف اور حوصلے کی بات ہے، خدا جس کو بخش دے۔ اب تو خیر برسوں کی چکنی چپڑی استری شدہ شہری زندگی نے اس کے چہرے پر ہلکا سا "پوچا" اردو شاعری کا بھی پھیر دیا ہے مگر جب وہ تازہ تازہ گاؤں

کے کھیتوں سے کٹ کر، جنرل موسیٰ کے ہیڈ کوارٹر میں وارد ہوا تھا تو سنگ موسیٰ ہی کا کوئی مجسمہ معلوم ہوا تھا مگر مسکراتا ہوا مجسمہ۔ کشادہ دست و کشادہ جبیں، سر سے پاؤں تک فی انچ سپاہی (ٹوٹل ۲، انچ) ہو بہو ویسا جیسے فرنیئر فورس، یا ہماری دوسری رجمنٹوں۔ رسالوں، عسکری شبیہوں کے، فولادی ٹوپی پہن کر پوچ (POLOH) میں ریلوالور اڑس کر، سینہ تان کر چلنے والے گبھرو ہوتے ہیں۔

فوج کے شعبہ تعلقاتِ عامہ میں کیپٹن صدیق سالک سے جب ہماری ملاقات ہوئی تو وہ فوج میں داخل ہو رہا تھا، اور ہم نکل رہے تھے۔ ہمارے اور اس کے درمیان فوجیوں کی ایک پوری نسل بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ایک طویل جنگِ عالم گیر آٹھ دس انگریز جرنیل کرنیل اور بہت سی خچریں حائل تھیں۔

دوسری عالم گیر جنگ میں ہم لوگوں نے کرنل مجید ملک، لیفٹیننٹ کرنل فیض احمد فیض اور بالخصوص اردو زبان کے یگانہ روزگار ادیب مولانا میجر چراغ حسن حسرت کی سرکردگی میں خاصے لانگ مارچ کئے بعد، باوردی صحافیوں، ادیبوں کے اس محکمہ کی چولوں کی اردو شاعری کی فضا میں اچھا خاصا صاف کر لیا تھا۔ مگر اب جو سالک کی طرح کے بظاہر ایڑی سے ایڑی بجانے والے اور پنجوں کے بل "بھمبیری" کی طرح گھومنے والے فوجی جوان کو دیکھا، تو ماتھا ٹھنکا کہ یہ لوگ اس محکمے کو پھر فولادی ٹوپی پہنا دیں گے۔ مگر قیس جب تصویر کے پردے سے نکل ہوا تو ہمارے فاضل دوست عبدالعزیز خالد کے الفاظ میں کتابوں کا "معین وعاد اور حبیبِ ندیم" نکلا۔

وہ اردو کا ایک شگفتہ رقم ادیب تھا۔ انگریزی اس کی معاش تھی۔ اردو پیاس اور پنجابی اساس۔ اس کے فکاہی مضامین، ادبی حلقوں کو چونکا رہے ہیں، اس کی ظرافت توپ والی گرجتی، گمکاتی چیز نہ تھی۔ ایک نوع کی ذہنی بشاشت تھی۔ پھول دار جھاڑیوں میں، جیسے ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی تک، اڑتی رنگین چڑیاں نہیں ہوتیں،

بس ویسی ہی ہلکی، چھپھاتی سی ظرافت طنز میں بھی لکڑی کا پتلا سرا وہ اپنے ہاتھ میں رکھتا تاکہ ضرب تو لگے مگر زخم نہ آنے پائے۔ لکھنے کا اسلوب؟ خود آگے آگے اور موضوع پیچھے پیچھے بعض اوقات خود اتنے آگے نکل جاتے ہیں کہ کسی نقطے پر "اباؤٹ ٹرن" (ABOUT TURN) ہو کر موضوع کو "بگل" بجا کر بلانا پڑتا ہے کہ ؎

آواز دے کہاں ہے؟

مجموعی طور پر سالک کا مزاج بشاشت کی ایک ایسی کیفیت کا نام ہے جو مسرت، محبت عالی حوصلگی اور دردمندی کی "فیملی پلاننگ" سے پیدا ہوتا ہے۔

"ہمہ یاراں دوزخ" میں سالک کے اسلوبِ تحریر کی ان خصوصیات کا پہلے سے کہیں زیادہ دم پخت ماءاللحم رواں دواں نظر آتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ اتنی سنگین حکایت شب کو ایسے شگفتہ لہجے میں لکھ گیا ہے کہ جیسے دوزخ کا سفر بہشت کے گائیڈ کی معرفت طے ہو رہا ہو۔ سالک نے جس انداز میں یہ کتاب لکھی میرے خیال میں وہ اس کے موضوع کے لیے موزوں نہ تھا۔ مگر کتاب پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ اسی انداز نے تو جسمِ واقعہ میں جان ڈالی دی ہے۔

شگفتگی سالک کی شخصیت کا جزو ہے۔

۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہم تو آگرہ کیمپ کے میجر گلاب سنگھ کی طرح "ہلاشیری" کرنے والوں میں سے تھے۔ صفِ اوّل کی ڈیوٹی عموماً کیپٹن صدیق سالک یا ہمارے دوسری نوجوان رفقاءِ کار ہی انجام دیتے تھے۔

یہ جنگ، ہم دوسری جنگِ عظیم کے آزمودہ کاروں کے واسطے بھی، نئی جنگ تھی۔ یہ اندازہ پہلی مرتبہ اسی جنگ سے ہوا کہ، اپنی سرزمین پر، اپنی جنگ کیا معنی رکھتی ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ میں تو بعض "تھیٹروں" (THEATERS) میں مہینوں یہی پتہ نہ چلتا کہ لڑائی اصلی میں ہو کہاں رہی تھی؟ محاذ طرابلس میں، کیمپ دیولالی میں۔

سپاہی ہانگ کانگ میں اور خود حضرت چرچل مدظلہ العالی لندن میں۔

اپنی جنگ کے شعلے تو ہمارے گھروں، ہماری منڈیروں پر لپک رہے تھے اس کی مٹی تو اُڑ اُڑ کر ہماری ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کی مانگوں میں پڑ رہی تھی۔

اس جنگ کا نتیجہ تو اخباروں کے علاوہ ہمارے ماتھوں پر بھی چھپنا تھا۔

یہی احساس تھا کہ ؎

شعلۂ محمود از خاکِ ایاز آید بروں

ہمارے محاذ، ہماری دہلیز پر ہی تو تھے۔ کیپٹن سالک کو جب دیکھا۔ صحافیوں کے محاذ تھا مے انگریزوں اور فرانسیسیوں سے پنجابی میں انگریزی بولتا، محاذ کو جاتا یا محاذ سے آتا، وہ ان لوگوں میں سے تھا جو واقعات کے عین درمیان میں رہتے ہیں اور بحران کے زمانے میں جب کوئی "مشن" ان کے سپرد کیا جاتا ہے تو وہ "مشن" کو سینگوں سے جا پکڑتے ہیں۔ سالک کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کی پیشانی کو ہمیشہ خنداں پایا۔ محاذ سے آتا تو، خبروں کے علاوہ چٹکلوں کا تھیلا بھی بھرا لاتا ورنہ جنگ میں چڑچڑا پن آدمی کی ناک پر رکھا رہتا ہے۔ سقوطِ سنگاپور کے بارے میں، کہ ستر، اسی ہزار اتحادی فوج نے وہاں ہتھیار ڈالے تھے، ہم نے یہ لنگر گپ سنی تھی کہ جنرل پرسیول اور جنرل ہیتھ اتنے چڑچڑے ہو گئے تھے کہ جاپانیوں سے لڑنے کے بجائے ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے۔

سالک نے یہ کتاب ابواب باندھ کر لکھی ہے۔ اسی طرح زندگی میں بھی وہ "ٹارگٹ" کے بعد "ٹارگٹ" طے کرتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ بس ایک شاعری کا اونٹ ابھی تک کسی کروٹ نہیں بیٹھ سکا۔ محمد صدیق نے غالباً نوجوانی کی کسی رومانی ترنگ کے زیر اثر یا انتہائے شوق کی گھبراہٹ میں یا یونہی از راہِ احتیاط تخلص رکھ لیا تھا کہ آزاد شاعری وہ کر سکتا ہے ..... مگر "شارٹ کٹ" کا وہ قائل نہیں، ہوتا تو سقوطِ ڈھاکہ

کے مرحلے پر جب سقوط سے پہلے پروانہ کی صورت نکل آئی تھی۔ یا بعد میں ایک مہربان و محب بنگالی خاندان نے ان کو اپنے ہاں خانہ نشینی کی پیش کش کر دی تھی، کہ یہاں مزے سے بیٹھے رس گلے کھاتے رہیے تو آپ قید و بند کا گرم سرد چکھنے کا فیصلہ نہ کرتے۔ مگر

؎ دار و رسن تعلق خاطر کی بات ہے
ورنہ قریب تر تھا شبستاں کھلا ہوا

کل کی خبر نہیں۔ مگر آج تک تو وہ شاعر نہیں بن رہا۔ البتہ تخلص کو اس نے بالکل بنجر بھی نہیں رہنے دیا۔ جو شخص ایسی شاداب نثر لکھتا ہو، میں سمجھتا ہوں کہ اس کو تخلص رکھنے کا حق مل جانا چاہیے ویسے شعروں کی "ذخیرہ اندوزی" کا اسے پرانا لپکا تھا۔ مشرقی پاکستان میں جا کر تو یہ شوق بجائے خود ایک ٹارگٹ بن گیا۔ راولپنڈی میں شفیق الرحمٰن اور مشتاق احمد یوسفی ان کے تکیے کے نیچے رہتے۔ ڈھاکہ میں غالب اور فیض کو اس کے پہلو میں پایا۔ حجامت بھی "زنداں نامے" میں کھڑے ہو کر بناتے۔

سالک کا پہلا خط اردو کے ایک پہلے گہوارے فورٹ ولیم سے ملا۔ پھر اس کے خط آگرہ کیمپ ۴۴ سے آنے لگے۔ جنگی قیدی خطوں میں لفظوں کے ہزار طوطے، مینا بنائیں ڈھارس تھوڑے بندھتی تھی۔ تاہم سالک جن بانکے ادبی کنایوں میں "شادی غم دیدگاں کا نقشہ کھینچتا اس میں اس کی ذہنی بشاشت کی غنچہ در آویزی صاف جھلکتی تھی خطوط میں "لائیں مارتے" ہوئے شعروں کا استعمال اتنا بڑھ گیا تھا کہ بعض خطوط میں تو نذیر احمد شیخ کے بقول ع

اشعار کی بھرمار تھی احوال ندارد

سقوط ڈھاکہ قیامت کا سانحہ تھا، دوسری عالمگیر جنگ میں ہم نے کئی قیدی کیمپ دیکھے ہیں۔ کلیان کیمپ میں اطالوی قیدیوں کا پورا لشکر ہمارے پڑوس میں پڑا تھا۔ ان کی نعرے کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ اٹلی میں ڈوشے اور مارشل گریزیانی ہی رہ گئے ہوں گے

بہر حال ان کی بارکیں ہماری بارکوں جیسی ہی تھیں۔ غسل خانے ہم سے اچھے۔ راشن چوکھا۔

سینے پر کوئی خار دار تار بھی منڈھی ہوئی نہ ملی۔ وہ کیمپ کے شاداب کھلے میدان میں مرغابیوں کی طرح گھومتے رہتے۔ مگر، اس کے باوجود، ایسا لگتا تھا کہ روشنی ان کی آنکھوں سے ہمیشہ کے لیے بجھ گئی ہے۔

دشمن کی قید محض بھی روح فرسا ہوتی ہے۔ بھارت کی قید تو راکھشوں کی قید تھی وہ تو ہماری روح کچلنا چاہتا تھا۔ اس کی تو کوشش تھی کہ ہم کبھی سر اٹھا کر نہ چل سکیں ——— ہمیں یقین تھا کہ جنگی اسیروں میں سے، سول کے پلڑے سے مسعود مفتی اور فوج کے "کوٹے" سے میجر صدیق سالک ضرور کتابیں لکھیں گے۔ یہ دونوں تو خیر، ٹیلی ویژن کے مذاکروں کی زبان میں، ہمارے ملک کے جانے پہچانے دانشور ہیں، اس بات کی توقع رکھنی چاہیے کہ ہمارے ان سابقہ شاہانِ بے کمر اور خسروانِ بے کلاہ" میں سے کئی نئے شمس و قمر طلوع ہو کر فکر و فن کی راہوں کو روشن کریں گے۔ دلوں کا یہ انتہاہ ورد زبان پر آکر ہی رہے گا" ہمہ یاراں دوزخ" اسی موجِ درد کی پہلی لہر ہے۔

سوچ کا کارواں رکا نہ کبھی
ہم جہاں بھی رہے سفر میں رہے

سقوط ڈھاکہ کے بعد دیوانوں پہ کیا گزری۔ ایک بہت وسیع۔ نہایت نازک اور بڑا پیچیدہ موضوع ہے۔ یہ تاریک راہوں میں مرنے اور مارنے والوں کی کہانی ہے۔ سالک کی مشکل یہ ہے کہ وہ جانتا زیادہ ہے اور بتاتا کم ہے ——— بہت سامال اس نے الگ باندھ کر رکھ چھوڑا ہے۔ فوجی اور سیاسی مباحث کو میجر صاحب نے پیش لفظ میں ہی چوسنے کی لکیر کھینچ کر اپنے لیے "آؤٹ آف باؤنڈ"

کر لیا ہے۔ یوں بھی المیہ اتنا وسیع اور اس قدر تازہ ہو، اور اس کے عسکری، تاریخی اور نفسیاتی دھاگے اتنے نازک اور اتنے الجھے ہوئے ہوں تو اتنی اور اس انداز کی کتاب میں بہت گوشوں کا تشنہ رہ جانا لازمی تھا۔ اسے سالک کی تخلیقی اور تنظیمی صلاحیت کا کمال سمجھنا چاہیے کہ ان اوراق میں المیے کا ایک خاصا کشادہ "ایریل ویو" (AIRIAL VIEW) نگاہوں کے سامنے کھل جاتا ہے۔ سالک کا آرٹ یہ ہے کہ وہ دال کی کڑچھی ڈالتے ڈالتے چٹکی چٹکی مسالہ، اونچے اونچے اور گہرے گہرے مسلوں پر بھی ڈال جاتا ہے۔ کتاب کی ہڑائی اور اس کی سندرتا، چھوٹے چھوٹے واقعات سے ابھرتی ہے۔ سالک واقعات کے چھوٹے چھوٹے محدب، شیشے کاٹ کر ایک فریم میں جوڑتا چلا گیا ہے "ہمہ یاراں دوزخ" کے زخم تو مندمل ہو بھی جاتے ہیں۔ کہیں کہیں "پاسپورٹ" کا کام بھی دے جاتے ہیں مگر روح کا گھاؤ بھرنے میں نہیں آتا ؎

کوئی پروانوں کو بتلاؤ کہ جلنے کے سوا

اور بھی چند مقاماتِ وفا ہوتے ہیں

بھارت، زمین اور ذہن، دونوں محاذوں پر ٹینک کے بجائے پروفیسر مجیب اور توپ کی جگہ انفارمیشن سیکرٹری قدوائی اور اسی کاٹ کا دوسرا "لکھا پڑھا اسلحہ" استعمال کرتا رہا۔ گولہ بارود کے محاذ پر تو جنگ اسی لمحے ختم ہو گئی تھی۔ جب ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کی ڈھلتی ہوئی سہ پہر کو ڈھاکہ کے رمنا ریس کورس میں پاکستان کے جنرل امیر عبداللہ خان نیازی نے اپنا ریوالور بھارت کے جنرل جگ جیت سنگھ اروڑہ کے حوالے کر دیا تھا۔ ہمارے جنگی قیدی اعصاب کی یہ شدید جنگ مسلسل دو برس تک، بھارت کے بندی خانوں میں لڑتے رہے اور اس شان سے لڑتے رہے کہ زمین پر ہاری ہوئی بازی ذہن کے محاذ پر جیت کر وطن واپس آئے ——— اس کتاب کو، کیمپ نمبر ۴۴ کے حوالے سے ۱۹۷۱ء کی جنگ کے اس خاموش محاذ کی "فرنٹ

لائن ڈسپیچ" (FRONT LINE DISPATCH) سمجھنا چاہیے۔

قید کی زندگی کا مختلف پرتوں میں، انفرادی یا اجتماعی تجزیہ کرنا ایک قسم کا دستاویزی عمل ہے۔ اس عمل میں خود اپنے اوپر بھی "چاند ماری" کرنی پڑتی ہے۔ قید کے لمحات کو ابھی وقت کی چھلنی سے بھی گزرنا ہے۔ سالک نے نفسیاتی کش مکش کے پہلوؤں کو نہ صرف یہ کہ بطور خاص اپنا مرکزِ نگاہ بنایا ہے بلکہ احساسات کو جذبات سے الگ ہو کر پرکھنے کی کوشش بھی کی ہے۔ اس نے کمزوریوں اور خوبیوں کو چھان پھٹک کر ان کے الگ الگ "بوہل" نہیں لگائے۔ لیکن خود احتسابی کی ایک رَو میں، سوالات کی "پوری نہری" ابھرتی چلی گئی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ کتاب تاریخ کے ایک المیے کے سائے میں سوچی اور لکھی گئی ہے۔ مگر مصنف نے کمال بالغ نظری سے روشنی کے ان دروازوں کو کھلا رکھا ہے جن سے مستقبل کی دھوپ چہروں کا ایک رنگا رنگ نگارخانہ ہے۔ ہر کتاب میں ایک "طلسمی مندری" ہوتی ہے۔ جس میں جھانکے بغیر آپ کتاب کی روح میں نہیں جھانک سکتے۔ اس کتاب کی "طلسمی مندری" اس کے محدب شیشے ہیں۔ اگر آپ ان میں شست باندھ کر دیکھیں گے تو آپ بہت کچھ دیکھ لیں گے۔ آندھیاں اور طوفان بھی، چہرے اور کردار بھی، اسیروں کے چہرے، صیادوں کے چہرے، ہمارے تمہارے میر صاحب۔ سب خواتین و حضرات کے چہرے۔ ان واقعات نے کتاب کو اتنا متحرک اور زندہ بنا دیا ہے کہ سالک کے ہمراہ قاری خود بھی کیمپ نمبر ۴۴ کی چٹائی پر جا بیٹھتا ہے اور جب میجر راٹھور لوکری کی گھات کھڑی کر کے فاختائیں پکڑتا ہے تو ڈوری کے ساتھ ساتھ قاری کا دل بھی ہلنے لگتا ہے۔ سالک کا قلم قاری کو مکمل طور پر اپنے سحر میں جذب کر لیتا ہے۔ اس نے اپنے موضوع پر، سامنے سے نہیں، پہلوؤں سے حملہ کیا ہے ؎

بازی بازی کف نہادند شوخی شوخی زسر گرفتند

خالص ادبی محاذ پر، یہ کتاب "عسکری مزاح" کے اس "خاندان" سے تعلق رکھتی ہے۔ جس کی تیر بہدف مثال۔ اردو ادب کے جنرل رومیل، کرنل محمد خان کی کتاب "بجنگ آمد" میں نظر آتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ "بجنگ آمد" پرائی جنگ کی کہانی ہے اور "ہمہ یاراں دوزخ" اپنی جنگ کی آپ بیتی۔ اور یہ بہت بڑا فرق ہے۔ "شائبہ کیمپ" کا البیلا کپتان، رنگوں کے بھرے ہوئے میلے میں سے گزر رہا تھا۔ مگر "ہمہ یاراں دوزخ" آگ کے دریا میں ڈوب کر گزرنے کی روداد ہے۔ چنانچہ اس کی سطریں، اپنی تمام تر شگفتگی اور ——— اوپر اوپر ٹھنڈی ہوا میں سانس لینے کے باوجود ——— دہکے ہوئے انگاروں پر چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں ———

سالک نے جسم کے زخموں سے زیادہ روح کی خراشوں کی نشاندہی کی ہے جو جسم اور ذہن کے نہاں خانوں میں داخل ہوتی ہیں اور یہ وہ خصوصیت ہے جس نے اس دلچسپ "رپورتاژ" کو ایک دیرپا پرت بھی عطا کر دی ہے۔

"ہمہ یاراں دوزخ" مزاح کی کتاب نہیں مگر ظرافت اس کو سر آنکھوں پر بٹھائے گی ——— یہ ادب کی کتاب نہیں مگر اردو ادب اس کو سینے سے لگائے گا۔ یہ کتاب تاریخ کی نہیں مگر تاریخ اس کو نظر انداز نہیں کر سکے گی۔

صدیق سالک کچھ مدت لیکچرر رہے ہیں مگر وہ ابواب کے خاتمے پر سبق نکال کر دکھانے کے قائل نہیں ہیں۔ لیکن اس کتاب کا کوئی ورق سبق سے خالی نہیں ہے۔ اور جس سبق پر میرا دل سب سے زیادہ دھڑکا وہ سالک کے الفاظ میں یہ ہے۔

"اگر کسی پاکستانی لیڈر کے بیان سے، پاکستان دشمنی کی بُو آتی تو خون کھولنے لگتا کہ اس ناشکرے انسان کا گریبان پکڑ کر بھرے بازار میں پوچھا جائے ——— کیا تجھے آزادی کی

قدر نہیں ہے۔ یا کیا تجھے معلوم نہیں کہ اگر یہ ٹکڑا ابھی ہم سے چھن گیا۔ تو ہمیں نہ زمین جگہ دے گی نہ آسمان .....

اور ہاں! کتاب میں الفاظ کے زیر و بم سے ایک "نغمہ خوں گشت" آواز بھی تو سنائی دیتی ہے۔

اِدھر مٹا بھی دیا، داغِ قتل تک گوہر
اُدھر ابھی کفِ قاتل پہ ہے سرِ مقتول

۲۰ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو راولپنڈی "ہمہ یاراں دوزخ" کی تعارفی تقریب میں پڑھا گیا۔

کتابوں کی شہزادی کتاب

میری ان گزارشات کا مقصود پروین سید فنا کے اولین مجموعۂ شعر "حرفِ وفا" کے فنی پہلو کا سرسری سا جائزہ لینا ہے۔ میں عادتاً اور روایتاً لکھنے والوں کے اس زمرے میں شامل ہوں جو قلم کو بندوق کی طرح استعمال کرتے ہیں یعنی جس طرح نشست باندھے بغیر بندوق سے فائر نہیں کرنا چاہیے۔ اسی طرح میں تمہید باندھے بغیر مضمون کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ لکھنے کے معاملے میں ہم "راست اقدام" کے قائل نہیں ہیں۔ جس کی طرف پروین سید فنا نے کچھ اسی طرح اشارہ کیا ہے۔

زخموں کے انبار لگے ہیں قیمت پوچھو دام چکاؤ

آیئے پہلے کچھ ظاہر کی آنکھ سے کتاب کا تماشہ کر لیں۔ انسان اپنے لباس سے بھی تو پہچانا جاتا ہے۔ "حرفِ وفا" کی اشاعت سے خوب صورت شاعری میں بھی ہوا ہے اور خوب صورت کتابوں میں بھی۔ مجھے ان کی شاعری کا تعارف اگر بذریعہ تار کروانا پڑے تو میں یہ ایک جملہ لکھوں ——— "وفا کے موتیوں اور اَنا کے گلابوں کی شاعری" ——— (یہاں یہ بات بھی بریکٹ میں بند کرتا چلوں کہ فنا کے ہاں "اَنا" ——— لمبی چوڑی بنچ والی، خواہ مخواہ ٹھونگیں مارنے والی اَنا نہیں یہ غیرت اور خودداری کی "جڑواں بہن" ہے) اس کتاب کو پڑھنے سے دل میں اور دیکھنے سے آنکھوں میں طراوت

آتی ہے اور اتنی برابر طراوت آتی ہے کہ اس کے سرورق کے حسن کو اس کی غزلوں اور نظموں کے حسن سے الگ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ کتاب کی نگار بندی کی جو الا اپنے فن کی منفرد شخصیتوں کے ٹیم ورک (TEAM WORK) نے کھلائی ہے۔ سب سے زیادہ حصہ پاکستان کے مایہ ناز مصور صادقین کے موئے قلم کا ہے۔ جنہوں نے سرورق کے تخیلی خاکے میں پاکیزگی کی عظمت، سادگی کے جلال اور شائستگی کے ایک کلاسیکی سبھاؤ کو خطوط میں روشن کر دیا ہے۔ اس خاکے میں رنگ البتہ مصنفہ کے بڑے نورِ نظر حسن سید نے بھرے ہیں۔ صادقین صاحب سرورق پر روشنائی کر کے واپس نہیں چلے گئے بلکہ پس ورق تک برابر کتاب کے ہم رکاب چلتے ہوئے جا بجا اپنی چمن دار آستین "خطاطی" کے دلکش نمونوں سے اوراق کو اوراقِ گل بناتے چلتے گئے ہیں۔ جس کتاب کی تزئین و اشاعت میں صادقین، ندیم اور طفیل "متحدہ محاذ" بنا لیں۔ اس کتاب کو کتابوں کی شہزادی کہنا کچھ غلط نہ ہو گا۔ موتیوں کی طرح پروئی ہوئی کتابت کو جہاں سے بھی کھولیے ایسا لگتا ہے کہ گویا چھٹی کے وقت لڑکیوں کے کسی کالج کا پھاٹک کھل گیا ہو۔ ناشروں کے کھاتوں اور مصنفوں کے حالات زندگی سے تو یہی لگتا ہے کہ اردو کی ادبی کتابوں اور خاص طور پر شعری تصنیفات کی مانگ نہایت محدود ہے مگر مجھے امید ہے کہ "حرفِ وفا" وسیع مقبولیت حاصل کرے گی کہ اس کو پڑھنے والے بھی خریدیں گے اور دیکھنے والے بھی کیونکہ

دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی

پروین سید کی روزمرہ زندگی فوجی کنبوں کی زندگی کے ماحول میں بسر ہوتی ہے فوجیوں کو پریڈ (PARADE) یا فیلڈ (FIELD) پر تو خیر لوہا اور پتھر ہونا ہی پڑتا ہے۔ لیکن گھروں میں بھی ان کو "ریشم" ہونے کی کچھ زیادہ مہلت نہیں ملتی۔ تاہم کبھی کبھار، روزِ ابرو شبِ مہتاب ہیں۔ فیلڈ مارشل منٹگمری سے کچھ تھوڑی سی "فرلو" مانگ کر ان کے گھروں میں شعر و ادب کی محفلیں بار پا لیتی ہیں، دیکھا جائے تو فنونِ لطیفہ پر جتنا حق اِن پُر مشقت اور

پُرخطر زندگی بسر کرنے والے جیالوں کا ہے اتنا حق اور کس کا ہو سکتا ہے ؟

کوئی بیس برس پہلے کی بات ہے، اردو ادب کے سچے پرستار اور پُرجوش مبلغ اے ڈی اظہر مرحوم جو اُن دنوں برطانیہ میں پاکستان ہائی کمیشن کے اکنامک منسٹر تھے، لندن سے راولپنڈی آئے تو وہ ادبی محفلوں کے لیے اتنے ترسے ہوئے تھے کہ جو دوست ملتا اسے کہتے ——— میاں چائے مت پلواؤ ——— روٹی مت کھلاؤ، شعر سناؤ ——— فطرت۔ باقی۔ نذیر شیخ اور یوسف ظفر یہاں ہیں، ان کو بلواؤ" (جناب اے ڈی اظہر اور لندن کا تذکرہ میں نے یہاں اس لیے کیا کہ اظہر صاحب میرے دوست تھے۔ اور لندن دیکھنے کی آج تک حسرت ہے) بہر حال ان کی آمد پر فوج کے ایک سینئر آفیسر نے اپنے گھر پر ایک محفل شعر و سخن اس طرح آراستہ کی کہ دیواروں سے تیر و تبر، تلواریں اور کمانیں بلم اور برچھیاں چمٹی ہوئی تھیں، کارنسوں پر تھری ناٹ تھری کی چھوٹی چھوٹی گولیوں سے لے کر رانی توپوں تک کے بڑے بڑے گولوں کے خول چُنے ہوئے تھے۔ ایک پوری دیوار پر واٹرلو کی جنگ لڑی جا رہی تھی اور فرش پر سفید براق چاندنی پر مجلس شعر جمی ہوئی تھی۔ پروین سید فنا کو ہم نے پہلی مرتبہ اسی محفل میں سنا۔ وہ اپنے شوہر میجر سید احمد کے ساتھ تشریف لائی تھیں مگر سامعین لڑکیوں کی اس قطار میں بیٹھی تھیں جن پر گمان ہوتا تھا کہ ہنوز کسی کالج میں زیر تعلیم ہوں گی۔ اور اس محفل میں اکابر شعرا سے (بشمول میرے) آٹوگراف لینے کے لیے آئی ہیں۔ مگر وہ تو شاعرہ نکلیں۔ اور اپنی باری پر انہوں نے غزل بلکہ دو تین غزلیں سنائیں "حرفِ وفا" کو پروین سید فنا نے فن کی دہلیز پر پہلا قدم کہا ہے۔ اس وقت وہ فن کی دہلیز ڈھونڈ رہی تھیں۔ پروین فنا کے سحر آفرین ترنم نے اس وقت ان کے شعر کی بنیادی قدر و قیمت کا تو کوئی اندازہ نہ ہونے دیا۔ البتہ اتنا یاد ہے کہ غزل پڑھتے ہوئے اس لڑکی نے اپنے آنچل کو اپنے سر سے ڈھلکنے نہیں دیا تھا۔ اس محدود سی نشست کے بعد بھی، جب اور جہاں نجی نشستوں یا کھلے مشاعروں میں ان کو سننے کا موقع ملا

کچھ عرصے تک عام تاثر بلکہ تعصب یہی رہا کہ ان کا شعر ان کے سحر آفرین ترنم پر اڑا جا رہا ہے۔ لہٰذا ان کی شاعری مشاعراتی حدود سے بڑھ کر کاغذی حدود میں شاید ہی قدم رکھ سکے۔ مگر رفتہ رفتہ محسوس ہوا کہ وہ اس فن کو سچی لگن سے اپنائے ہوئے تھیں۔ اور اگر شعر کو ہوائی جہاز سے تشبیہ دی جا سکتی ہے تو ان کے شعر میں ترنم، تغزل، تفکر اور تجسس کے یکساں پاور والے چار انجن لگے ہوئے تھے اور پھر رفتہ رفتہ یہ احساس بھی بڑھتا چلا گیا کہ ہر چند یہ خاتون شاعری میں صنفِ لطیف کی ذاتی لطافت، عفت، فکر، پاکیزگی، احساس اور سلیقے کا وہ جوہر خاص تو لائی ہے جو دوپٹے کے کسی کونے پر چمکی ٹکا کر پورے دوپٹے کو کہکشاں بنا دیتا ہے مگر شاعری میں اپنے ساتھ باورچی خانہ اٹھا کر نہیں لے آئیں۔ وہ ان شاعرات میں نہیں ہیں جو اردو ادب کے مینا بازار ہی میں اپنا سٹال لگا سکتی ہوں۔ یا ادب کی کھلی نمائش میں گوشۂ خواتین سے ورے ان کی جگہ متعین نہ کی جا سکے۔ بعض معلوم و معروف وجوہ کی بدولت شاعری پر بحیثیت مجموعی مردوں کی "مناپلی" (MONOPOLY) چلی آ رہی ہے۔ موجودہ دور میں جن شاعرات نے مردوں کی "مناپلی" کو توڑا ہے ان میں پروین سید فنا کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے اور ایسی شاعرات کی تعداد ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے اور اردو ادب کی پرہجوم انارکلی یا الفنسٹن سٹریٹ میں "پروٹوکول" کے کسی حلفے کے بغیر، ادیبوں اور شاعروں کے دوش بدوش چل رہی ہیں اور گزشتہ بیس برس کے دوران اپنی فکری اہمیت اور فنی ریاضت کے سبب اب وہ اس مقام پر پہنچ گئی ہیں جہاں ادب کے "چان نشینوں" کے نزدیک اس کا شعر توجہ کا تو مستحق ہے مگر کسی رعایت کا ہرگز مستحق نہیں ہے

یہ میری انا کا فیصلہ ہے
میں اپنی صلیب خود اٹھاؤں

ادب میں مواد اور ہیئت کی بحث اتنی پرانی اور پیچیدہ ہو چکی ہے کہ ادیبوں کے بجائے اب یہ مسئلہ سیاست دانوں کو حل کرنا چاہیے۔ میرے نزدیک یہ روح اور

پیراہن کا مسئلہ ہے۔ فضیلت بے شک روح کو حاصل سہی مگر یہ کچھ نصابی سی فضیلت ہے کہ پیراہن کی بُنت کٹ (T & C)، تراش اور طراز کی کافرماجرائی کے بغیر بھی تو بات نہیں بنتی۔ ہمارے اپنے دور میں بعض شعراء کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں کہ انہوں نے روح اقبال کو سمیٹ کر چلنا چاہا تو وہی حال ہوا کہ

یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک

کہتے ہیں حسن دیکھنے والے کی نگاہ میں ہوتا ہے ؏

نگاہِ شوق کو صحرا بھی دیوان غزالی تھا

کسی خیال کا نیا پن یا اس میں چونکا ہٹ کا عنصر یا کسی فن پارے میں قاری کو اپنا قیدی بنا لینے کی صلاحیت، ان سب باتوں کے ہونے یا نہ ہونے کا انحصار، بڑی حد تک اسلوبِ اظہار کی سُندرتا اس کے الہڑپنے یا رکھ رکھاؤ پر ہوتا ہے۔ عمدہ چائے کی طرح اب یہ کوملتا، جتنی آنچ سے بھی ترکیب پا جائے کیونکہ اس کا کوئی سکّہ بند نسخہ آج تک طے نہیں ہو سکا۔ بقول پروین سیّد فنا ؎

کھل کے رو لوں تو ذرا جی بہلے
مسکرانا ہی مسرت تو نہیں

پروین سیّد فنا نظم، غزل حتیٰ کہ رباعی بھی کہہ لیتی ہیں۔ ان کے فن پر روایت کی واضح چھاپ نظر آتی ہے، مگر یہ اس طرح کی روایت نہیں ہے کہ ؎

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا مجھے تو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

یہ روایت اپنے دامن میں زندگی کی توانائیوں اور سچائیوں کو لے کر چلتی ہے۔ جس طرح اپنے نظامِ فکر میں وہ تربیتِ آدم کے حوالے سے امن و انصاف کی قدروں، اصولوں اور معیاروں کے "گراس روٹ" (GRASS ROOT) پر قائم رہتے ہوئے

زندگی کو سچا اور سچا بنانے کی سعی کرتی ہیں۔ اس طرح ان کا فن بھی جدید تو ہے۔ البتہ بدعتی نہیں ہے۔ غزل میں انہوں نے کلاسیکی سلاست اور سادگی کو اپنے عصر کے سماجی تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے ایسی اُپج سے برتا ہے کہ ان کا شعر بظاہر اکہرا معلوم ہوتا ہے مگر اکہرا ہوتا نہیں۔ خیال کے تاثر اور فن کے جمال پر وہ لفظوں کا بوجھ نہیں پڑنے دیتیں۔ چند مثالیں دیکھئے ؎

اب تو سچ بولنے کی رسم نہیں — کس نے پھر اہتمام دار کیا

تیری پہچان کے لاکھوں انداز — سر جھکانا ہی عبادت تو نہیں
تجھ سے بیگانے کا غم ہے ورنہ — مجھ کو خود اپنی ضرورت تو نہیں

کم نگاہی بھی روا تھی شاید — آنکھ پابندِ حیا تھی شاید
ہم سفر تھے تو وہ بچھڑے کیوں تھے — اپنی منزل ہی جُدا تھی شاید

مت رو اَو خزاں نصیب پتو — اِک سلسلہ بہار بھی ہے

مرنے والو! مر بھی جاؤ — جینے والو! جشن مناؤ

دل میں تنہائی کا سناٹا ہے — ایک ویران مکاں ہو جیسے

وہ ایمائیت کی قائل ہیں مگر اظہارِ فن کا مانع اور حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔ ان کے یہاں کا ہوا ہو جانا تو باور آتا ہے مگر وہ پانی کو "اور بلاؤ" نہیں بننے دیتیں ؎

پیراہن کا مسئلہ ہے۔ فضیلت بے شک روح کو حاصل سہی مگر یہ کچھ نصابی سی فضیلت ہے کہ پیراہن کی بُنت کٹ (T اور) تراش اور طراز کی کافرما جرائی کے بغیر بھی تو بات نہیں بنتی۔ ہمارے اپنے دور میں بعض شعراء کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں کہ انہوں نے روح اقبال کو سمیٹ کر چلنا چاہا تو وہی حال ہوا کہ

یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک

کہتے ہیں حسن دیکھنے والے کی نگاہ میں ہوتا ہے ع

نگاہِ شوق کو صحرا بھی دیوان غزالی تھا

کسی خیال کا نیا پن یا اس میں چونکا ہٹ کا عنصر یا کسی فن پارے میں قاری کو اپنا قیدی بنا لینے کی صلاحیت، ان سب باتوں کے ہونے یا نہ ہونے کا انحصار، بڑی حد تک اسلوبِ اظہار کی سُندرتا اس کے الہڑپنے یا رکھ رکھاؤ پر ہوتا ہے۔ عمدہ چائے کی طرح اب یہ کوملتا، جتنی آنچ سے بھی ترکیب پا جائے کیونکہ اس کا کوئی سکّہ بند نسخہ آج تک طے نہیں ہو سکا۔ بقول پروین سید فنا ؎

کھل کے رو لوں تو ذرا جی بہلے
مسکرانا ہی مسرت تو نہیں

پروین سید فنا نظم، غزل حتیٰ کہ رباعی بھی کہہ لیتی ہیں۔ ان کے فن پر روایت کی واضح چھاپ نظر آتی ہے، مگر یہ اس طرح کی روایت نہیں ہے کہ ؎

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا مجھے تو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

یہ روایت اپنے دامن میں زندگی کی توانائیوں اور سچائیوں کو لے کر چلتی ہے۔ جس طرح اپنے نظامِ فکر میں وہ تربیتِ آدم کے حوالے سے امن و انصاف کی قدروں، اصولوں اور معیاروں کے "گراس روٹ" (GRASS ROOT) پہ قائم رہتے ہوئے

زندگی کو سچا اور سُچا بنانے کی سعی کرتی ہیں۔ اس طرح ان کا فن بھی جدید تو ہے۔ البتہ بدعتی نہیں ہے۔ غزل میں انہوں نے کلاسیکی سلاست اور سادگی کو اپنے عصر کے سماجی تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے ایسی اُپج سے برتا ہے کہ ان کا شعر بظاہر اکہرا معلوم ہوتا ہے مگر اکہرا ہوتا نہیں۔ خیال کے تاثر اور فن کے جمال پر وہ لفظوں کا بوجھ نہیں پڑنے دیتیں۔ چند مثالیں دیکھئے ؎

اب تو سچ بولنے کی رسم نہیں — کس نے پھر اہتمام دار کیا

تیری پہچان کے لاکھوں انداز — سر جھکانا ہی عبادت تو نہیں
تجھ سے بیگانے کا غم ہے ورنہ — مجھ کو خود اپنی ضرورت تو نہیں

کم نگاہی بھی روا تھی شاید — آنکھ پابندِ حیا تھی شاید
ہم سفر تھے تو وہ بچھڑے کیوں تھے — اپنی منزل ہی جُدا تھی شاید

مت رو اَو خزاں نصیب پتو — اِک سلسلۂ بہار بھی ہے

مرنے والو! مر بھی جاؤ — جینے والو! جشن مناؤ

دل میں تنہائی کا سناٹا ہے — ایک ویران مکاں ہو جیسے

وہ ایمائیت کی قائل ہیں مگر اظہارِ فن کا روایتی اور حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔ ان کے یہاں کا ہوا ہو جانا تو باور آتا ہے مگر وہ پانی کو "اود بلاؤ" نہیں بننے دیتیں ؎

سر سے آنچل تو نہ ڈھلکا تھا کبھی
ہاں بہت تیز ہوا تھی شاید

پھر سے کہہ دے کہ تری منزلِ شوق
میرا دل ہے مری صورت تو نہیں

وقت گزرا کہ قیامت گزری
کوئی سیلاب رواں ہو جیسے

سنی حسینؓ ابن علیؓ کی بیٹی روشنی تقسیم کرنے کے عمل میں بخل سے کیسے کام لے سکتی تھی اور اظہار میں بھلا کوئی عجز کیوں مانع ہوتا۔ فن کے جمالیاتی تقاضوں کو وہ بڑی جگر کاری سے پورا کرتی ہیں، چنانچہ ان کا ہر شعر ایک گنگناتا ہوا حسن پارہ یقیناً ہوتا ہے مثلاً

جانے دشتِ آگہی تھا یا بیابانِ جنوں!
ریت کے ذرّوں میں ہم شمس و قمر دیکھا کیے

بادلوں کی نرم رِم جھم سے یہ کیا بجلی گری
کیا بنایا تھا نشیمن ہم نے اس دن کے لیے

ان کا ایک اور شعر ہے ؎

فنا سے بھی نہ دریا ہو سکا طے
کہ اس کے پاس بھی کچا گھڑا تھا

جہاں تک "حرفِ وفا" کے جمالِ فن اور سطحِ فن کا تعلق ہے وہ نہایت محکم

مضبوط گھڑا رکھتی ہیں اور اگرچہ بعض پُرشور مقامات پر زیر و بم کا کچھ احساس ہوتا ہے اور کون ہے جو ہچکولوں کے بغیر فن کے دریا کو عبور کر سکا ہو لیکن مجموعی طور پر اپنی ضخامت کے مجموعے میں فنی خوب صورتیوں کی جو بلند اور لطیف سطح اوّل سے آخر تک برقرار نظر آتی ہے۔ وہ ان کی شاداب اور دل پذیر قادر الکلامی کا بین ثبوت ہے۔ ان کا شعر تندرست ہوتا ہے اور خوب صورتی تندرستی ہی کا نام ہے۔ ان کے کئی شعر تو "ملٹری اکیڈمی کے کمیشن یافتہ" معلوم ہوتے ہیں اور بریگیڈیر سید احمد کی کراس بیلٹ کی طرح کسے اور چمکتے رہتے ہیں۔

نظم میں بھی ان کے ہاں اظہار کی ایک ایسی سیدھی اور سچی مٹھاس اور بے ساختہ نغمگی رچی ہوئی ہے جس نے "حرفِ وفا" کو فن کی ایک ایسی کھڑی فصل بنا دیا ہے کہ اس کی "ہر ستھری" کرنوں کی طرح لچکتی اور سونے کی طرح چمکتی ہے۔

"حرفِ وفا" میں بہت سی آزاد نظمیں شامل ہیں۔ آزاد نظم ابھی تجرباتی دور سے گزر رہی ہے اور کچھ عجب نہیں کہ یہ ہر دور میں تجرباتی دور سے گزرتی رہے جو اپنی جگہ پر ندرت و نمود کے اعتبار سے خیر و برکت کی علامت ہے۔ لیکن تجربات دریاؤں کی طرح اپنے ساتھ مٹی بھی لاتے ہیں سو اس رَو میں بعض لوگ مواد کو ملبے کی صورت میں اس طرح اچھالتے ہیں کہ قاری بھی ملبے میں لت پت ہو جاتا ہے۔ زبان کو پتلا کرتے ہیں۔ تو اب آپ بے شک شعر کے ذریعے سے برین منجھوا لیجیے یا آلو پیاز خرید لائیے۔ مگر جناب کیا مجال کہ شعر کے ساتھ کہیں آپ کا دل بھی ذرا سا دھڑک اٹھے یا روح میں روشنی یا رنگ کی کوئی کرن چمک اٹھے۔ سراغِ زندگی پانے کے لیے من میں ڈوبنے کی سعی کرتے ہیں تو کسی تالاب میں جا کر ڈوب جاتے ہیں۔ ع

جو یقیں تھا وہ گماں ہو جیسے

پروین سید فنّ کے ہاں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ انہوں نے اپنی آزاد نظم میں

آہنگ و دل نشینی کا ایسا التزام رکھا ہے جس سے شعر کی خاندانی نجابت پر بھی آنچ نہیں آنے پاتی نہ ابلاغ کا دم گھٹتا ہے اور نہ اظہار کا قافیہ تنگ ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

جگمگاتے ہوئے خوابوں کے جزیرے میں رواں تھی وہ رات
مسکراتی ہوئی!
شرماتی ہوئی!
جیسے بانہوں کو سمیٹے ہوئے دوشیزہ کھڑی ہو کوئی (نظم ۶ ستمبر ۱۹۴۴ء سے اقتباس)

ایک دوسری نظم "عہدِ نو" میں ہیئت اور آہنگ کا ایک تجربہ ملاحظہ ہو۔

ذرا پھر تم قسم کھا کے کہہ دو
اگر یہ زمیں ——— یہ تمہاری زمیں
تم سے اپنی بقا کے لیے
اپنی رنگیں قبا کے لیے
پھر سے مانگے لہو ——— تو کہو
جان دو گے!
لڑو گے!
مرو گے!
خدا کی قسم سوچ لو
جان لو!
اپنا اچھا بُرا خود ہی پہچان لو
پھر نہ کہنا خبر نہ ہوئی
پھر نہ کہنا کسی نے گواہی نہ دی
پھر نہ کہنا فقط ایک انسان کا فیصلہ

پوری ملت کی تقدیر بنتا رہا!

میرے خیال میں ان کی آزاد نظمیں جن میں "استفسار" "سہاگن" "محافظ" "حرفِ وفا" اور "فیشن پریڈ" خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ نظم آزاد کے قبول و فروغ میں بعض خوشگوار اور وقیع جہتوں کا اضافہ کریں گی۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں "حرفِ وفا" میں فنی روایت کا تسلسل ملتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ، بلکہ اس کے باوجود، یہ ایک چونکا دینے والی کتاب بھی ہے جس میں قدم قدم پر تازگی اور انفرادیت کے جھرمٹ آباد ہیں۔ پروین سید فنا کی انفرادیت خیال و معنی کی سکندری و قلندری سے بھی عبارت ہے، اور اس کے متوازن، مترنم اور فنکارانہ اسلوبِ اظہار سے بھی، قدرت نے ان کو ایک ایسا جوہر بھی عطا کر رکھا ہے جو عورت ذات میں بالعموم اور مرد شعراء میں بالخصوص بہت کم پایا جاتا ہے وہ ہے توازن کے ساتھ اختصار کا ملکہ ان کی چھوٹی چھوٹی نظموں کے متنوع ——— پیلے پیلے، نیلے نیلے، اودے اودے عنوانات دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ جیسے اعلیٰ ملبوسات کی کسی بڑی دکان میں رنگا رنگ ریشمی کٹ پیس (CUT PIECE) بکھرے پڑے ہوں۔ پروین سید فنا تاثر آفرینی کے اس (SHORT CUT) سے بخوبی واقف ہیں کہ بات کہاں سے شروع کرنی چاہیے؟ کس طرح کرنی چاہیے اور کہاں ختم کرنی چاہیے! یہی وجہ ہے کہ ان کی چار چار چھ چھ لائنوں کی "کیپسول" قسم کی نظمیں بھی بے پناہ تاثر چھوڑتی ہیں اور پھر ان کی انفرادیت کا راز اس جرأت میں بھی مضمر ہے جو اُن کی کتاب میں ہی نہیں ان کی زندگی میں بھی ملتی ہے۔ ایک واقعہ عرض کرتا ہوں ۱۷ دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ کے دوران ہمارے عزیز دوست عکسی مفتی نے جو ان دنوں پاکستان نیشنل سنٹر سے وابستہ تھے فن کاروں کے ایک جلوس کا اہتمام کیا صورت یہ تھی کہ چند شاعروں اور موسیقاروں کو طبلے اور ہارمونیم سمیت ایک ٹرک کی چھت پر بٹھا دیا گیا۔ یہ ٹرک دن بھر راولپنڈی شہر کے

کوچہ و بازار میں گھومتا پھرا اور شعرا اور موسیقار اپنے شعروں اور نغموں سے عوام کے دلوں کو گرماتے رہے۔ ان فنکاروں میں پروین سیّد فنا بھی شامل تھیں مجھے یاد ہے۔ جلوس جب گارڈن کالج پہنچا تو ہزارہا طلبا کا ریلا ٹرک کے اردگرد اُمنڈ آیا۔ اوپر سے ابھی ابھی بھارتی طیارے جھپٹتے ہوئے گزرے تھے۔ فضا میں ہماری طیارہ شکن توپوں کی دھائیں دھائیں گونج رہی تھی۔ اور اس گونج اور اللہ اکبر کے نعروں کی صداؤں کے درمیان پروین سیّد فنا کی آواز بھی گونج رہی تھی۔

میرے پیارے وطن کے محافظ!

ہر قدم پر خدا تیرا حافظ!

تیرے دامن کو پھولوں سے بھر دوں

اپنا دل، اپنی جان، اپنی خوشیاں

تیری ہمت پہ قربان کر دوں

میرے پیارے وطن کے محافظ! ہر قدم پر خدا تیرا حافظ!

ان نغموں کی سرزمین سے حبِّ وطن کا سوتا اور دیس کی مٹی کی خوشبو بار بار جھلکتی ہے۔ پروین سیّد فنا نے وطن کی تاریخی آزمائش کے موڑ پر اپنے آنچل کا پرچم بنا لیا ہے مگر تیز ہوا کے باوجود اس روز بھی ان کا آنچل ان کے سر سے ڈھلکنے نہیں پایا تھا۔ یہی رویہ ان کا اپنے فن کی طرف ہے۔ وہ اپنے فن کے آنچل کو کبھی ڈھلکنے نہیں دیتیں۔ ہوا خواہ کتنی ہی تیز کیوں نہ ہو!

(حرفِ وفا کی تعارفی تقریب منعقدہ اسلام آباد میں پڑھا گیا)

اُردو ادب کا مواصلاتی سیّارہ

اردو کے جواں سال شاعر اور ہمارے خوش گفتار دوست جناب جمیل یوسف ہمسائے کی املاک کی بجائے اس کے اخلاق پر نظر رکھتے ہیں اور دشمنوں کی بجائے دوستوں کے بارے میں سوچتے ہیں۔

سلطان رشک کے اعزاز میں آج کی تقریب جمیل انہی کی سعی جمیل کا ثمر ہے۔ انہوں نے مجھے اس تقریب کی اطلاع جس میں مضمون لکھنے کی بھی فرمائش شامل تھی۔ ٹیلی فون پر دینا چاہی تھی۔ ع

مگر اپنے اپنے مقام پر کبھی وہ نہ تھے کبھی ہم نہ تھے

آخر کار جب یہ بشارت ملی تو تقریب "اتنی" عنقریب آ چکی تھی کہ ہمارے لیے سلطان کو وسک دینا بھی مشکل ہو گیا۔ مشکل دو طرفہ تھی۔ سلطان کی خرابی یہ ہے کہ اس نے عمر کم اور زندگی زیادہ گزاری ہے۔ سویا کم اور جاگا زیادہ ہے۔

ہماری مشکل یہ تھی کہ ہم اس کو پھل سے نہیں جڑ سے جانتے تھے۔

وہ سلطان سے سلطانِ عالم۔

سلطان عالم سے سلطان رشک اور سلطان رشک سے قابلِ رشک۔

ہمارے سامنے بنا ہے۔

سلطان رشک کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ ادبی حلقوں میں تعارف کا محتاج نہیں، ایک رسمی سی بات ہوگی۔ وہ تو بذاتِ خود نشریات کا ایک ایسا مواصلاتی سیارہ ہے کہ دوسرے لوگ اس کے رابطے سے تعارف و توقیر حاصل کرتے ہیں۔ اپنے ایک شعر میں اس نے اپنے چال چلن کے بارے میں کچھ یوں وضاحت کی ہے۔ ع

صبا صفت ہوں ہمیشہ سفر میں رہتا ہوں
ہر اک مقام ہر اک رہگزر میں رہتا ہوں

وہ ہر مقام اور ہر رہگزر پر نہ تو رہتا ہے اور نہ رہ سکتا ہے کہ ابتداً جس گلی میں رہتا تھا۔ اب وہاں بھی نہیں رہتا۔

البتہ روزمرہ کی زندگی میں شہر کے چھ، سات مختلف مقامات پر ضرور رہتا ہے، جہاں وہ مختلف و متضاد مزاج، مقاد، معیار اور مضمون کے لوگوں کے درمیان بظاہر ایسی خوش دلی کے ساتھ رہتا ہے۔ جیسے مچھلی پانی میں۔ اسی غزل میں اس کا دوسرا شعر ہے ع

میں ابر و باد سے طوفاں سے سب سے ڈرتا ہوں
غریبِ شہر ہوں کاغذ کے گھر میں رہتا ہوں

وہ نہ غریب ہے اور نہ کاغذ کے گھر میں رہتا ہے۔ کہ امیر لوگ کاغذ کے نہیں، شیشے کے گھر میں رہتے ہیں۔ البتہ لوگوں کے دلوں میں اس نے ضرور گھر کر رکھا ہے۔

میں سوچتا ہوں کہ اگر محبوں، مداحوں، معاصرین اور متاثرین کا عشر عشیر بھی اس تقریب میں پہنچ گیا تو پاکستان نیشنل سنٹر کا ایوانِ کشادہ بھی تنگ ہو جائے گا۔ اس تقریب کی ایک اور خصوصیت بھی قابلِ ذکر ہے کہ سلطان رشک کی شاعری۔ جوشِ نمو کے لحاظ سے آغازِ بہار کے موسم سے گزر رہی ہے۔

جمیل یوسف نے کمال خیال انگیزی سے اس تقریب کا اہتمام بھی موسمِ بہار کے آغاز میں کیا ہے۔ توقع رکھنی چاہیے کہ سلطان رشک کی شاعری کے حوالے سے کچھ اندازہ بات کا بھی ہو جائے گا ع

فصلِ بہار کے آتے آتے کتنے دامن چاک ہوئے

کچھ پہلے میں نے سلطان کی روزمرہ زندگی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

سلطان ایک تجارت پیشہ خاندان کا "چٹا بٹا" یعنی چشم و چراغ ہے۔ اس کا پہلا پڑاؤ اندرون شہر کے مصروف ترین تجارتی مرکز المتخلص بہ نوٹنکاری بازار میں ہوتا ہے جو اس قدر گنجان اور تنگ ہے کہ اس میں شاعری کا گزر نہیں ہو سکتا۔ اس کا دوسرا پہر لیاقت روڈ پر واقع ایک دوسرے کاروباری ادارے میں گزرتا ہے۔ تیسرے پہر وہ تیسری جگہ کالج روڈ پر نیرنگ خیال کے بالاخانے میں، ادب کا دفتر لگاتا ہے اور اس کے بعد وہ خاصی دیر تک تجارت اور ترازو کے ہاتھ سے نکل کر قلم اور قرطاس کی صحبت میں ڈوبا رہتا ہے۔ اس کی اکثر شامیں کسی باقاعدہ ادبی تقریب یا ادیبوں کے بے قاعدہ جھرمٹ میں گزرتی ہیں۔ تاجر ہونے کے باوجود اس کو یہ بات معلوم ہے کہ روپیہ صحت نہیں خرید سکتا۔ چنانچہ رات کے کسی پہر میں جب سارا عالم سوتا ہے۔ وہ ایک کلب میں جا کر بیڈمنٹن کھیلتا ہے۔

اور بازی کچھ اس طرح سر دھڑ کی بازی لگا کر کھیلتا ہے جیسے تجارت تو تجارت ہے۔ وہ صحت کو محبت سے بھی مقدم رکھتا ہے۔

اس کے بعد شاعری اور بچوں کے لیے اس کے پاس صرف "ٹافیاں" رہ جاتی ہیں۔ وہ ان دونوں کو ٹافی اور سینے سے لگائے آٹھوں پہر ساتھ ساتھ لیے پھرتا ہے۔ چنانچہ اس کا بیٹا بڑا فیصل جو اب ماشاء اللہ چھ برس کا ہو چکا ہے۔ باپ کی شاعری اور باپ کے دوستوں سے یکساں طور پر بور ہو چکا ہے۔

میں ایک مرتبہ ان کے سامنے مسٹر مشتاق احمد چاندنہ دہلوی کا نام کے کر عزیزم کا ردِ عمل سن چکا ہوں۔ البتہ یہ خوشی کی بات ہے کہ ان چھوٹی چھوٹی گھریلو مشقتوں کے باعث سلطان کی مجموعی گھریلو زندگی بڑی ستواں نظر آتی ہے۔ ورنہ شادی کے بعد اکثر مرد مشتبہ ہو جاتے ہیں۔

سلطان کے بیڈمنٹن کلب کو معروف تاجروں اور سوداگردوں کا حلقۂ اربابِ چوک کہنا چاہیے۔ یہ کلب بازار بند ہونے کے بعد کھلتا ہے۔

کھلاڑی پہلے نمازِ عشا ادا کرتے ہیں۔ اور پھر رات کے پچھلے پہر دعوتِ ولیمہ کی طرح کئی گھنٹے تک لقمہ بہ لقمہ کھیل جاری رہتا ہے۔ اس کلب کے اکثر ممبروں کے لیے کھیل لہو نہیں، شکم گرم رکھنے کا بہانہ ہے۔

ایک صاحب جو ایک بڑے سوداگرِ چرم بتائے جاتے ہیں۔ ایک گیم کھیلتے ہیں تو دو مرتبہ وقفہ تناول ڈال کر حلوہ گاجر تناول فرماتے ہیں ؎

گر جیت گئے تو کیا کہنے ہارے بھی تو بازی مات نہیں

سلطان رشک اپنے جملہ ہیوی ویٹ معاصرین میں سب سے زیادہ چابک دست اور پھرتیلا کھلاڑی ہے۔ رات کے بارہ بجے وہ اسی کلب میں ملتا ہے۔

راولپنڈی کے اربابِ ادب کو اس بات کا علم ہے کہ جب عبدالعزیز فطرت زندہ تھے تو شہر میں ان کا گھر ادیبوں۔ ادب سرائے کی حیثیت رکھتا تھا۔ ان کے بعد رفتہ رفتہ اسی زندہ و تابندہ ریل پیل کا رُخ "نیرنگ خیال" کے بالاخانے کی طرف ہوتا چلا گیا۔

منفرد مزاح گو شاعر نذیر احمد شیخ مرحوم دفتر نیرنگ خیال کو "دارالتصنیفات" کے بجائے "دارالتشریفات" کہا کرتے تھے۔ آپ اگر کبھی وہاں تشریف لے گئے ہیں تو آپ وہاں کتابوں سے زیادہ بستر دیکھیں گے۔ کتاب بند بستر کھلا۔ کمرے کا دروازہ

کھلنے پر یوں لگتا ہے جیسے کوئی دفتر نہیں بستر کھل گیا ہے۔ جس میں تکیے کی بجائے نیرنگ خیال کے غزل نمبر اور جوبلی نمبر استعمال کئے جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ سید عبدالحمید عدم ایک رات یہاں ٹھہرے۔ تو جاتے ہوئے یہ مصرعہ لکھ کر سلطان کو دے گئے ؎

جن پہ بستر تھا۔ وہی تکیے ہوا دینے لگے

تجارت نہیں سلطان رشک مہمان داری بھی تھوک کے حساب سے کرتا ہے۔

مہمان داری دفتر نیرنگ خیال کی پرانی ریت ہے۔ لاہور میں قبلہ حکیم محمد یوسف حسن صاحب کا دفتر خواہ فلیمنگ روڈ پر تھا۔ یا بارود خانہ میں ہمیشہ ادیبوں کا مسافر خانہ رہا مجھے یاد ہے کہ جن دنوں ہم اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھتے تھے۔ تو جب کبھی ہم خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی۔ پروفیسر سید احمد شاہ بخاری۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر، پنڈت ہری چند اختر سید امتیاز علی تاج، ابوالاثر حفیظ جالندھری، صوفی تبسم۔ مولانا چراغ حسن حسرت، سید عابد علی عابد یا کسی دوسرے نامور ادیب و شاعر کی صورت دیکھنا چاہتے تو فلیمنگ روڈ پر نیرنگ خیال کے دفتر کے سامنے جا کر گنگنا کر یاں چوسنے لگتے۔ اور بعض اوقات ہم یہ دیکھ کر حیران بلکہ آزردہ ہو گئے کہ ہمارے یہ اکابرینِ ادب بھی اندر گنڈیریاں ہی چوستے پائے جاتے۔ سچ ہے بڑے مصنفین کو ان کی کتابوں ہی میں دیکھنا چاہیے۔

بے ملاوٹ خوشی کا زمانہ۔ جاتے ہوئے بچپن اور آتی ہوئی جوانی تک محدود ہوتا ہے۔ اٹھتی جوانی کا اپنا جبڑا خواہ مخواہ بھنچا ہوا ہی کیوں نہ ہو۔ زندگی کا چہرہ کتابی اور رنگ شہابی ہوتا ہے۔ ہونٹ بند ہوں تو غنچہ۔ کھلیں تو کھل کر پھول۔

سلطان رشک سے جب ہماری ملاقات ہوئی تو وہ اپنی عمر کے اسی آریائی دور کی رسم ملائی سے گزر رہا تھا۔ آرزوؤں کی روشنی ابھی تازہ تازہ اس کی زندگی کے آنگن میں اتری تھی۔ جیسے ایشیا میں سورج کی کرنیں سب سے پہلے جاپان کی زمین

پر اترتی ہیں۔ وہ اس وقت گارڈن کالج کے ثقافتی غزالوں کا سرخیل تھا۔ جن کی چہل پہل سے گارڈن کالج باغ باغ رہتا ہے۔

مشہور و ممتاز ادیبوں کے ساتھ شام منانا سلطان کا محبوب مشغلہ تھا! ادبی شاموں کی ہمہ ہمی نے ان دنوں کالج کی ہر شام کو "شامِ چوراسی بنا رکھا تھا۔ خود ہماری شہرت بھی اسی کی دوڑ دھوپ سے کالج کی ایک شام میں روشن ہوئی تھی۔

ادبی شاموں کا سودا اتنا نقد نہ ہی کہ ایک ہاتھ سے دو اور دوسرے ہاتھ سے وصول کر لو۔

ادھار بہر حال ادھار ہے ایک روز چکانا ہی پڑتا ہے۔

ہم سب ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ ٹیکس ضرور وصول کرتے ہیں۔

سلطان ایک ایسے تجارت پیشہ خاندان میں پیدا ہوا ہے۔ جو اپنی معلوم تاریخ میں تجارت اور عبادت کے علاوہ کوئی اور کام کر ہی نہیں سکا۔ ادب کی بس اتنی سی روایت سلطان کو ورثے میں ملی ہے کہ ان کے والد روٹی کا ناغہ کر لیتے تھے مگر اخبار کا ناغہ نہیں کرتے تھے۔

سلطان پانچ بھائیوں میں سے چوتھا بھائی ہے، تعلیم میں پہلے نمبر پر، تجارت میں چوتھے نمبر پر۔ یہ بڑے بھائیوں کے سامنے "سرِ تعظیم اور بڑے بھائی اس کے سامنے سرِ تعلیم" خم کیے رکھتے ہیں۔ ان کے بزرگ زرداری تو تھے زرتاری نہ تھے۔ دولت آئی رعونت نہیں آئی۔ وہ قانع ہیں، مگر مطمئن نہیں۔ پیدائش دہلی میں فرائض پنجاب میں۔ حکومت مغلوں کے ہاتھ میں تجارت ان کی گرفت میں۔ لال قلعہ ان کا اور چاندنی چوک ان کا۔ سلطان کے بڑے بھائی سردارِ خاندان۔

جناب سردار عالم صاحب سے مل کر مجھے ہمیشہ محسوس ہوا کہ آدمی "کالا کولا" بیچ کر بھی شفاف رہ سکتا ہے۔ اور یہ کہ جس آدمی کے دل میں خوفِ خدا ہوتا ہے

دولت اس کی خادم ہوتی ہے۔ آقا نہیں بن جاتی۔ دولت چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔

قیامِ پاکستان پر جب یہ خاندان اکھڑ کر گوجر خان میں وارد ہوا تو دولت کی چھاؤں دہلی رہ گئی۔ اللہ کی آس اور ہمت کی اساس کے سوا ان کے پاس کوئی پونجی نہ تھی۔ اسی متاع سے روزگار کیا بقول سید ذوالفقار علی بخاری ؎

ہم ہوئے جو کچھ یہیں رہ کر ہوئے

انسان کی سب سے بڑی قوت اس کا ارادہ ہے۔ سلطان نے اس قوت سے بڑا کام لیا ہے۔ وہ بی اے / ایم اے کے امتحان محض اپنی قوتِ ارادی کا امتحان لینے کے لیے پاس کرتا چلا گیا۔ ورنہ جہاں تک اس کے آبائی کاروبار کا تعلق تھا۔ وہ تعلیم سے نہیں تفہیم سے چلتا ہے۔ اس کے لیے پڑھنے سے زیادہ گڑھنا ضروری ہے۔

اس کی قوتِ ارادی اور ترجیحات کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ اس نے ایک تاجر اور ایک شاعر کو اپنی ذات میں اس طرح شیر و شکر کر رکھا ہے کہ دونوں میں کوئی بھی بھوکا مرنے نہیں پاتا۔

بیک وقت کئی تجارتی منصوبوں میں اس کی ٹانگ اور کئی ادبی منصوبوں میں اس کا قلم پھنسا رہتا ہے۔ کعبہ پیچھے پیچھے۔ کلیسا آگے آگے مختلف کاروباری ہیڈ کوارٹروں میں چار چھ ٹیلی فون اس کی تلاش اور تعاقب میں شب و روز بجتے رہتے ہیں۔ وہ خود بھی ٹیلی فون سے دور رہنا پسند نہیں کرتا کہ ٹیلی فون کے بغیر تجارت غارت ہو جاتی ہے۔ ورنہ عبدالعزیز خالد کی طرح ٹیلی فون اٹھوا کر باورچی خانے میں رکھوا دے۔ روح کے لحاظ سے وہ دراصل تجارت کا آدمی نہیں عبارت کا آدمی ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ وہ دکان پر ایک اظہر جاوید کا خیر مقدم کرنے کے لیے دس گاہکوں کو خالی لوٹا دیتا ہے۔

تجارت کے ذریعے اس نے اپنی محنت سے کمائے ہوئے سکھ کے ساتھ ادب کی شکل میں ایک رضاکارانہ دُکھ اپنی جان کو لگا رکھا ہے۔

اس کے گودام میں مینڈورا آف لنڈن لنڈورا پڑا رہتا ہے۔ مگر نیرنگِ خیال کے پرچے سلیقے سے چُنے رہتے ہیں۔ ادب سے لگاؤ کی ایک اور مثال دیکھیے۔ کچھ عرصہ ہوا، کاروبار کے ایک مرحلے پر جب کسی شخص کے ساتھ شراکت کا مسئلہ پیدا ہوا تو سلطان نے اس کار خوش میں کرنل محمد خان جیسے ممتاز ادیب کو منتخب کیا۔ تاکہ ترقی کا راستہ کچھ تو ہموار ہو سکے اور یہ دونوں دوست کاروبار کے طرزِ نگارش کے ہر پہلو میں اتنے غیر متزلزل طور پر متفق الرائے ہیں۔ کہ ان میں سے ایک پارٹنر فالتو معلوم ہوتا ہے۔

اکبر الہ آبادی نے کہا تھا کہ ع

دیکھ لو تاجر کے سر پہ تاج ہے

سلطان رشک تاجر کے تاج کے لیے بے شک دن بھر دونوں ہاتھوں سے موتی سمیٹتا ہے۔ مگر شام کو دفترِ نیرنگِ خیال میں جا کر تاجر کے تاج کو شاعر کے قدموں میں ڈال دیتا ہے۔ میں نے ایسا سا ہوکار آج تک نہیں دیکھا۔ جس کی عادتیں مہاجنوں کا دوالہ اور مہاجنیت کا جنازہ نکالنے والی ہوں۔

ادب ایک ایڈونچر (ADVENCHER) ہے۔ سلطان اگر ٹھیٹھ کاروباری شخص ہوتا تو کبھی اس کا رخ نہ کرتا۔ اپنی معنوں میں وہ غریبِ شہر بھی ہے اور کاغذ کے گھر میں بھی رہتا ہے۔

مدیرِ نیرنگِ خیال۔ مال اور خیال دونوں کو ایک تجوری میں رکھتا ہے اس کی پشت پر اگر رموزِ تجارت کے نکتہ رس بھائی نہ ہوتے اور خود بھائیوں کے پیچھے دہلی کا چاندنی چوک پھیلا ہوا نہ ہوتا تو سلطان رشک نہ تجارت میں سربلند

ہوتا اور نہ ادب میں قابلِ رشک۔

ادبی روایتوں کو اگر عمارتوں کے "ڈکشن" میں بیان کرنے کی اجازت ہو تو میں حکیم محمد یوسف حسن کے "نیرنگِ خیال" کو۔ لاہور کے تاریخی شاہی قلعے سے تشبیہہ دوں گا۔ قلعے کے آثار میں اگر صدیوں کی تاریخ جھلک رہی ہے تو نیرنگ خیال کے اوراقِ پارینہ میں، ادب و تہذیب کی تاریخ محفوظ ہے۔ وہ سنگ و خشت کا قلعہ یہ لفظ و معنی کا شالامار۔ اس کی ادارت کو سنبھالنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہ ادب و تہذیب کے عظیم الشان شیش محلوں۔ بارہ دریوں اور روشن جھروکوں کے تحفظ کی گراں بار ذمہ داری تھی۔ قلعے کی دیواروں پر گرد کے علاوہ کہیں کہیں شگاف بھی پڑ چکے تھے گویا مرمت اور رفو کا کام بھی کچھ نہ تھا۔ پیشرو کون؟ حکیم محمد یوسف حسن جیسا عہد ساز مدیر۔ مزید برآں، جانشینی کا فریضہ ان کی دیکھتی آنکھوں اور سنتے کانوں کے سامنے ادا کرنا۔ بڑی آزمائش کا مرحلہ تھا۔ بلندی پر جا کر اکثر لوگوں کا سر چکرانے لگتا ہے۔ بڑے آدمی جگہ خالی کریں تو چھوٹے آدمی۔ کرسی پہ تو بے شک بیٹھ جاتے ہیں مگر چھوٹا آدمی محض بڑی کرسی پر بیٹھ جانے سے تو بڑا آدمی نہیں بن جاتا۔ تاوقتیکہ اس کے اپنے اندر کوئی روشنی موجود نہ ہو۔ انسانی عظمت پکی پکائی روٹی نہیں ہوتی۔ اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ سلطان رشک نے گزشتہ برسوں میں ادب کے اس قلعے کو نہ صرف یہ کہ دھوپ اور بارش سے محفوظ رکھا ہے بلکہ تولنے میں وزنی اور بولنے میں وقیع خاص شماروں (بالخصوص غزل اور جوبلی نمبروں) کی صورت میں اس کے استر اور پلستر کو بھی نئے رنگ و روغن سے اس طرح تازہ کیا ہے کہ اب آپ اس قلعے میں گویا "مال روڈ" کی راہ سے داخل ہوتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ سلطان تنہا اس گراں قدر ادبی خدمت کے لیے وابستگانِ شعر و ادب کی طرف سے پذیرائی اور ستائش کا مستحق ہے۔

سلطان رشک غزلِ جدید کے قابلِ ذکر نوجوان شعراء میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اسی باعث تو لوگ اس کے بارے میں جاننے کے خواہش مند ہیں۔ اور کیسے کیسے لوگ اس کی باتیں سننے آتے ہیں۔ ؎

مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

شاعری میں غزل۔ سلطان کی پہلی محبت ہے۔ کہتے ہیں کہ مکمل ایک عورت ایک مکمل مرد سے بہتر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مکمل عورت بہت کم دستیاب ہوتی ہے۔ یہی عالم غزل کا ہے۔ میرے نزدیک مکمل غزل۔ مکمل نظم سے بہتر ہوتی ہے۔ چنانچہ مکمل غزل بھی بڑی مشکل سے مکمل ہوتی ہے۔

ادب کے وظائف کی فہرست بڑی طویل ہے۔ مختصراً۔ میرے نزدیک ادب کا فریضہ زندگی کے معنی دریافت کرنا ہے کہ یہ دبال آخر کیا ہے اور کیوں ہے۔ ادب کو انسان کی داخلی آسودگی و بالیدگی کے علاوہ اس کے بعض عجیب خارجی مقاصد کی تشفی کا بھی امین ہونا چاہیے۔ ادب میں آپ مکان ادب محلے ـــــ دین اور دنیا۔ کو علیحدہ علیحدہ نہیں رکھ سکتے۔ ادب کا اصل جادو، فن کار کے اسلوب میں ہوتا ہے۔ ورنہ فن کار اپنے خیالات کا قیدی ـــــ اور قاری ـــــ اس کا مزدور بن کر رہ جائے۔ سلطان رشک کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اذنِ بیداری جو دے وہ آفتاب آیا نہیں — اے شبِ ظلمت ترا روزِ حساب آیا نہیں
رزق کی تقسیم ایسی کیوں ہے اے سلطان رشک — آج تک اس ایک الجھن کا جواب آیا نہیں
رنگ لائی ہے مری ذات سے غفلت میری — میرے اندر متزلزل ہے حکومت میری
بیچتا پھرتا ہوں خود کو سرِ بازارِ حیات — مجھ کو رسوا کئے رکھتی ہے ضرورت میری
وقت ایسا کہ ہر اک قدر کا مفہوم نیا — اور بیگانہ حالاتِ طبیعت میری
بھولتا جاتا ہوں ذکرِ عارض و رخسار بھی — وقت اس مہتاب صورت پر بھی پیار آنے لگے

اس طرح تعمیر کر اپنی کہ اے سلطان رشک — ایک ذرہ بھی کہیں سے مستعار آنے نہ دے
اپنے چہرے پر سجا رکھے ہیں غم کے سلسلے — جانے کس کس سے الم کی داستاں کہنا پڑے
ایسی بستی کے مکینوں میں گھرا ہوں میں رہا — قریۂ دشمن کو ـــ کوئے دوستاں کہنا پڑے
سوچیں تھکی ہوئی ہیں کڑی دھوپ سر پہ ہے — اب کیسے طے کریں کہ کدھر جانا چاہیے
میری نظر میں ہے یہی معیارِ نقدِ فن !! — سچا ہو فن تو دل میں اتر جانا چاہیے
تیری میری ابتلا کے ترجماں ہو جائیں گے — چپ رہے بھی ہم تو یہ رستے زباں ہو جائیں گے
سچ کہا ہم نے تو دیوارِ انا ـــ گر جائیگی — فاصلے پیدا ـــ دلوں کے درمیاں ہو جائیں گے

سلطان رشک جواں سال ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی شاعرانہ شخصیت کی پوری قامت ابھی اس کے فن سے منکشف نہیں ہو پائی۔ یہ عمل "ادبی انٹرگز" کے خاتمے تک جاری رہتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی درمیان میں اچانک "رن آؤٹ" یا "ایل۔ بی۔ ڈبلیو" ہو جائے۔ میرے نزدیک سلطان رشک ایک جمال دوست اور صاحبِ بصیرت شاعر ہے۔ جس کا شعر کشش مکشِ جاں کے ناپیدا کراں امکانات کی نشان دہی کرتا ہے۔ وہ پیراہن شعر کی عیب رنگینی اور رعنائی کا اتنا خیال رکھتا ہے کہ اس کے شعر پر اگر خشمگیں نگاہ ڈالی جائے تو شعر ـــ ہمان کی طرح کملا جائے۔ ارسطو نے تین چیزوں کو دنیا کی بہترین نعمتیں قرار دیا ہے۔ انصاف ـــ حسن ـــ صداقت اور یہ تینوں چیزیں سلطان رشک کی شاعری کے محور کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بالخصوص صداقت کا دامن تو اس نے اتنی مضبوطی کے ساتھ تھاما ہوا ہے کہ اس کے اشعار ناجائز منافع خور اور ذخیرہ اندوز تاجروں کے سروں پر جا کر پھٹتے ہیں۔

میں نے سلطان رشک کی شاعری کا ذکر عمداً اختصار سے کیا ہے۔ کہ میرے سامنے شعر سے زیادہ شخص پھیلا ہوا تھا۔ شاعری سب کے سامنے ہے۔ شخص سب کے سامنے نہیں ہے۔

(یکم مارچ ۱۹۸۰ء کو راولپنڈی میں ایک خصوصی تقریب میں پڑھا گیا)

اُردو شاعری کی رانی جھانسی

میرے اپنے دل میں اپنے لیے کوئی عزت نہیں ہے۔ مگر جب محترمہ پروین شاکر نے مجھے اس تقریب میں اظہارِ خیال کے لیے کہا تو اپنی کچھ ساکھ اپنی نظر میں بھی ہمک اٹھی۔ پروین شاکر۔ اب شعری منزلت کے اس زینے پر نہیں ہے کہ آدمی اس "بی بی" کو "بے بی"، "نور جشمی" وغیرہ کہہ کر۔ "لانبیے" ہو جائے۔ اس کے شعر کی خوشبو سے تو جدید اردو شاعری کا سارا گلستان مہک رہا ہے۔ بلکہ بہت سی طوطیاں اور عندلیبان اس کے لہجے کو "آڑا کر" اب اسی کے پروں پر اڑ رہی ہے وہ ان چند آوازوں میں سے ہے جن کو اس دور کی شعری دریافت کہنا چاہیے۔ منصف و حکمران اور اچھے شاعر کے درمیان بھی ایک قدر مشترک ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ آدھا ملک منصف حکمران کے خلاف ہو جاتا ہے اور اسی طرح ملک کے آدھے شعرا ـــــ اچھے شاعر کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ تو اس زاویے سے بھی۔ انکار کی شاعرہ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لڑکیاں بہت جلد جوان ہو جاتی ہیں۔ پروین تو شاعری کے حساب سے پیدا ہی جوان ہوئی ہے۔ ملکِ خداداد پاکستان کے مانند سمجھیے کہ ملک نیا قوم پرانی۔

پروین شاکر۔ شاعری کے "غیر مقلدین" میں سے ہے۔ اس اعتبار سے بھی یہ امر اس کی غیر معمولی اہمیت کی دلیل ہے کہ اسے۔ اس قدر وسیع پذیرائی زندگی ہی میں حاصل ہو گئی۔ اور ماشاء اللہ بہت جلد ملی۔ ورنہ کلیہ یہ ہے کہ "مقلدین" کی پذیرائی (جیسا کہ استاد ذوق) عموماً ان

کی زندگی میں ہوتی ہے اور غیر مقلدین کا غلغلہ "راؤلا رپا" وغیرہ۔ (جیسا کہ میرزا غالب کا) مرنے کے بعد۔

تو "انکار" پر اظہارِ خیال کرنا میرے لیے ایک اعزاز ہے۔ مگر ہر اعزاز کی طرح ایک آزمائش بھی ہے۔ یہ وہی فرق ہے جو اعزاز اور اعتزاز[1] میں ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ اس تقریب کا اہتمام "دائرہ" نے کیا ہے۔ تقریب طرازی کی بھیل سے "دائرے" کے سینے پر "کانسی اور تانبے کے تمغوں" کی تو لمبی قطاریں لٹک رہی تھیں مگر "طلائی تمغے" اس انجمن نے اب تک بمشکل دو تین ہی کمائے ہوں گے۔ بارے کہ اس کی فردِ عمل میں آج ایک بہت روشن تمغے کا اضافہ ہو گیا۔

اصولی طور پر کتابیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ اچھی کتابیں۔ یا بُری کتابیں۔ البتہ فروعی جھگڑالیوں نکل آتا ہے کہ۔ ہم سوچتے تو اجمال میں ہیں اور رہتے تفصیلات میں ہیں مطلب یہ کہ بعض کتابیں چبا چبا کر پڑھنے والی ہوتی ہیں اور بعض بس غڑاپ سے پی جانے والی کہ ادھر حلق سے اتریں اور ادھر ہضم۔ مگر "انکار" ان بیک وقت لذیذ اور فکر انگیز کتابوں میں سے ہے جو کھائی بھی جاتی ہیں اور چبائی بھی جاتی ہیں۔ یعنی یہ قاری کو بار بار اپنی طرف بلاتی رہتی ہے۔ ایسی شاعری سے کہ حیرتیں شعر شعر پہ۔ نقاب الٹ رہی ہوں عہدہ برآ ہونا کار دارد۔ میری کیفیت اس عمل میں کچھ وہی ہوئی جو ایک مرتبہ محترم دوست (ممتاز دانشور شاعر کالم نگار اور حکومت پاکستان کے ایک سابق سیکرٹری وزارتِ داخلہ) چوہدری فضل حق صاحب کی ہوئی تھی جب وہ ایک نوجوان پولیس افسر کی حیثیت سے کسی کورس پر انگلستان گئے تو برطانیہ کے تاریخ ساز وزیرِ اعظم سر ونسٹن چرچل سے "خصوصی انٹرویو" کا "پنگا" لے بیٹھے۔ خدا معلوم چوہدری فضل حق نے مسٹر چرچل کو کس طرح "ہینڈل" کیا۔ میں تو اپنے اس بحران میں سے اس طرح نکلا ہوں جس طرح دریا میں ڈوبنے والے آدمی

[1] صدر تقریب چوہدری اعتزاز احسن۔ وزیر داخلہ پاکستان (اب سابق۔ ادارہ)

کو بعض اوقات خود لہریں اچھال کر کنارے پر پھینک جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے سراسیمہ آدمی سے آپ گفتار میں کسی ترتیب کی توقع نہیں کر سکتے۔ البتہ گزارشات اگر کسی قدر طویل ہو جائیں تو اس کے لیے درگزر کا خواہاں ہوں۔ بُری عادت آسانی سے نہیں چھوٹتی۔ بس اگر خدانخواستہ کسی روز چار پانچ منٹوں میں اپنے مقالے کے مرکزی نکتے تک پہنچ گیا تو مجھے ڈر ہے کہ میرے لکھنے کی صلاحیت ہی ختم ہو جائے گی۔

دشواریاں کئی تھیں۔ پہلی تو وہ دشواری تھی جس کی نشان دہی خود پروین نے اپنے ایک مصرعے میں اس طرح کی ہے ؎

سادہ ہے بہت وہ نہ میں آسان بہت ہوں

یہ تو خیر فکری دشواری تھی، مگر ایک جغرافیائی گھاٹی بھی خاصی دشوار گزار نکلی۔ وہ تھی مقالے کی چناؤ کے لیے اشعار کے چناؤ کی مشکل۔ یہ اس قسم کی دشواری تھی جو زندگی میں اکثر آدمی کو محسوس ہوتی ہے کہ دنیا میں خوبصورت عورتیں بہت ہوتی ہیں اور وقت کم ہوتا ہے۔ اس شعری مجموعے میں بھی، خوب صورت اشعار کی تعداد بہت زیادہ تھی اور میرے پاس، جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ وقت کم بلکہ بہت کم ہے۔ مجبوراً صرف چند اشعار پر اکتفا کیا۔

لشکر کی آنکھ مالِ غنیمت پہ ہے لگی!
سالارِ فوج اور کسی امتحان میں ہے

اُس کا بھی دھیان، جشن کی شب اے سپاہِ دوست
باقی ابھی جو تیر سے عدو کی کماں میں ہے

مَند کے اپنے پاس نہ جائیں کہ پھر کھلے
وہ بے تعلقی جو مزاجِ شہاں میں ہے

اب تو فقط قیاس سے راہ کوئی نکالی جائے
جن میں تھیں کچھ بشارتیں خواب تو وہ تلف ہوئے

یہ بھی کیا کم ہے کہ اپنی جنگ میں تنہا نہیں
کارزارِ زندگی میں میرا اک لشکر تو ہے

راہِ دشوار کی جو دھول نہیں ہو سکتے
ان کے ہاتھوں میں کبھی پھول نہیں ہو سکتے

حاکمِ شہر کے اطراف وہ پہرہ ہے کہ اب
شہر کے دکھ اسے موصول نہیں ہو سکتے

دینے والے کی حقیقت پہ ہے سب کچھ موقوف
مانگنے والے کی حاجت نہیں دیکھی جاتی

گھر ڈوب گیا اور انہیں آواز نہیں دی
حالانکہ مرے سلسلے اس پار بہت تھے

ہم اہلِ حاجت وارباب احتیاج تو کیا
فقیہہ شہر بھی اب حُبِ زر پہ زندہ ہیں

اس پھول میں اک بھول کھلا میرے لیے بھی
خوشبو کی کہانی میں مرا نام تو آیا

مرے قبیلے میں نکلے سبھی فرد وختنی
نہ کوئی وعدہ، نہ کوئی اصول باقی ہے

ایک پل میں گزر گئی وہ شام
صبح سے انتظار تھا جس کا

رستے میں مل گیا تو شریکِ سفر نہ جان
جو چھاؤں مہرباں ہو اسے اپنا گھر نہ جان

دکھ سے بھری ہے ایک میسر تو ہے حیات
اس رنج کے سفر کو بھی بارِ دگر نہ جان

گھنے درختوں کے گرنے پہ ماسوائے ہوا
عذابِ دَر بدری اور کون سہتا ہے

مرے بدن کو نمی کھا گئی ہے اشکوں کی
بھری بہار میں کیسا مکان ڈھتا ہے

ہوا کا زور کسی شب تو جا کے ٹوٹے گا
بچا کے رکھنا ہے کوئی دیا مکاں کے لیے

سفر کے باب میں کتنے عجیب لوگ ہیں ہم
کہاں کا قصد کیا، چل پڑے کہاں کے لیے

ہوا پہ لکھا ہوا حرف ہی سہی دُنیا
تمام رنگ اسی نقشِ رائیگاں کے لیے

پھوند کہاں تک لگیں اب خرقۂ غم کو!
اس پرسشِ رسوائی کو تبدیل کیا جائے

اک چادرِ دلداری ہے اس طرح سے مجھ پر
تن ہے کہ جو الجھا ہے۔ سر ہے کہ کھلا جائے

اے گردشِ دوراں ترے احسان بہت ہیں
کچھ دیر ترے ساتھ بھی اب رقص کیا جائے

جیسے کوئی عقب سے بلاتا ہے بار بار
بچپن سے اک عجیب سراب صدا میں ہوں

"انکار" میں غزلیں بھی اور نظمیں بھی، سچائی کا جوہر اپنے مختلف مظاہر میں، دونوں طرف برابر روشن ہے۔ جذبے کا الاؤ بھی۔ اظہار کی خوشبو اور چاندنی کا رقص بھی، مجھے اس کی غزل زیادہ مرغوب معلوم ہوئی۔ میرے نزدیک اس "شہرِ نوا" کا مرکزی آہنگ، بلکہ "چنبیلی چوک" غزل ہی ہے۔ تقابل مقصود نہیں مگر غزل گاڑھی اور گھنی ہے۔ نظم کھلی اور کھلیاتی۔

ہر گلِ را رنگ و بوئے دیگرے ——— غزل آدم گری کرتی ہے اور نظم شیشہ گری ——— یہ وہی فرق ہوا جو نغمہ خوانی اور جہاز رانی میں ہے ——— "انکار" کی ایک انفرادیت یہ ہے کہ خواہ ——— کسی شاخِ سبز کی اوڑھنی پر ہلکی سی گوٹ لگی ہو ——— یا ——— دیارِ غزال چشماں و گل عذاراں کی بشارتیں ہوں"

"یورپ کے کوہستانوں میں برف پگھل رہی ہو" ——— یا ——— "کسی شہزادی کا المیہ" ——— یا بے شک کہیں "انقلاب کی آگ بھڑک رہی ہو ——— الغرض جو بھی کچھ ہو، بس اسی قدر ہوتا ہے کہ شاعری کے لیے بھی وہاں بہت وافر جگہ موجود رہتی ہے۔ پاکستان کے ——— "فیوڈل لینڈ لارڈوں" ——— والی بات نہیں ——— کہ ملک بیشک ختم ہو جائے مگر "جاگیر" ختم نہ ہو۔ پروین شاکر ایک انقلابی شاعرہ ہے مگر اس کے شعر میں نعرے کا واویلا ——— جیسے سروں ہی میں رہتا ہے۔ اس کے ہاں "رباب" کا انقلاب ہے، "ڈھول کا انقلاب" نہیں ہے۔ اس شہر میں جمہوریت تو آتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں آٹے کا تھیلا بھی ہوتا ہے، نئی دنیا کے لیے بشارتیں اور سماجی معاشی عدل مع روٹی، کپڑا اور مکان وغیرہ کے، مگر تھیلا ریشمی جارجٹ کا ہوتا ——— پروین شاکر کا ایک شعر ہے ؎

تجھ کو بھی نہ مل سکی مکمل!
میں اتنے دکھوں میں بٹ گئی ہوں

پروین شاکر کوئی سطحی شاعرہ نہیں کہ اس کے فن و فکر کے مختلف زاویوں کا مکمل جائزہ آسانی سے گرفت میں آسکے۔ تاہم تین دھارے جن کو آشوبِ ذات، آشوبِ کائنات اور آشوبِ وطن کے حوالوں سے شناخت کیا جا سکتا ہے۔ پہلو بہ پہلو بہتے دکھائی دیتے ہیں۔ آشوبِ ذات کی نسبت سے نسائی حیات و محسوسات کے جو سائے "انکار" میں جھلکتے ہیں اور عورت کی آواز جو کرب اس کی اشعار میں تڑپا ہے، وہ ایسی سندرتا، جرأت اور گمبھیرتا کے ساتھ کہیں کہیں ہی دیکھنے اور سننے میں آیا ہے۔ پروین شاکر اردو شاعری

کی غالباً وہ پہلی منجھی شاعرہ ہے جو غزل میں "اردو غزل کے عاشقوں" جیسے شعر کہتی ہے کہ صداقت اس کے فن کا بنیادی جوہر (بلکہ آدرش) ہے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ اپنے ایک شعر میں پروین نے یہ تک بتا دیا کہ وہ اب اپنی عمر کے ——— "کس حصے" میں ہے ——— یہ بات کوئی غیر معمولی بہادر خاتون ہی کہہ سکتی ہے۔

اس نے ایک نظم میں ——— انسانوں کے روپ میں بھیڑیوں کا ذکر کیا ہے، جن کے غول، اس کے اطراف منڈلاتے رہتے ہیں۔ اس کی زندگی جتنی حقیقی سرگزشت خود اس کے شعروں سے نچوڑی جا سکتی ہے۔ عہدِ حاضر کے بہت کم شعرا کے دواوین میں ملے گی۔ شاید اسی لیے اس نے منظومات پر تاریخیں نہیں دیں۔ اس کے ہاں اداس نظمیں بھی ہیں ——— اور شریر نظمیں بھی ہیں ——— اداس نظمیں ——— اداس تو بہت کرتی ہیں۔ مگر آرزوئے حیات کی چنگاری کو بجھنے نہیں دیتیں، اگرچہ زندگی ہمیشہ اس کے لیے چھوٹی چادر رہی ہے ؎

ممکن ہے باغ کو بھی نکلتی ہو کوئی راہ
اس شہرِ بے شجر کو بہت بے ثمر نہ جان

اور

زمینِ دل یونہی شاداب تو نہیں اے دوست
قریب میں کوئی دریا ضرور بہتا ہے

"شریر نظمیں" خاصی شریر اور چنچل ہیں۔ ان کے بارے میں یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ احرام پہن کر لکھی گئی ہیں مگر فن کی خوب صورت رفوگری کے طلسم سے ان میں وہ بات بھی نہیں کہ شعر پڑھتے ہی آدمی گنہگار ہو جائے۔

؎ میں تو تا عمر ترے شہر میں رہنا چاہوں
کوئی آکر ——— مرا اسبابِ سفر تو کھولے

آفاقیت کے سفر کے بغیر کوئی شاعری مشتری، مریخ کے مدار میں داخل نہیں ہو سکتی اور یہ سفر اس کے ہاں نگاہ کی ایسی بے تابی اور لفظ کی دل نوازی کے ساتھ موجود ہے کہ خاندان اور نسل تو کیا معنی ـــــ کہیں کہیں وہ قوم اور ملک کے "زندانوں" سے بھی نکل جاتی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ کراچی کے سانحات پر اس درد سے روتی ہے کہ جیسے اقبال غرناطہ پر رویا تھا۔ اس کی نظم ـــــ "سندھی کی ایک بیٹی کا اپنے رسول سے سوال" ـــــ پاکستان کے ـــــ "سانحاتی ادب" میں کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی۔ وطن کی محبت کا سوتا اس کی زمینِ شعر سے بار بار پھوٹتا ہے اور دیکھئے کہ اخلاص کی کیسی بے ساختہ وارفتگی کے ساتھ ؎ زندگی کی دھوپ میں اس سر پہ اک چادر تو ہے

لاکھ دیواریں شکستہ ہیں پر اپنا گھر تو ہے
جو بھی آئے گا یہاں دستک تو دے کر آئے گا
اِک درِ دیوار تو ہے، اک حصارِ در تو ہے

ملک پر مارشل لاء کا تسلط پروین شاکر کی روح کا سب سے بڑا گھاؤ معلوم ہوتا ہے۔ اس کتاب کی اگر سب نہیں تو بیشتر نظمیں مارشل لاء کی طویل رات میں لکھی گئی ہیں۔ یہ گویا مارشل لاء کے خلاف جمہوریت کے ایک "لانگ مارچ" کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مارشل لاء کا اگر کوئی فائدہ ہوا تو یہی کہ پروین نے قلم کو ـــــ "کلاشنکوف" بنا لیا اور وہ اردو شاعری کی "سیفو" بنتے بنتے اردو شاعری کی "رانی جھانسی" بن گئی اور میں سمجھتا ہوں کہ اس زمانے کے ایک مقبول عوامی گیت کا یہ مصرعہ ہم پروین شاکر کے لیے بھی دہرا سکتے ہیں کہ

؎ خوب لڑی مردانی ـــــ رانی جھانسی کی

اس کی گہری اداسی بھی مارشل لاء کی پیداوار ہے۔ میرے لیے یہ بات ایک انکشاف تھی کہ حکومت نے اس کو ملک سے باہر جانے سے روکا تھا۔ یہ تو اس کی ہمت تھی کہ وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے، کسی نہ کسی، غیر ملکی مشاعروں میں پہنچتی رہی۔

ایک سرکاری ملازم کی حیثیت سے بھی، اپنی مجبوری کے احساس پر وہ بہت آزردہ دکھائی دیتی ہے "انکار" کی مصنفہ ـــــ سرکاری ٹیلی وژن کے پروگراموں سے انکار تو نہ کر سکی۔ مگر وہ سرکاری جبر کے خلاف نظمیں لکھتی رہی اور جہاں جہاں اسے بولنے کا موقع ملا وہ برملا بغاوت بولتی ہی رہی ـــــ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے جن اہلِ قلم نے ـــــ آمریت کے کوڑے کے کس بل نکالنے میں مجاہدانہ جوش و جذبے کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان میں پروین کا نام بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ چاہتی تو، باہر جا کر جرمنی کی جنگ جاپان سے بھی لڑ سکتی تھی، مگر اس نے جمہوریت کا معرکہ "شالن گراڈ" اپنے شہروں کے گلی کوچوں ہی میں رہ کر لڑنے کو ترجیح دی۔

پروین کی "مارشل لائی نظموں" ـــــ میں سے ایک نظم مجھے آج کی صورتِ حال میں خصوصی طور پر یاد آ گئی۔ میں یہاں اس کی صرف ایک "لائن" ہی نقل کر رہا ہوں کہ نظم کا سارا "متن" سمٹ کر اسی ایک "لائن" میں آ گیا ہے۔ اور وہ یہ کہ:

"اے خدا!
میرے پیارے سپاہی کو سرحد کا رستہ دکھا"

یہ نظم میرے ذہن میں شاید اس لیے شدت کے ساتھ اُبھر آئی کہ اب ہم خود اپنے پیارے سپاہی کو سرحدوں سے ہٹا کر کراچی اور حیدرآباد کے شہروں میں ریت کی بوریوں کے دھندے بنوانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ اردو شاعری کی "رانی آف جھانسی" ـــــ جس دلیری سے آمریت کو للکارتی رہی تھی، اب جمہوریت کے شگافوں کی نشاندہی بھی کرتی رہے گی اور اپنے اسی مخصوص لہجے میں کہ:

؎ ایک سیلاب سے ٹوٹا ہے ابھی ظلم کا بند
ایک طوفان کو ابھی زیرِ زمیں رکھنا ہے

اور بی بی!

اب خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سُن لے۔

پروین! ——— تمہیں یہ "نثری نظم" کا "دھماکہ" کرنے کی کیا ضرورت تھی ——— تجربات کا دریچہ بے شک ہمیشہ کھلا رہنا چاہیے۔ مگر یہاں تو تجربہ کا "درہ خیبر" کھل گیا۔ یہ تو شاعری کی "ہارس ٹریڈنگ" ہوئی۔ جس کو مولانا شبلی نعمانی نے "خر بازاری" لکھا تھا۔

آپ نے دیکھا ہوگا۔ کہ جب کسی کالج اپنے طلبار میں دلچسپی نہیں رہتی تو اس کالج کو یونیورسٹی بنا دیا جاتا ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ جس شاعر کو شاعری میں دلچسپی باقی نہیں رہتی، وہ نثری نظم لکھنے لگ جاتا ہے۔ شاعروں کی بنیادی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو شاعری سے چمٹ جاتے ہیں، دوسرے وہ جو شاعری کو اوپر اٹھا لیتے ہیں۔ آپ تو گرتی شاعری کو تھام لینے والی شاعرہ ہیں۔ اگر آبشارِ نیاگرہ سے بھی قطرہ قطرہ شبنم ہی رسنے لگی تو شاعری میں صرف "ہارس ٹریڈنگ" ہی باقی رہ جائے گی۔

ایک گلہ ذرا ذاتی نوعیت کا ہے میں اس کتاب میں وہ نظم ڈھونڈھتا رہا جو آپ نے بریگیڈیر صدیق سالک کی رحلت پر لکھی تھی۔؟

تنقید کا خمار بھی اقتدار کے نشے سے کم نہیں ہوتا۔ میں یہ چند باتیں شاید اسی "خمار" میں کہہ گیا۔ نقادوں نے قلوپطرہ کو بھی نہیں بخشا تھا۔ جب کہا کہ اگر اس بی بی کی ناک قدرے چھوٹی ہوتی تو تاریخِ عالم کا چہرہ ہی بدل جاتا۔ بہر حال واقعہ یہ ہے کہ "انکار" ہر معیارِ شعری کے حوالے سے نہ صرف عصری شاعری کا ایک درخشندہ و نمائندہ مجموعہ ہے بلکہ اس سے شاعری کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا ہے اور اس اعتبار سے تو یہ ایک منفرد کتاب ہے کہ بہت لوگ اس کتاب کو بہت پسند کریں گے۔ مگر بہت کم لوگ خوش ہوں گے۔ کیونکہ اس کے ہاں ہمارے بعض زنگ آلودہ معاشرتی، معاشی رویوں پر تنقید بھی موجود ہے اور ہم بحیثیت قوم تنقید سے سدھرنے کی بجائے تعریف سے تباہ ہونے کو پسند کرتے ہیں۔ مگر شاید اسی حوالے سے بعض طبقوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری بھی ہو گیا ہے۔ مثلاً ارباب حکومت کے لیے تاکہ وہ بیکریڑیوں

کی ترقی و تقرری کے معاملے میں اعلیٰ انسانی قدروں کو ملحوظ رکھا کریں ——— فوج کے جوانوں کو بھی اس کا ترجمہ پڑھوانا سود مند ہوگا۔ تاکہ وہ یہ سمجھ سکیں کہ ——— قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے؟ ——— اور اس کی عورتوں کے لیے تو یہ ایک خصوصی ہدایت نامہ ہی نہیں بلکہ ایک "منشورِ حریت" کی حیثیت رکھتی ہے کہ اس کے اشعار میں ایک عورت ہی کا دل تو دھڑک رہا ہے۔ اور میں صدقِ دل سے یہ سمجھتا ہوں کہ نہایت خوب صورت اور نہایت خیال انگیز شاعری کی یہ کتاب ہر دلہن کے جہیز میں شامل ہونی چاہیے کیونکہ ——— "بونگ تو گواچ بھی جاتا ہے مگر لفظ کبھی نہیں گواچتا"

(۱۹ جولائی ۱۹۹۰ کو اسلام آباد میں "انکار" کی تعارفی تقریب میں پڑھا گیا)

اردو شاعری کی شاہراہِ ریشم

جہلم کے لوگ اپنے دریا کی طرح دل دریا ہیں یہی دیکھیے کہ انہوں نے مجھے یعنی اپنے گھر کے ہی ایک 'مرغے' کو اتنی اہم ادبی تقریب کی کرسی صدارت پر بٹھا دیا ہے۔ سچ ہے کہ بڑوں کی موت، چھوٹوں کو بڑا بنا دیتی ہے۔ اب تک 'صدارتی کرسیوں' سے ہماری اتنی بے تکلفی ہو چکی ہے کہ صدارت کرتے کرتے اونگھ لیتے ہیں۔ لیکن آج کی کرسی نے تو ہماری چولیں ہلا دی ہیں۔ یعنی جذبات میں وہ ہل چل ہے کہ:

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی

بحران ظاہر ہے یہ کرسی مجھے اپنے گھر والوں نے دی ہے۔ اپنے کھیت کے گیہوں کی طرح، اس کرسی کا ذائقہ ہی اور ہے۔ اس میں اقتدار ہوتا ہے خمار نہیں ہوتا۔ یہ ان کرسیوں میں سے نہیں ہے کہ صدر اوپر بلتار ہے اور کرسی نیچے ہلتی رہے۔ یہ کرسی خود آتی ہے، لائی نہیں جاتی۔ سچ کہتا ہوں کہ مجھے بجز خاموشی، اظہار سپاس کی کوئی سبیل نہیں سوجھتی۔ مگر مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ جہلم کے لوگ سپاس کو نہیں، اخلاص کو پسند کرتے ہیں۔

"نوائے شب" ——— مختار علی خان پرتو روہیلہ کا تیسرا شعری مجموعہ ہے اور یہاں کے بارے میں ہمارا دوسرا مضمون ہے۔ گویا ہم ان کے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں۔ "پیچھے یا آگے چلنے" کی بات پر خیال آیا۔ کہ اکثر اہلِ قلم اپنی کتاب کے چھپنے سے پہلے گمنام ہوتے ہیں، یا موت و حیات کے برزخ میں ہوتے ہیں۔ مگر کتاب کے چھپتے ہی ادبی موت مر جاتے ہیں۔ پرتو کا دوسرا مجموعہ ——— "دوہوں" ——— پر مشتمل تھا۔ ان کے دوہوں کی سندرتا اور

موہنی کے تذکرے کا یہ محل نہیں کہ انہوں نے فن کی کیسی جادوگری سے اردو شاعری کے ماتھے پر ہندی کی بندی سے کس طرح ہماری شاعری کے دیوں میں چراغاں کر کے دیوالی کا سماں پیدا کیا ہے۔ یہاں تو صرف اتنا کہنا مقصود تھا کہ پرتو روہیلہ نے اپنی تخلیقی سفر میں سب سے پہلے ماں کے دودھ کا حق ادا کیا۔ اب وہ "نوائے شب" کی صورت میں، اہل نظر کے لیے۔ اپنی نظموں، غزلوں کی سوغات لائے ہیں اور دونوں کتابوں کے بعد نہ صرف یہ کہ زندہ نکلے ہیں بلکہ ماشاءاللہ، اس شان سے ابھرے ہیں کہ اب زندگی ان کے پیچھے پیچھے چل رہی ہے ——— وہ اس لیے کہ پرتو انسانی قدروں کو گزوں سے نہیں ناپتا اور نہ وہ کوئی ایسا شخص ہے جو موسموں کے ساتھ بدل جاتا ہو۔ وہ تو ان لوگوں میں سے ہے جن کے ساتھ موسم بدل جاتے ہیں۔

یہ جہلم کا حق اور قرض تھا کہ "نوائے شب" کی پہلی تقریب اس شہر میں ہوتی۔ ایک تو اس لیے کہ یہ خطہ جناب روہیلہ کے روہیل کھنڈ سے اتنی گونہ عسکری نسبت رکھتا ہے کہ ہم روہیل کھنڈ کو پاکستان کا جہلم اور جہلم کو ہندوستان کا روہیل کھنڈ کہہ سکتے ہیں ——— پھر کتاب کے سرنامے ——— "نوائے شب" کے حوالے سے بھی، اگر رات کے وقت کسی شہر کو آواز دینے کی ضرورت تھی تو وہ یہی شہر ہو سکتا تھا۔ کہ

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے!

پرتو صاحب اپنے شعروں میں جہلم کا تذکرہ بھی کرتے رہتے ہیں، محبت کا یہ قرض بھی ہم پر واجب تھا جبکہ اہل جہلم کو اپنی اس روایت پر ناز ہے کہ اگر کوئی ہم سے ایک انچ آگے بڑھ کر ملے تو چھ گز آگے دوڑ کر اس کو سینے سے لگا لیتے ہیں۔ ہماری مروت تو بین الاقوامی سطح پر مستند مانی جاتی ہے۔ ۱۹۱۴ء کے "لام" میں ایک خوش اخلاق انگریز رنگروٹنگ افسر ہمارے ضلع کے بہت سے جوانوں کو فوج میں بھرتی کر کے فرانس لے گیا تو پھر فرانس سے ان کے ——— "یور الیشین بچے" ہی جوان ہو کر واپس آئے تھے وہ بھی

خال خال ۔ خیر یہ تو ایک "جملہ بچگانہ" درمیان میں آگیا ۔ کہنا مجھے یہ تو صاحب سے یہ تھا کہ اگر اسی طرح آپ کی محبت دریائے جہلم کی لہروں میں گھلی ملی رہی، تو میں یہاں سے فکر و نظر کی وہ چاندنی ابھرتی دیکھتا ہوں جو زندگی کے ویرانوں کو دور دور تک روشن کر دے گی ۔ سراج الدین ظفر کے بعد آج بھی چند مشعلیں ـــــــ استاد جوگی ۔ سید امداد حمدانی، تنویر سپرا، عزیز دہلوی، جاوید مختار، حسین کوثر، طالب قریشی، مسرت ہاشمی اور ان کے جواں خیال معاصرین کے ہاتھوں میں بلند ہیں ۔ اور کیوں نہ ہوں کہ

صبح ہوگی ان پہاڑوں سے طلوع
یہ زمیں شیروں کا مسکن ہے ابھی

"نوائے شب" کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کرنے کے لیے مناسب ہو گا کہ میں یہاں چند "اقتباسات" پیش کرتا چلوں پہلے غزل کا انداز ملاحظہ ہو :۔

ڈھلتی رات کہاں جاؤ گے ۔ بتلاؤ بابا
بھور سمے تک اس کٹیا میں سو جاؤ بابا
لمحے لمحے جینے والے کل کو کیا جانیں
میری مانو تو آج یہیں رہ جاؤ بابا

گہری رات، چمکتے جگنو، بکھری یادیں ٹوٹے سپنے
سناٹوں کی گونجتی چیخیں، تنہائی کے ہانپتے سائے
بھیگی بھیگی ۔ پیلی سڑکیں، کالے کھمبے، کاہی منڈیریں
پیلے بلبوں پر پروانے بے حس روپ وفا کا لائے

رات کے راکھی ماندے ماندے، موت کی چوکی اُجڑی اُجڑی
سونے کی تھالی میلی میلی، روشن چہرے دھبے دھبے

گرتا پتہ پاؤں کی آہٹ، دور کی ڈھولک دل کی دھڑکن
چھاتی میں اِک سانس کی سولی، کانوں میں آواز کے برچھے

خدا وہ دن نہ دکھائے یہ آخری دیوار
بنانے والوں کے ہاتھوں سے ٹوٹتی دیکھوں
طلوعِ صبح کی امید ہے مجھے پھر بھی
اب ایسے حال میں یہ میری سادگی دیکھو

سازشوں کی تند موجیں تھیں میرا ہلکا بدن
بارہا ڈوبا بھنور میں، بارہا ابھرا بدن
سخت جانی تھی مری یا میں تن بے روح تھا
جی رہا ہوں آج بھی گو کٹ گیا آدھا بدن
پانچ گبھرو بھائیوں کی اک اکیلی تھی بہن
کس عدالت میں کہوں کس نے میرا نوچا بدن

تیری آواز کو وہ حسنِ رسائی دوں گا
میں تیرے گیت کی تانوں میں سنائی دوں گا

میں جو کہ حق و امن کے شیدائیوں میں تھا
مارا گیا تو شہر کے بلوائیوں میں تھا
گاڑا ہے جس نے وہ بھی میرے بھائیوں میں ہے
مارا ہے جس نے وہ بھی میرے بھائیوں میں تھا

مجھ کو اے مالک بلانے کی صدا کب آئے گی
تجھ سے آکر کب ملوں گا میں، قضا کب آئے گی

کب تلک جھلسوں گا میں ۔ اس چلچلاتی دھوپ میں
جانے اس بے رد سورج پر گھٹا کب آئے گی
دل کی اندھی دھڑکنوں کو کب ملے گی روشنی
میرے نابینا خیالوں پر جلا کب آئے گی

اک گائے بندھی ہے کھونٹے سے، قصاب اسے ہولائے ہے
کبھی داس پکڑ کے کھینچے ہے، کبھی چھریوں کو کھنکھنائے ہے

یہ دل کا درد گھٹے گا کہ کچھ سوا ہو گا
نہ جانے کیسۂ فردا میں کیا بھرا ہو گا
اب جو خورشید بھی ابھرے تو اندھیرا ہو گا
رات نے ایسی اجاڑی ہے بصارت میری
میرے آنگن میں بھی پھولے نہ مرے خواب کبھی
میرے دامن پہ بھی برسی نہ بشارت میری
میرا اپنا کوئی بیٹا کسی لائق نہ ہوا
مل گئی غیر کو افسوس وراثت میری

اب نظمیہ کا انداز ملاحظہ ہو:۔

رفیق ناآشنا

یہ لڑکی جو اس کار کے ایک گوشے میں بیٹھی ہوئی
اوپری اور اچٹتی نگاہوں سے شیشوں کی دیوار کے پار
اپنے مانوس رنگین ماحول کو تک رہی ہے

نہ جانے خیابان ہستی کے کس موڑ پر
اس کا احساس جاگے اور اس کو یہ معلوم ہو

کہ اس سے بس ایک سانس کے فاصلے پر
اک انسان بیٹھا ہے
جس کی نظر میں بڑی دور تک
کھردری، پیچ در پیچ اندھیری سڑک ہے۔

پن کشن

مرے "پن کشن" میں بہت سی پنیں ہیں
اور اکثر پنیں اس میں ایسی ہیں جو
دور انجانے ملکوں سے آئے خطوں سے نکالی گئی ہیں
مگر اس گھڑی ایک ظاہر حقیقت کی صورت مرے "پن کشن" میں لگی ہیں
اگر "پن کشن" کی ہر اک "پن" یہ سوچے کہ میں تو فلاں دیس کی ہوں
فلاں دیس نے میرا لوہا جنا تھا
فلاں دیس نے میری صورت گھڑی تھی
تو یہ سوچنا "پن کشن" کی حقیقت کو خطرے میں ڈالے نہ ڈالے
پنوں کو یقیناً جڑوں سے ہلا دے گا
اور پھر یہ ساری "پنیں"
بے سکت
بے جہت
بے ہنر
یونہی رکتی پھریں گی!

کیا ان نظموں میں آپ نے ـــــ نظم آزاد ـــــ کا ایک نیا لہجہ انوکھا ذائقہ محسوس نہیں کیا؟ یہ نظم معریٰ ہماری ذوقی نغمگی کی وراثت سے معریٰ نہیں ہے۔ یہ نظمیں ہمارے خانوادۂ سخن کے ان سجیلے نوجوانوں میں سے ہیں جو کانوں میں چاندی سونے کی مندریاں ڈال

لیتے ہیں۔ اب آیئے ایک ظائرانہ نگاہ سے نظموں کے عنوانات دیکھتے چلیں تاکہ زندگی کے اس "پینوراما" کا کچھ اندازہ ہوسکے جو اس شاعر کی نگاہ میں ہے۔ مثلاً ——— "اے مری چارہ گر" ——— "منزلِ نو" ——— "شکستِ فصیلِ بدن" ——— "وارستگی" "اے نادان لڑکی" ——— "سقوطِ شان" ——— "دوخوف" ——— "پن کشن" ——— "حکایت شب" ——— "دوسری شادی" ——— "عملِ مثبت" ——— "کبوتر کا نوحہ" ——— "کفشِ خاک آلود" ——— "نسلوں کا سبق" ——— "لغزشِ دست" ——— "نہ معلوم وہ کون تھی" ——— "مشینی دور میں انسان کا نوحہ" ——— "زینہ چوب پر ایک برہنہ لڑکی"۔

کیا یہ سب دلوں میں کھلنے والے دریچے نہیں ہیں؟ میرا احساس یہ ہے کہ ——— "نوائے شب" ——— اردو کی جدید شاعری میں ایک ایسا منفرد لہجہ لے کر آئی ہے جو ادراک کو ایک وسیع اور گہرا کرتا ہے۔ غزل کے سانچے کو اس نے دوہے کی نرمی والا ناریل کا دودھ دیا ہے۔ اس کے الفاظ عموماً اونچا نہیں بولتے۔ یہ شاعر جانتا ہے کہ اس کو کیا کہنا ہے۔ بات کہاں سے شروع کرنی ہے اور کہاں ختم کرنی ہے۔ وہ اپنے ذہنی سفر کے لیے ضرورت سے زیادہ لمبا راستہ اختیار نہیں کرتا۔ اس کا طنز اکہرا تو نہیں، مگر اس پر زیادہ چربی نہیں ہوتی۔ وہ جو یہ کہا جاتا ہے کہ ادب میں تھوڑی سی شرارت بلکہ شیطنت بھی ہونی چاہیئے، یہ تو لطیف چاشنی بھی اس کے پاس موجود ہے۔ یہ شخص پانچ وقت کا نمازی بتایا جاتا ہے۔ گھر میں کسی کی مجال نہیں کہ ان کے وضو کے لوٹے سے بے تکلفی برت سکے۔ جلسوں میں ہم نے کئی مرتبہ دیکھا کہ ——— عین وزیروں کے سامنے اگر آگیا وقتِ نماز ——— تو روہیلہ صاحب وزیر کو تنہا چھوڑ کر نماز ادا کرنے چلے گئے۔ مگر شاعری میں دلربائی نے پارسائی کا راستہ روک رکھا ہے۔ ان کے ہاتھ خدا کے سامنے بندھے رہتے ہیں اور آنکھیں بتوں کے چہرے پر لگی رہتی ہیں۔ ایمان اور رومان ——— دونوں کو دو گھوڑے والی بگھی میں جوت رکھا ہے۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ ایک اچھے شاعر کی

ایک خصوصیت یہ بھی تو ہے کہ وہ ہمارے لیے وہ کچھ کرتا ہے جو ہم خود نہیں کرسکتے۔ پرتو کی شاعرانہ دلربائی کی بہت سی ادائیں ہیں۔ جو ادائیں، ان کی سدا بہار مسکراہٹ کے علاوہ مجھے بطورِ خاص پسند ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان کی کتاب ——— کتاب ہوتی ہے "نصاب" نہیں ہوتی۔ اور یہ کہ پرتو روہیلہ جہاں سقراط بقراط کے ہمراہ ہوائی جہاز پر اڑے اڑے پھرتے ہیں وہاں تانگوں۔ رکشوں، بسوں میں اپنے نورخانوں طورخانوں کے ساتھ بھی دھکے کھالیتے ہیں۔ اور میرے نزدیک ذہن اور جسم کی اسی "تپسیا" نے تو پرتو کو شعراء کی اس محدود صف میں لا کھڑا کیا ہے جن کا شعر دماغ اور دل دونوں پر دستک دیتا ہے۔ پرتو روہیلہ نے اگرچہ پابند شاعری میں بھی اپنی گہرائی کے "گراف" اور اسٹائل کی "امپورٹ ایکسپورٹ" کو بحال رکھا ہے۔ مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ نظمِ آزاد کو اس نے نئی فنی بلندیوں اور معنوی پہنائوں سے آشنا کیا ہے پرتو کی شاعری کی تہذیبی سطح اس لیے بھی بلند ہے کہ وہ اپنے شعر میں عورت کے مقام کو بلند رکھتا ہے۔ محبت، ضرورت، حسد، افادیت وغیرہ اعلیٰ ادب کی تخلیق میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ پرتو روہیلہ ان رکاوٹوں کو اسی طرح توڑ کر گزر جاتا ہے جس طرح اس کے جدِ امجد حافظ رحمت خان روہیلہ مغلوں کے محاصروں کو توڑ کر نکل جاتے تھے۔

شاعر بے شک قاری کے شعور کی سڑک کو چاہے جتنا کشادہ اور آسان کرتا رہے، قاری بہرحال اس کے فکر و فن کا تجزیہ اپنی صلاحیت اور تعصبات کے مطابق ہی کرے گا۔ یوں بھی تنقید کرنا آسان ہے اور درست ہونا مشکل ہے ——— تو جناب والا! ——— میرے نزدیک پرتو روہیلہ کی شاعری خوابوں اور تمناؤں کے بور سے بہت لدی پھندی ہے۔ اس نے اپنے شعر کی ایک شناخت پیدا کرلی ہے۔ جو یہ ہے کہ وہ شعر عاشق کے دل سے اور مزدور کے ہاتھ سے لکھتا ہے ——— وہ خدا کی طرف جاتا تو بہت ہے مگر شہر کی تنگ گلیوں میں سے ہو کر جاتا ہے جیسے خدا کو اس کی مخلوق کی حالتِ زار کی رپورٹ دینے جارہا ہو۔ سفر البتہ موٹر میں کرتا ہے۔ اس کی آواز اس خاموشی کی نفی کرتی ہے جس

میں خوف اور بغاوت کا جذبہ پرورش پاتا ہے۔ پیش کش کی سطح اور نہج ایسی ہے کہ اس کی شاعری داناؤں اور احمقوں دونوں کے لیے سود مند ہے۔ وہ ادب میں کولھو کے بیل کی طرح چلنے کا قائل نہیں نہ مبالغے کی پتنگ بازی کا۔ اظہار کا اسلوب بھی اس نے خود پیدا کیا ہے۔ وہ محکمہ انکم ٹیکس کا ایک اعلیٰ افسر ہے مگر اس کی تحریر میں انکم ٹیکس کے ضابطوں کی پیچیدگی نہیں پائی جاتی۔ فرق ضروری بھی تھا۔ مختار علی خان، کمشنر انکم ٹیکس کو ——— کچھ لینا ہوتا ہے مگر شاعر پرتو روہیلہ کو کچھ دینا ہوتا ہے۔ وہ افراد کو کہیں کہیں کبیدہ ضرور کر دیتا ہے مگر انسانیت کو خود کشی سے محفوظ رکھتا ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اس نے اپنے فن کو جو پہلی ڈیوٹی سونپ رکھی ہے، وہ انسانیت کا تحفظ کرنا ہے چنانچہ اس کی شاعری اتنا سچ بولتی ہے کہ اس میں اس کی اپنی خامیاں بھی بولنے لگ گئی ہیں ——— وہ ایک ٹھیٹھ محب الوطن ہے مگر حب الوطنی کے ایک ایسے جذبے کا داعی ہے کہ جس سے ——— ہمارے وزیر خزانہ کے بجٹ کی طرح ملک فائدے اور لوگ خسارے میں رہتے ہیں۔ محبت اور ہمدردی اس کے فن کے دو امتیازی پھول ہیں۔ وہ کسی سے نفرت نہیں کرتے۔ ان کی محبت انسانوں سے لے کر بندروں تک پھیلی ہوئی ہے۔ پرتو کی شاعری اگر ہمارا ہم دریا ہوتی تو اس کے گھاٹ پر کوئی گھات لگا کر نہ بیٹھ سکتا شیر اور بکری اس پر اکٹھے پانی پی سکتے۔ جہاں آج کل صرف شیر ہی پانی پی رہے ہیں۔ اگرچہ یہ شیر بھی پانی پی پی کر بکرے ہی بنے جا رہے ہیں ——— اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ بدصورتی کو وہ زیور میں چھپانے کی کوشش نہیں کرتا۔ نہ اپنے دیوان کو پارلیمنٹ کا ایوان بننے دیتا ہے۔ وہ اس بات کو سمجھتا ہے کہ بحث لوگوں کو عموماً حقیقت سے دور لے جاتی ہے

زندگی کی جنگ میں اس نے سب سے بڑا مورچہ جبر و جہالت کے خلاف قائم کر رکھا ہے۔ اس کی پہلی اور سلسل "کومٹمنٹ" انسان سے ہے جس کے کرب نے اس کی روح کو بے چین کر رکھا ہے۔ "نوائے شب" کی ۸۸ غزلوں نظموں میں سے چوڑاہ ——— بیرہ کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ میرے نزدیک یہ نظمیں ہمارے اجتماعی خوابوں

کا نوحہ ہیں۔ مجھے ان میں وہ آگ نظر آتی ہے جس کے شعلوں میں ہمارے شہر، گلیاں، گھر اور کھیت جل رہے ہیں۔ یہ شاعر انصاف اور سچائی کی چتا پر ننگے پاؤں چل رہا ہے۔ اور جیالے پن کی یہی وہ چھب ہے جس نے "نوائے شب" کے اشعار کو ایک ایسا آئینہ بنا دیا ہے جس میں ہم اپنی ذات کے تینوں روپ دیکھ سکتے ہیں ——— وہ جو ہم تھے وہ جو ہم ہیں ——— اور وہ جو ہم ہوں گے۔ وہ نظمیں بے شک عنوانات کے تحت لکھتے ہیں مگر وہ عنوانات کے ماتحت نہیں رہتے۔ جس طرح ہم پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کی قرار داد مقاصد کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل آئے ہیں، اس طرح پرتو صاحب عموماً اپنے عنوانات کو پیچھے چھوڑ کر ادھر اُدھر پھیل جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ان کے ہاں سبق نہیں ہوتا تاثر ہوتا ہے۔ مقدمے کی "فائل" نہیں ہوتی، فیصلہ ہوتا ہے۔ تاثر کے باب میں ان کی نظم "دوسری شادی" کے بارے میں یہ عرض ہے کہ اس سے مطالعہ سے جہاں میری طبیعت تیسری شادی پر للچا رہی ہے۔ وہاں میرے ایک نوجوان دوست پہلی شادی سے بھی تائب ہو گئے ہیں۔

پرتو روہیلہ محبت کے لیے لکھتے ہیں "مارکیٹ" کے لیے نہیں لکھتے۔ لیکن کہیں کہیں اس پٹھان کا غصہ خراج لیے بغیر نہیں مانتا۔ تو وہ وہاں اپنی "کلاؔ" ——— کو ——— "کلاشنکوف" ——— بنا لیتا ہے۔ مگر اسلوب کی نئی نئی راہیں تراشنے کے عمل میں جیسے جیسے پتھروں میں سے ریشم کے دھاگے کشید کر کے "نوائے شب" کے شاعر نے حکایت روز و شب رقم کی ہے۔ یہ انگلیوں کو فگار کیے بغیر نہیں لکھی جا سکتی۔ یہ پہاڑوں کو کاٹ کر سڑک بنانے کا عمل تھا۔ چنانچہ اس سفر میں ایسے مقامات اکثر آتے ہیں کہ جیسے شاہراہ ریشم پر کوئی موڑ کاٹنے کے بعد "راکاپوشی" کی چوٹی سامنے آ جائے اور مسافر زمین و آسمان کے طلسم و تحیر میں گم ہو جائے۔ انگریز شاعر ولیم بلیک نے کیا خوب کہا ہے کہ:

GREATTHINGS AREDONE WHEN MEN AND MOUNTAIN MEET.

عظیم کارنامے وہیں سرزد ہوتے ہیں جہاں انسان اور پہاڑ ملتے ہیں۔

جدید اردو شاعری میں

یاسمین کا پھول

یاسمین حمید ایک اچھی شاعرہ ہیں۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ جب میں ایک اچھا شاعر ہوں تو ہر کوئی اچھا شاعر ہو سکتا ہے۔ بہر حال خدا کا شکر ہے کہ یاسمین ایک اچھی شاعرہ ہیں۔ خدانخواستہ وہ کوئی بُری کتاب بھی رونمائی کے لیے پیش کرتیں تو ہم پھر بھی اس مجلس میں حاضر ہوتے اور ایسی ہی دلی تصدیق کے ساتھ کہتے کہ صاحبو ——— یاسمین نے ایک بُری کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تھا اور کامیابی ان کے ہاتھ پاؤں چُوم رہی ہے کہ ان جیسی بیبیاں اوّل دن ہی قدرت کی طرف سے خوش قسمتی کی چاندنی اور ایک طرح کی ظلِ ہمایونی کی پھلکاری اوڑھ کر ادب کی دہلیز پر قدم رکھتی ہیں اور پھر فی زمانہ جب صحافت اور ادب، سیاست اور تجارت، آمریت اور جمہوریت کی سرحدیں آپس میں کچھ اس طرح گڈمڈ ہو گئی ہیں کہ سچی بات کو بھی جھوٹ سمجھا جاتا ہے۔ اطمینان کی صرف بات یہ ہے کہ اس پس منظر میں لکھنا جتنا مشکل ہو گیا ہے سمجھنا اتنا ہی آسان ہو گیا ہے۔

اس قسم کی تقریبات میں یہ پہلا موقع تھا کہ ہمیں کتاب پہلے موصول ہوئی اور فرمائش بعد میں۔ لاہور سے یاسمین حمید کے فرمائشی ٹیلی فون پر ہمارے ہاں اچھا خاصا لطیفہ بھی ہو گیا۔ صوبیدار میجر لالہ مصری خان دوسری عالمی جنگ میں ہمارے "ہانڈی وال" تھے۔ وہ گاؤں سے دوسرے تیسرے مہینے ہم سے ملنے اسلام آباد آجاتے ہیں اور دو ایک روز جوانی کی لقبیۃ السیف چنگاریاں سُلگانے اور ہمارے کتّے کے ساتھ کچھ احمقانہ حرکات کرنے کے بعد، واپس گاؤں چلے جاتے ہیں۔ البتہ جب سے خلیج میں عراق اور امریکہ کی جنگ چھڑی ہے صوبیدار میجر صاحب یہیں بیٹھے بیٹھے امریکی جرنیلوں کے چھکے چھڑانے کے لیے دوسرے تیسرے روز

وارد ہو جاتے ہیں۔ یاسمین کی "ٹیلی فون کال" لالہ ہی نے سُنی کہ ہم گھر پر موجود نہ تھے۔ ملک کے ایوبی اور یحییٰ خانی جرنیلی بندوبستوں میں لالہ مصری خان براہ راست نظم و نسق میں شریک پہم تھے۔ بعض یار باش قسم کے ریٹائرڈ جرنیلوں کے ساتھ اب بھی حاضر باشی کا رشتہ قائم تھا۔ لہٰذا ان کو بھی سیاست کا بڑا گھنا چسکا لگ چکا تھا۔ جس طرح ایک خربوزہ دوسرے خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے، اس طرح ایک صوبیدار دوسرے صوبیدار کو دیکھ کر "رنگ" پکڑتا ہے۔

چنانچہ لالہ مصری خان کو سب حاضر و زیروں اور غائب ضمیروں کے نام زبانی یاد ہیں۔ لہٰذا انہوں نے یاسمین حمید کو نجمہ حمید سمجھا۔ جو کچھ عرصہ پہلے پنجاب میں وزیر تھیں۔ فرمایا ——— جوان! ——— وہ اپنی نجمہ حمید ہے نا۔ محترمہ۔ وہ تم سے کسی کتاب پر بات کرنا چاہتی ہے۔" ہمیں اچنبھا ہوا کہ ہم سے آج تک تو کسی وزیر نے کبھی کتاب پر بات نہیں کی۔ دوبارہ تصدیق چاہی تو لالہ نے انگریز سارجنٹ میجروں کی طرح چنگھاڑ کر کہا ——— "وہی بھئی وہی۔ سولہ آنے نجمہ حمید۔ البتہ تعجب ہے کہ وزارت کے بعد پوٹھوہار کی یہ کُڑی اردو بولنے لگی ہے۔ یاسمین حمید کا ایک شعر ہے ؎

اجالا دیکھ تو سکتی ہوں لیکن ابھی تک فیصلوں کے غار میں ہوں

ہم فیصلوں کے غار میں ہی تھے کہ یاسمین حمید کی دوسری کال نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا۔

یاسمین کی شاعری کے بارے میں بھی ہمیں لالہ ہی نے "فیصلوں کے غار" سے نکالا۔ کتاب ہم دونوں نے باری باری پڑھی تھی۔ صوبیدار میجر صاحب نے برٹش انڈین آرمی میں اردو کا سپیشل امتحان رومن حرفوں میں پاس کیا تھا اور انگریزی میں کچھ شُدبُد ہمیں انگریز لیفٹیننٹ کپتانوں کی ڈانٹ ڈپٹ سے خود بخود آجاتی ہے۔ لالہ جب کبھی میرے ہاں آتے ہیں تو ادبی کتابوں سے بھی تاک جھانک کر لیتے ہیں۔ حفیظ جالندھری پر جان دیتے ہیں

اور ن۔م راشد کو گولی مارنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ میں نے یہ سوچ کر کہ شاعر غلطی کر سکتا ہے مگر لوہار غلطی نہیں کرتا۔ ان سے کہا ——— "لالہ آپ کو پتا ہے کہ مجھے دوسرے کے گھر کا سالن، دوسرے کی موٹر میں بیٹھی ہوئی عورت اور دوسرے شاعروں کی شاعری کتنی اچھی لگتی ہے۔ آپ بتاؤ کہ آپ کو یاسمین حمید کی شاعری کیسی لگی؟" ——— فوراً ایڑیوں پر گھومتے ہوئے بولے ——— "کتاب اچھی لگی ——— اگر ٹائیٹل پر بی بی کا فوٹو کچھ اور بڑا ہوتا تو کتاب اور اچھی لگتی ——— سمندر سے ملی پیاسے کو شبنم!

"کتاب کو ہم سمجھ گئے کہ آپ کو کیوں اچھی لگی" ——— ہم نے پوچھا ——— "مگر شاعری کیوں اچھی نہیں لگی؟"

جواب سپاہیوں کی طرح سیدھا اور سچا ہے "ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہاں وہاں سے کوئی ٹاواں ٹاواں شعر پلے پڑا ہے۔ تم جانتے ہو میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن" ہاؤس رہ چکا ہوں۔ یہ کتاب باہر سے لیڈی پامیلا ماؤنٹ بیٹن کی طرح دلربا ہے۔ مگر اندر سے اسی محترمہ کی طرح پیچیدہ ہے۔ شعر سیدھے "ٹارگٹ" پر آتے ہی نہیں"

ہم نے مثال طلب کی۔ لالہ نے "ہوم ورک بھی خوب کر رکھا تھا۔ فوراً کتاب کھول کر مختلف مقامات پر سے چند اشعار دکھاتے ہوئے حفیظ جالندھری کو کمک پر لاتے ہوئے بولے ——— اب وہ کرے علاج دوست جس کی سمجھ میں آسکے!

"ٹارگٹ" کے اوپر سے گزر جانے والے اشعار کچھ اس قبیل کے تھے:۔

اجالا ہوتے ہی کیسے اسے بجھاؤں گی
اگر چراغ مرا تا بہ صبح جلتا ہے

رکھیے اب اس کو کتابوں میں کہ دل کے دشت میں
نقش گل سے پوچھتا ہے راستہ انجام کا

درِ امکاں ترے کھلنے سے پہلے
اسیرِ نقش ہوں مٹنے سے پہلے

کیوں اسے لوگ کھنڈر کہتے ہیں
شہر مضمر سہی، معدوم نہیں

میں نے بلبے کو ہٹا کر دیکھا
ایک اک خواب مرا زندہ ہے

مجھے چراغوں سے بھی ڈرنا
گھر ان سے بھی جل سکتا ہے

روشنی کو اس طرح ہوگی اندھیرے سے شکست
ختم ہو جائے گی شب جلتا دیا رہ جائے گا
عکس دکھلائے گا لیکن قطرۂ خوں کی طرح
ہاتھ میں ٹوٹا ہوا آئینہ جو رہ جائے گا

آنے والے موسموں کو دور سے آواز دو!
اپنی آشفتہ روی کو آخری اعزاز دو!

اس شعر کے مصرعۂ اولیٰ میں صوبیدار میجر صاحب نے ہلکی سی ترمیم کرتے ہوئے فرمایا۔ اگر اس مصرعے کو اس طرح پڑھا جائے کہ:۔

آنے والے دشمنوں کو دور سے آواز دو

تو شعر زیادہ بامعنی ہو جائے گا۔ اس شعر پر کہ!

پُل پر پہرہ دینے والے
دریا راہ بدل سکتا ہے

لالہ سچ مچ برہم ہو گئے ۔ فرمایا "چوکیدار چوکس ہو۔ فرض شناس ہو بندوق، بارود راشن کا تھیلا اس کے پاس ہو تو میں دیکھوں کہ کون مائی کا لال راستہ بدل کر نکل سکتا ہے۔ اور اس شعر کو تو انہوں نے یکسر ناقابلِ عمل اور خلیج کی جنگ کی طرح بے فائدہ قرار دے دیا کہ:

دل کو رکھنا ہے اس کنارے پر اور دریا بھی پار کرنا ہے

"حصار" کے معنی ان کو معلوم نہ تھے ورنہ پہلا "زمینی حملہ" وہ بے در و دیوار قلعے پر ہی کرتے ——— "عقیدت" کے عنوان کے تحت جو نظم کتاب میں سب سے پہلے شامل کی گئی ہے اس پر تو خیر وہ آگ بگولہ ہی ہو گئے اور تین مرتبہ کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا ——— یہ حمد ہے، نعت ہے، جو کچھ بھی ہے، اس کو خدا یا رسولِ خدا ہی سمجھیں۔ اس عاجز کے پلّے تو کچھ نہیں پڑا۔ "ٹاویں ٹاویں" جو شعر ان کی سمجھ میں آئے وہ اس قسم کے تھے۔:

جس طرح کردار لازم ہے کہانی کے لیے
شرط ہے پھولوں کا ہونا باغبانی کے لیے

ہم سے بھی فتح کے معنی پوچھو
ہم گرے شاہ سنواروں کی طرح

لالہ کو مزید کھنگھالنے کے لیے پوچھا "آپ نے کتاب میں جناب احمد ندیم قاسمی کا پیش لفظ اور جناب منیر نیازی کا تأثر یہ پڑھا ہے۔ قاسمی صاحب تو اس وقت اہلِ قلم کے "کمانڈر انچیف سمجھے جاتے ہیں" ——— لالہ بولے ——— پڑھا ہے۔ تمہارے پاس شاعری کی جتنی کتابیں رکھی ہیں ان سب میں قاسمی صاحب ہی کے لکھے ہوئے پیش لفظ آئے ہیں۔ میں تو کہوں کہ یار یہ کوئی بڑا ہی بیبا، خدا ترس اور دل دریا آدمی ہے کہ ——— سارے جہاں کا درد اسی کے جگر میں ہے ———

——— فوج میں تو ایسا شخص لانس نائیکی سے اوپر نہ اُٹھ پاتا اور یہ جو ——— اللہ بھلا کرے ——— تمہارا منیر نیازی ہے تو اس کی بھی شاعری ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ بادل سے چلتے آتے مضمون لیر سے آگے۔ گھٹا نہ کھلتی ہے نہ برستی ہے۔ اگلے دن ریڈیو پر ان کی ایک "کافی" چل رہی تھی۔ جس میں کچھ صوفیا کے سے انداز میں کہہ رہے تھے کہ میں کسی کو بُلاتا ہوں تو بلانے میں دیر کر دیتا ہوں۔ کسی کو اٹھاتا ہوں تو اٹھانے میں دیر کر دیتا ہوں۔ کسی کو سُلاتا ہوں تو سلانے میں دیر کر دیتا ہوں۔ حاصل مقصد یہ کہ لوگ چانول لاکر ان کے گھٹنوں پر ڈال دیا کریں۔ فوج میں تو ایک منٹ کی تاخیر پہ کورٹ مارشل ہو جاتا ہے۔ بلکہ مارشل لا رلگ جاتا ہے۔ یاد ہے نا آپ کو ——— کیا کیا خضر نے سکندر سے اور کیا کیا جنرل ضیا نے ذوالفقار علی بھٹو سے!

یہ باتیں تو خیر بر سبیلِ تذکرہ درمیان میں آگئیں۔ کہنا یہ تھا کہ یاسمین حمید کی شاعری کے بارے میں لالہ مصری خان کی رائے کچھ ایسی غلط بھی نہیں۔ انہوں نے وہی کہا جو میرے بھی دل میں تھا کہ یاسمین حمید ——— لالہ مصری خان کے لیے نہیں لکھتی۔ وہ شہزاد احمد، انیس ناگی، اجمل نیازی، ڈاکٹر سلیم اختر اور امجد اسلام امجد وغیرہ کے لیے لکھتی ہے۔ یعنی اس کی شاعری خواص کے لیے ہے۔ عوام کے لیے نہیں ہے۔ وہ ان شعرا میں سے نہیں ہے جو بیک وقت خواص کے لئے لکھتے ہیں اور عوام کے لیے بھی اور لفظوں کے ساتھ۔ سکواش کھیلنے کے اس عمل میں ہمارے "شریعت بل" کی طرح اسمبلی کی چھت سے لٹکتے رہیں۔ اس نے اظہار کے لیے ایک سطح متعین کر رکھی ہے۔ اس کی پرواز میں اپنی "پی آئی اے" کی پروازوں والے "فلائی پائلٹ" بہت کم محسوس ہوتے ہیں۔ اسلوب پروہ میرے نہایت عزیز دوست اور اس عہد کے نہایت اہم شاعر جناب عبدالعزیز خالد والا علمی بوجھ اٹھا کر ابلاغ کی ویسی ناکہ بندی تو نہیں کرتی جیسی ہماری پولیس شرفا کی کرتی ہے تاہم شعروں میں ایک "نتھ" ضرور ڈال دیتی ہے۔ یہ نتھ فارسی تراکیب کی ہے۔ مگر نہ یہ

ممنوع ہے نہ معیوب۔ ممنوع تو خیر آرٹ میں کوئی چیز بھی نہیں۔ معیوب یہ اس لیے نہیں ہے کہ یاسمین شعروں میں "اتھ" کی نتھ نہیں ڈالتی۔ بلکہ سونے کا ایک ہلکا سا تار ہی ڈالتی ہے۔ آرٹ کی بات آگئی ہے تو صاحبو! آرٹ کوئی اخلاق نہیں ہے کہ تم بھی ویسا ہی کرو جیسا دوسرے لوگ کرتے ہیں۔ آرٹ کا مطالبہ تو یہ ہے کہ ویسا مت کرو جیسا دوسرے لوگ کرتے ہیں اور یاسمین یہی کر رہی ہے۔ چنانچہ اس کا شعری پیکر ایک اپنی ٹوپکلی بُنت بناوٹ اور چھب رکھتا ہے۔ یہ کپڑا مشین سے ڈھلا ہوا نہیں، کھڈی سے تار تار بُنا ہوا ہے۔ وہ شاید یہ راز بھی جانتی ہے کہ اکثر شعراء خیالات کے ہاتھوں نہیں اظہار کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں۔ ان کے خیالات بُرے نہیں ہوتے، ان کے لفظ بُرے ہوتے ہیں۔ کلام وہی اچھا ہوگا جس میں بدکلامی نہ ہو۔ آرٹ کی بحث پرانی بھی ہے اور طویل بھی۔ وکیلوں نے اتنی تاویلیں قانون کی نہیں ہوں گی جتنی تعریفیں ادب کے "میتھو آرنلڈوں" اور "ڈاکٹر وزیر آغاؤں" نے شاعری کی کر رکھی ہے۔ مثلاً بعض "اسکول ماسٹروں" کا کہنا یہ ہے کہ ایک عام قاری کس کھیت مولی ہے، خود شاعر کے لیے ضروری نہیں کہ وہ اپنے ہر شعر کو سمجھ سکے۔ کہ یہ سروش کا سفر ہے، اونٹ کا سفر نہیں ہے۔ مگر یہ باریکیاں لالہ مصری خان کو کیسے سمجھائی جائیں کہ وہ تو ہنوز اس غزل کو گلے لگائے بیٹھے ہیں جس میں عاشق پیشہ مرد راہ چلتی عورت کو "سدے" دیتے رہتے ہیں کہ میری جان ——— گزر گیا ہے زمانہ گلے لگائے ہوئے!!

یاسمین کا پہلا مجموعہ ——— "پس آئینہ" ——— میری نگاہ میں نہیں ہے۔ مگر مجھے تو ——— "حصار بے در و دیوار" کے مطالعے سے بھی ایسا لگا جیسے وہ اب آئینے کے سامنے ہی کھڑی ہے۔ یہ اس کا فطری حق تھا کہ ان دونوں کا پنچ کی چیزوں کا ازلی رشتہ بھی تو بڑا محکم ہے۔ مگر یاسمین آئینے کے پیچھے اپنا عکس نہیں دیکھ رہی یہ تو ایک نئے زمانے کی بہتر زندگی کے عکس کو ڈھونڈ رہی ہے۔ وہ ایک صحرائے کرب کی مسافر ہے کہ تلاش کے

اسی ذہنی کرب نے اس کے اظہار کو بے چینی اور قوت بخشی ہے جو زمین کو اٹھا کر بادلوں میں لے جاتی ہے ——— اور اس جذبے نے اسے بات کرنے کا وہ منفرد پیرایہ عطا کیا کہ اس کا لہجہ اپنا ہے مگر بات سب کی ہوتی ہے اور اسی وصف نے یاسمین کی شاعری کو ہواؤں، پہاڑوں، بیابانوں اور انسانی ارمانوں کی آوازِ بازگشت بنا لیا ہے اور ہم یاسمین کو کبھی بلقیس سبا کی طرح آسمانوں پر اڑتے دیکھتے ہیں اور کبھی جلتی ہوئی زمین پر کسی مزدور کی جھونپڑے کی مٹی میں لت پت اور جمالِ فن کی وہ سحر کاری کہ کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے بقولِ آتش یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ——— دوڑتے پھرتے ہیں ہم باغوں کی دیواروں پر!

یاسمین کی غزل نئی ہے مگر اس میں اس کی ذہانت کے سوا کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ اس پر مولانا چراغ حسن حسرت کا ایک شعر یاد آگیا:

محبت نہ کرتے بڑا کام کرتے محبت سے لیکن بڑا کام کیا ہے

غیر معمولی ذہانت کی ایک بنیادی خوبی کی بدولت یاسمین کی غزل اس نوع کی جدید غزل نہیں ہے جو غبی یا بے اصول لوگ حیران لوگوں میں دھڑا دھڑ بانٹ رہے ہیں۔ صدام حسین نے عراق کی جنگ کو "ام المعارک" کہا تھا۔ ذہانت کی خوبی کو یاسمین کی "اُم الحواس" کہنا چاہیے۔ ——— میرے نزدیک زندگی میں کسی انسان کی کامیابی کے چار بڑے ستون ہیں۔ قسمت، ذہانت، محنت اور محبت ——— یاسمین کے فن و فکر کے راستے میں ان چاروں محرکات کی چاندنی چھٹکی نظر آتی ہے۔ اس کے ہاں اتنی بغاوت موجود ہے جتنی اس کی عمر کے ایک پڑھے لکھے نوجوان میں ہونی چاہیے۔ اور اتنا تہذیبی اور تاریخی تسلسل بھی ہے جس میں پیش قدمی کے لیے پیچھے کے تمام پُلوں کو توڑنا ضروری نہیں ہوتا۔ وہ دیکھے ہوئے کل کی روشنی میں ان دیکھے کل کی بات کرتی ہے۔ فن پر اس کی گرفت اتنی ہی مضبوط ہوتی ہے جتنی شوہر پر ہے۔ جس کو ان کے ایک بزرگ خاندان جنرل سید اطہر کے بقول "لوہے اور ریشم" کا امتزاج کہنا چاہیے۔ عورت کے دل کی دھڑکن اس کے

ایک ایک لفظ میں بولتی سنائی دیتی ہے۔

ہمارے ایک دوست کہا کرتے تھے ۔ تم مجھے کسی شاعر کا دیوان دو۔ میں تمہیں اس کا المیہ بتا دوں گا۔ یاسمین کا المیہ ——— "روشنی کی تلاش" ——— معلوم ہوتا ہے۔ اس آدرش کو اس بی بی نے جذبے کی ایک بڑی گرم اور سچی ——— "کومٹ منٹ" (CUMITMENT) کے ساتھ اپنے رگ وریشے میں جذب کر رکھا ہے۔ وہ معاشرے کے استحصالی اندھیرے میں سخت بے چین دکھائی دیتی ہے اس کی غزل میں "دیے" اور "چراغ" کا لفظ اس کثرت سے وارد ہوا ہے کہ کتاب گویا ایک "دیپ مالا" بن گئی ہے۔ اگرچہ کہیں کہیں وہ "بجلی کے کھمبے" کو بھی مقام لیتی ہے۔ روشنی کے لیے نہیں، محض سہارے کے لیے۔ اس کا ایک شعر ہے!

میری آنکھیں گواہی دے رہی ہیں
کسی امید کے آثار میں ہوں

میں خیال کرتا ہوں کہ یہ "آثار" ——— روشنی کی اسی امید کا لاحقہ ہے جس کو وہ "پسِ آئینہ" تلاش کر رہی ہے۔

ابھی ابھی میں نے لفظوں کی "دیپ مالا" کا ذکر کیا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ہماری شاعری میں ماشاءاللہ شاعرات نے ایک بھرپور "میلہ چراغاں" کا سماں پیدا کر رکھا ہے۔ یہ ایک نہایت خوش آئند علامت ہے۔ اس سے ہماری شاعری میں حیات کی ایک نئی کہکشاں پھیلتی جا رہی ہے۔ ان سرو قدانِ صنفِ شعری میں ادا جعفری، کشور ناہید، پروین فنا سید، پروین شاکر، شبنم شکیل، حمیرا رحمٰن، شاہدہ حسن، عرفانہ عزیز، فرحت زاہد، فہمیدہ ریاض، عذرا وحید، نوشابہ گیلانی، نسیم سید، غزالہ خاکوانی اور یاسمین حمید کے نام ایک تنہا ہی احساسِ فخر کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جس طرح ہر زمانے کی سیاست کو اسی قسم کے لونڈے مل جاتے ہیں، اسی طرح

ہر دور کی شاعری کو ——— اسی طرح کی لڑکیاں بھی مل جاتی ہیں۔

یاسمین حمید کی نظم بھی بہت خوب صورت اور خیالی ہوتی ہے۔ لیکن مجھے وہ بنیادی طور پر غزل کی شاعرہ معلوم ہوتی ہے۔ نظم سے اس کا برتاؤ "دوپٹے" کا سا ہے کہ کبھی سر پہ رکھ لیا۔ اور کبھی شانوں سے اٹکا دیا۔ چند نظموں کے عنوان انگریزی میں ہیں۔ مثلاً

REPENTENCE
AMBITION
DEPRESSION

وغیرہ وغیرہ۔

میرے نزدیک یہ کوئی مستحسن رجحان نہیں۔ مجھے تو اس پر کچھ تشویش سی ہو چلی ہے۔ کیونکہ مشہور لوگوں کی حماقتیں بھی روایت بن جاتی ہیں۔

مشورہ دینا ——— سب سے آسان کام ہے۔ اور میری عمر کے آدمی کے پاس تو عموماً مشورہ کے سوا کچھ دینے کو رہ ہی نہیں جاتا۔ میں نے اب تک بڑے ضبط سے کام لیا۔ لیکن بزرگوں کے "زندہ درگور ریکارڈ" کو ——— "زندہ درگور" ——— رکھنے کے لیے ایک مشورہ دینے سے باز نہیں رہ سکتا وہ یہ کہ یاسمین ——— دانائی کی باتیں زیادہ کرنے لگی ہیں۔ اوّل تو ——— ذاتی تجربے کے بغیر ——— دانائی رسمی اور کھوکھلی ہوتی ہے۔ اور پھر اس بات کو بھی نہ بھولنا چاہیے کہ شاعری عموماً رعنائی سے شروع ہو کر دانائی پر ختم ہوتی ہے۔ بہرحال یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس مجموعے کی اشاعت سے جدید اردو شاعری کو ایک نئی بشارت ملی ہے۔

یاسمین ——— ہمارا قومی پھول ہے اور یاسمین حمید کا شعر بھی ہمارے ادب میں یاسمین کا پھول ہے۔ پروردگار اس کے رنگوں کو ہمیشہ تازہ اور خوشبو کو عام اور خوش خرام رکھے۔

(۱۴ مارچ ۱۹۹۱ء۔ لاہور میں کتاب کی تعارفی تقریب کے لیے لکھا گیا)

ایک خطبۂ صدارت

(جو غلط فہمی میں لکھا گیا)

برادر صدر جسٹس محمد گل صاحب!

محترم حکیم محمد سعید صاحب۔ بانیٔ ہمدرد اور

معزز مقررین و باحثین و سامعین گول میز کانفرنس!

آپ بجا طور پر سمجھ رہے ہوں گے کہ میں اس گول میز کانفرنس میں ایک مقرر کی حیثیت سے تقریر کروں گا، اس کے برعکس، بجا طور پر، خطبۂ صدارت لکھ کر لایا ہوں اس استحقاق، اتفاق یا استحصال کی تفصیل عرض کرتا ہوں:

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ سالمن مچھلی سالہا سال گہرے سمندروں میں خوار و خجل ہونے کے بعد آخر اسی دریا کے دہانے میں چلی جاتی ہے جہاں اس کے بزرگ انڈے دیتے تھے۔ ہم بھی تقریباً چالیس برس کی دفتری زندگی کے سمندر سے نکل کر ستمبر (۱۹۸۲ء) کے اواخر میں ضلع جہلم میں اپنے دریا کے دہانے (یعنی اپنے گاؤں) چلے گئے۔ اسی اثنا میں حکیم محمد سعید صاحب نے، غالباً ٹرانٹو کینیڈا سے ہمیں آج کی گول میز کانفرنس میں شرکت کے بارے میں خط لکھا جو ہمیں آج تک نہیں ملا، کیونکہ ہمارے ہاں کے اکثر گاؤں جغرافیے کے علاوہ تاریخ سے بھی نکل جاتے ہیں۔ اتنے میں ادھر جب گول میز کے بچھنے کی ساعت قریب آگئی تو راولپنڈی سے "ہمدرد فاؤنڈیشن" کے وائسرائے جناب

عبدالستار کا گرامی نامہ موصول ہوا کہ آپ گول میز میں، باحث، کی حیثیت سے نامزد ہو چکے ہیں۔ ہم نے بواپسی ڈاک جواب دیا: "حاضر سائیں"!

گول میز کانفرنس میں شرکت کا خالص لطف تو اس صورت میں آتا جس صورت میں لندن کی ۱۹۳۲ء کی ولایتی گول میز کانفرنس میں ہمارے ضلع کے دو اکابرین کرنل سر شیر محمد خان اور نواب سر مہر شاہ نے شرکت کی تھی یا جس طرح بعض ممبر آج کل مجلس شوریٰ میں شرکت کرتے ہیں، یعنی ع

ساری ہستی بج رہی ہے اور وہ خاموش ہیں

سچی بات یہ ہے کہ کانفرنس میں اپنی متکلم شرکت کے ضمن میں ہم اپنے آپ کو آپ کے لیے بمشکل ناقابل برداشت اور خود کو ناقابل شناخت سمجھتے تھے اور قریب تھا کہ نامۂ معذرت لکھ کر بھیجتے کہ اپنے لالہ مصری خان بحر، منشی فاضل، ادیب عالم، حکیم حاذق تشریف لے آئے۔ انہوں نے پہلے ہمارا حوصلہ اور پھر ہمارے ہاتھ مضبوط کیے۔

فرمایا: "اللہ نے تمہیں دونوں جہانوں کا بار اٹھانے کے لیے پیدا کیا تھا۔ تم اتنی سی ذمہ داری پر بوکھلا گئے۔ ہم نے ملک میں آج تک باحثین کے سوا پیدا ہی کیا کیا ہے؟ جبھی تو پہلے سات برسوں میں آئین نہ بن پایا۔ جو آئین بن سکا، وہ بھی ان دنوں باحثین کے نرغے میں ہے۔ کیا تم دوسرے کے بولے ہوئے پر ایک آدھ گرہ بھی نہیں لگا سکتے؟ شکر کرو حکیم صاحب نے تمہیں کہیں مقررین میں نہیں دھر لیا!"

ہم نے بھی اب جو مزید غور کیا تو ستاروں کی گردش چنداں دگرگوں معلوم نہ ہوئی علمی مذاکرے میں باحثین کی کچھ ویسی ہی پوزیشن لگی جیسی جنگ میں تعلقات عامہ کے کپتانوں کی ہوتی تھی۔ محاذ جنگ پر موجود، میدان جنگ سے باہر، چنانچہ ہم گول میز کانفرنس کے تمام مدوجزر سے نچنت ہو کر باجرے کی کھڑی فصلوں میں بیٹھے ہوئے بٹیروں میں جال پھینکتے رہے ع

یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ

اس عالم بے فکری میں ایک روز اسلام آباد سے ہمارے پڑوسی ٹھیکیدار صاحب کے فرزندِ ارجمند کا، جو ساتویں جماعت میں پڑھتا ہے، ہمارے نام گاؤں میں ایک جنگی (ایس او ایس) پیغام موصول ہوا کہ آپ ۱۵ اکتوبر کو گول میز کانفرنس کی صدارت کریں گے۔ پس منظر یہ تھا کہ ان ٹھیکیدار کا ٹیلی فون آج کل عملاً ہمارے پیغامات میں حائل رہتا ہے۔ اب ہمدرد فاؤنڈیشن سے جن صاحب نے پیغام دیا، انہوں نے پیغام کا لبِّ لباب کوثر و تسنیم میں دُھلی ہوئی اردو میں کچھ زیادہ ہی گھول دیا تھا۔ ادھر ہمارے محسن و مربی ٹھیکیدار صاحب کے گھر کے جملہ ——— بندہ و صاحب و محتاج و غنی ——— علاقہ چھچھ کی ٹھیٹھ چھچھلتی ہوئی بولی کے سوا اور کوئی بولی نہیں سمجھتے۔ سو، وہ ان کے پیغام زبانی کا ملیہ اٹھا کر، اپنے اگلے پڑوسی میجر عبدالقدوس صاحب کے پاس لے گئے۔ جواہر کی قدر جوہری اور فوجی کا مرتبہ فوجی سے پوچھیے۔ میجر قدوس نے محدود و مبہم معلومات (انٹیلی جنس) کی روشنی (بلکہ اندھیرے میں) جناب عبدالستار کو "ڈی کوڈ" کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مجھ ایسا، تمغہ یافتہ سپاہی، جو اُن سے دو پشت سنیئر بھی تھا، کسی مجلس میں صدر سے کم کیا کسی کرسی پر بیٹھے گا۔

اتنی اہم تقریب کے لیے اپنی بائی لیٹرل صدارت، کا یہ مژدہ ہمارے لیے بے حد اچانک، غیر متوقع، مگر بے انتہا باعثِ مسرت تھا سچی بات یہ ہے کہ اس خوش خبری سے ہم پر وہی کیفیت طاری ہوئی جو بعض حالتوں میں بعض افسانوی شہزادوں پر طاری ہوتی رہی ہے۔ ہم پہلے ہنسے، پھر روئے، ہنسے کہ ہمیں صدارت کے شایانِ شان سمجھا گیا۔ روئے کہ صدارت ہم تک آگئی۔ دل بلیوں کس طرح اچھلتا ہے؟ یہ تمامتر نشاطِ حیات و ہوس ہم نے پہلی مرتبہ اس شدت سے صرف اسی روز اپنے اندر برپا دیکھا۔ جذبات کی ہلچل میں یوں لگ رہا تھا جیسے صبح و شام کے دونوں وقت بغل گیر ہو گئے ہوں ———

کمالِ جنوں کی تلاش میں جب اپنا مستقبل چمکتا نظر آتا تو نہایت اندیشہ کے ملگجے میں شامِ ہمدرد تاریکی میں ڈوبنے لگتی۔ یہاں ایک مرتبہ پھر لالہ مصری خان نے ہماری رات کو مہتاب سے محروم نہ ہونے دیا، بلکہ اپنے ایک جملے میں گویا ایک ایک ماہ تمام، ہمارے پیمانۂ جاں میں انڈیل چلے گئے۔ فرمایا: عزیزِ من! آئی ہوئی کرسی کو زنہار اگر کبھی ٹھکراؤ! اس ملک میں آدمی اگر کرسی میں نہیں ہوتا تو کسمپرسی میں ہوتا ہے۔ دنیا کے تیور نہیں دیکھ رہے۔ اندریں حالات انسان کو ہر قسم کی ایمرجنسی کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اگر تم برس دو برس اور زندہ رہ گئے تو قومی سطح کی صدارتوں کا دروازہ بھی تم پر کھل جائے گا۔ ع

یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

"پھر یہ دیکھو" ——— لالہ مصری خان اس دلولے سے بولے جا رہے تھے، جیسے مجھ کو میرا خطبۂ صدارت املا کرا رہے ہوں "ہاں تو پھر یہ دیکھو کہ گلاس کے پانی کے سوا جلسے کی صدارت سے زیادہ آسان کوئی اور چیز جلسے میں نہیں ہوتی۔ بولتا رہے تو بیچ میں کوئی بول نہیں سکتا۔ نہ بولنا چاہے تو اسے کوئی بلوا نہیں سکتا۔ تم چاہو تو شفیق الرحمٰن یا کرنل محمد خان کے مانند خاموش صدارت کر لیا کرو۔ موٹے آدمی سے کچھ لوگ ایسی توقعات بھی نہیں رکھتے۔"

ہم نے پہلے تو اپنی استعداد اور بیرونی فساد کے خدشے سے خاموش صدارت ہی کا فیصلہ کیا مگر پھر یہ سوچ کر کہ ع

یہ طور کا جلوہ ہے ہر بار نہیں ہوتا

خطبۂ صدارت لکھ لیا۔

صدرِ مجلس کے طور پر محترم جناب جسٹس قاضی گل صاحب کا اسمِ گرامی اور مقررین کی فہرست میں اپنا نام میں نے آج ہی طبع شدہ دعوت نامے میں دیکھا۔ جج صاحب کا

نام دیکھ کر ہمارے ہاتھوں کے طوطے تو ضرور اڑے ۔ مگر دل خوش بھی ہوا کہ ان کی صدارت علم اور قانون کی بالادستی کی علامت ہے ۔ یوں بھی جہلم کی سنگی نسبت سے وہ ہمارے گرائیں ٹھہرے، گویا صدارت ذرا اونچی چلی گئی ہے، گھر سے باہر نہیں گئی، مگر اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ ہم خطبۂ صدارت چھوڑ کر تقریر کرنے لگ جائیں ۔ خطبۂ صدارت اور تقریر کے فرق سے آپ یقیناً آگاہ ہوں گے ۔ نہیں ہیں تو اب ہو جائیں گے ۔ مقرر مشورہ دیتا ہے صدر فیصلہ صادر کرتا ہے ۔ مقررین کے ہاں عمومیت ہوتی ہے، صدر کے یہاں قطعیت تو لیجئے یہاں ہمارا خطبہ صدارت شروع ہوتا ہے :

محترم حکیم صاحب ! معزز خواتین و حضرات !

میرا سب سے پہلا اور سب سے خوشگوار فرض یہ ہے کہ میں اس انتہائی اہم علمی مذاکرے کی صدارت کے اعزاز کے لیے محترم حکیم صاحب قبلہ کی خدمت میں اپنے تشکر و سپاس وغیرہ کے جذبات کا ہدیہ پیش کروں ۔ یہ نذرانہ میں خاموشی کی صورت میں پیش کروں گا ۔ کیونکہ داناؤں نے کہا ہے :

"بھیڑے رون توں چپ رہنا چنگا" (برے رونے سے چپ رہنا اولیٰ)

صدر کی حیثیت سے اپنے بارے میں ہم بھی اپنے اکثر پیش روؤں کے ارشادات کا اعادہ کریں گے کہ من آنم کہ من دانم ۔ بلکہ وہ بزرگوار تو فکر و فن میں ہم سے بدرجہا بلند مقام و مرتبہ رکھتے تھے ۔ ہمیں تو دراصل یہی معلوم نہیں کہ ہم کتنے پانی میں ہیں ۔ یہ معلوم ہوتا تو ہم گول میز کانفرنس کی صدارت کیوں قبول کرتے ؟ صدارت قبول کر لی تھی تو خطبۂ صدارت لکھنے کی جسارت نہ کرتے ۔ اب تو ہم حکیم صاحب کا شکریہ ادا کر چکے ہیں ، ورنہ ان سے شکایت کرتے کہ ؏

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو

مگر کیا کیجیے کہ ہم اپنی وضع کو بدل نہیں سکتے ۔ ہماری عادت ہے کہ ہم اپنی

کہی ہوئی بات پر خواہ عمل کریں یا نہ کریں، مگر اسے کبھی واپس نہیں لیتے ۔ ملک چھوٹا ہو سکتا ہے بات چھوٹی نہیں ہو سکتی ۔ بات یہ ہے کہ اگر ہم اپنی غلطیوں کو اسی فراخ دلی سے تسلیم کرنے لگیں تو ہمارے پاس کیا رہ جائے گا ۔ موٹاپے اور بڑھاپے کے سوا !

ویسے ہم بہت خوش ہیں کہ ہماری صدارت کی افواہ پھیل سکتی ہے اور ہمارے ہاں کسی افواہ کے حقیقت بننے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے !

"آیئے ! اب موضوع زیر بحث کی طرف چلتے ہیں ۔ مگر موضوع کی طرف منہ کرنے سے پیشتر ایک اور معذرت بھی ضروری ہے، وہ یہ کہ ہم طبعاً ایسے علمی اور تحقیقی موضوعات سے جن میں کتابوں اور حوالوں کی ضرورت پڑتی ہو، سخت گھبراتے ہیں ۔ ہم ادب کے سکالر نہیں، ادب کے باؤلر ہیں ۔ تجزیاتی غلام گردشوں میں اترتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے عظمت کو مسرت کی قیمت پر اور مسرت کو صحت کی قیمت پر خرید رہے ہیں ۔

ہمیں احساس ہے کہ پس منظر قدرے کھچ گیا ہے ۔ مگر آپ تسلی رکھیں کہ پس منظر کے ساتھ مضمون کی طنابیں بھی کھچ گئی ہیں، بلکہ سرے سے اکھڑ گئی ہیں عادتاً حقیقت کے برعکس نہیں ہوتا ۔ مگر حقیقت اور صداقت کے درمیان بھی تو کچھ پردے حائل رہتے ہیں ؏

خدا کے نام کا پردہ خدا کا نام نہیں

کفر کھینچتا ہے، ایمان روکتا ہے ۔ پولیس پکڑتی ہے کبھی آسودگی مقدم، کبھی ہدایت اوّل ۔ پیار بھی ضروری، تفریح بھی لازمی ۔ مقصدیت، ایک ضرورت بھی ایک رکاوٹ بھی جو ادب لکھا جاتا ہے وہ اس ادب سے بہت کم ہے جو نہیں لکھا جاتا ۔ ادب میں سبق تو ہوتا ہے، مگر نتیجہ نہیں نکلتا ۔ نکلتا بھی ہے تو مدت مدید کے بعد ـــــ اقبال نے تو اپنی شاعری کو سازِ درویشی کہا ہے، جس کا حاصل کچھ نہ پوچھ!

ہم اپنی توجہ سوال کے پہلے حصے پر مرکوز کر رہے ہیں۔ وہ یہ کہ پاکستان میں شعر و ادب کا مقام کیا ہے؟

طویل جواب کی گنجائش ہم تمہید میں کھا چکے۔ مختصر جواب یہ ہے کہ:

جس ملک میں پرائمری تعلیم سمیت خواندگی کی شرح بیس فیصد سے زیادہ نہ ہو۔

جہاں ادبی کتاب بمشکل ایک ہزار کی تعداد میں چھپتی ہو۔ بکتی اس سے بھی کم ہو اور پڑھی اس سے بھی کم جاتی ہو۔

جہاں کتاب اور قمیص کی قیمت تقریباً برابر ہو، چنانچہ قمیص پہنے بغیر اور کتاب پڑھے بغیر پھٹ جاتی ہو۔

جو لوگ کتابوں کے شائق ہیں وہ روٹی نہیں خرید سکتے۔ جو کتاب خرید سکتے ہیں وہ "وی سی آر"، "ڈی پی آر۔ سی بی آر" خرید سکتے ہیں۔

جہاں جو لوگ کام کر سکتے ہیں وہ کام کرتے نہیں، اور جو نہیں کر سکتے وہ کرتے بھی ہیں، ہمیں جتنا پیچھے نظر آتا ہے، اتنا آگے نظر نہیں آتا۔ ایک بات ضمناً یہ بھی عرض کر دیں کہ چونکہ ہم پہلی مرتبہ صدارت کر رہے ہیں، اس لیے ہمیں کچھ اندازہ نہیں کہ ہمیں خطبۂ صدارت کتنے وقت میں ختم کرنا چاہیے۔ سر دست تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میں، یعنی ہم خطبۂ صدارت کے ہاتھ میں ہیں اور آپ ہمارے ہاتھ میں ——— یہ بات الگ کہ ؏

سکندر جب گیا دنیا سے تو دونوں ہاتھ خالی تھے

حکیم صاحب کی ذاتی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ بات میٹھی کرتے ہیں، اردو سلیس لکھتے ہیں، مگر سوال مشکل پوچھتے ہیں۔ آج کے سوال کا مغز جو ہم نے فاضل مقالہ نگاروں کے مقالات سے کشید کیا ہے، یہ ہے:

"پاکستان میں شعر و ادب کا کیا مقام ہے اور اس نے پاکستان کی تعمیر میں،

تہذیب و تمدن میں کس قدر اور کس انداز سے حصہ لیا ہے، اور اس اثر اندازی اور اثر پذیری سے کیا نتائج برآمد ہوئے ہیں؟"

اجازت دیجیے کہ اس محل پر ہم ادب کے وظیفے اور وظیفے کے بارے میں کچھ سنی سنائی باتیں کچھ آپ کو بھی سناتے چلیں تاکہ آگے چل کر (بہت آگے بھی نہیں) اس سوال کا جواب تلاش کرنے میں کچھ مدد مل سکے یا انشاءاللہ کچھ دھند پھیل سکے۔

آرٹ کا سوال ہے ریاضی کا سوال نہیں کہ کوئی قطعی جواب دیا جا سکے۔ مجلس شوریٰ اور مجلس شعر میں بڑا فرق ہے۔ ادب زندگی کو بیک وقت کئی زاویوں۔ کئی سطحوں سے دیکھتا ہے، ادب، بلدیہ کے ممبروں کی طرح لوگوں کی بہت سی توقعات پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ توقعات بھی باہم متضاد اور متصادم۔ قوی و کمزور۔ قاہر و کریم ——— سچا ادب ہیں۔

جہاں کبھی سیاسی استحکام کے باعث اور کبھی سیاسی عدم استحکام کی وجہ سے شہری آزادیاں متزلزل و معطل رہتی ہوں خواتین و حضرات!

اس معاشرے میں شعر و ادب کا کیا مقام ہو سکتا ہے؟ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ادب کی اثر اندازی یا اثر پذیری کا عمل رک گیا ہو۔ ادب قید مقام سے آزاد ہے۔ یہ رہ گزر کی چیز ہے۔ ادب پانی کی طرح اپنا راستہ خود بناتا ہے۔ لوگوں کو اس کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے۔ عصری ادب میں اثر اندازی کا عمل جاری ہی نہیں ہے۔ ہم تو اس کی رفتار کو حوصلہ افزا کہیں گے۔ وہ وسائل کے بغیر بھی مسائل سے نبرد آزما ہے۔ البتہ اس کے نتائج دست بدست نہیں، تاہم بعض عوامل دیوار پر لکھے نظر آتے ہیں۔ مثلاً:

۱۔ پاکستان کا عصری ادب اپنے ملک کے حالات و کوائف کا بھرپور شعور رکھتا ہے اور اس کے اظہار میں وہ غالب کا طرف دار کبھی نہیں رہا۔ اس نے

حیات، حرکت، انقلاب احتساب، حسن اور خیر کی ترجمانی کی ہے مستثنیات کب اور کہاں نہیں ہوتے؟ لیکن مجموعی طور پر پاکستانی ادب ایک محبِ وطن حزبِ اختلاف کا رول ادا کرتا ہے۔ ع

کبھی آ کے منظرِ عام پر کبھی ہٹ کے منظرِ عام سے

۲۔ وہ جہاں اپنے گرد و پیش سے غافل نہیں، وہاں دنیا کے مظلوم و محکوم انسانوں کی دھڑکن بھی اس کی آواز میں برابر سنائی دیتی ہے۔ کبھی تو یہ شور کھٹکنے لگتا ہے کہ جیسے پیار کی باتیں کم ہوتی جا رہی ہوں اور آدمی سوچنے لگے کیا انسانی زندگی عشق و محبت کے بغیر بھی آسودہ و بامعنی ہو سکتی ہے!

سیاسی عدم استحکام اور مجلسی گھٹن کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ اس پر ایک واقعہ یاد آ گیا۔ نپولین سے کسی شخص نے شکایت کی کہ فرانس میں اچھا ادب پیدا نہیں ہو رہا۔

نپولین نے جواب دیا "میں اپنے وزیرِ خارجہ سے پوچھوں گا"

ہم بھی کسی وقت یہ سوال اپنے وزیرِ خارجہ سے پوچھیں گے۔

ع فرصت کشاکشِ غمِ ہستی سے گر ملی

